دنیا خوبصورت ہے

عطا الحق قاسمی

فہرست

بنکاک کے بجھے بجھے شعلے..... 3

اڑنے سے پہلے ہی میرا رنگ زرد تھا 10

گوروں کے دیس میں 29

جنس کا ہیضہ..... 43

مغرب کا ڈرائنگ روم..... 50

ساؤتھ ہال 54

بریڈ فورڈ اپنا اپنا ایک شہر..... 77

ملاقاتیں..... 94

اپنے لوگوں کے درمیان..... 99

اسکاٹ لینڈ خواب یا حقیقت..... 106

برائٹن کے "حمام" میں..... 118

یورپ بائی روڈ..... 132

پیرس اوہ پیرس 139

دریائے سین کی سیر..... 147

کوپن ہیگن۔ بد سے بدنام برا..... 155

یہ ہالینڈ ہے..... 171

ایمسٹرڈم میں..... 181

سفر واپسی کا..... 188

بنکاک کے بجھے بجھے شعلے

شانتی شانتی

ہماری فلائٹ رات کو تین بجے براستہ بنکاک سنگاپور کے لئے روانہ ہونا تھی جہاں ایک رات قیام کے بعد ہمیں اگلے روز آسڑیلیا کے لئے روانہ ہونا تھا، اس وقت دوپہر کے دو بج چکے تھے، ہمارا سامان ہوٹل مڈوے پی آئی اے کی تحویل میں ہے، اور اس اچھے خاصے معقول ہوٹل کی بے انتظامی دیکھ کر

خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبت زاغ

والا مصر عہ یاد آگا، میں نے اپنے کمرے سے برادر بزرگ ضیاالحق قاسمی سے رابطہ قائم کرنے کے لئے آپریٹر کو انکو فون نمبر دیا، جب کافی دیر تک اس نے فون نے ملایا میں دوبارہ موصوفہ سے دست بستہ درخواست کی جس پر انہوں نے جھاڑ پلا دی، اتنی بے صبری کی ضرورت نہیں، اکیلی جان اور اتنا کام، آپ انتظار کریں، اور دیکھیں دوبارہ کال کی ضرورت نہیں، جب آپ کی باری آئے گی میں آپ کو خود اطلاع کروں گی، بٹ صاحب میرے روم میٹ تھے، ان کی جلالی طبعیت جوش میں آنے ہی کو تھی، کہ میں نے وہیں بند باندھے بس جانے دیں، یہاں ہمارا قیام دنیائے فانی کی طرح چند روز ہی نہیں بلکہ چند گھنٹوں کا ہے، لہذا شانتی شانتی۔

راجہ اندر

ہماری پہلی منزل بنکاک تھی، اور بنکاک تک ہمیں تھائی ائیرویز نے لے جانا تھا، فلپس کمپنی نے اس مطالعاتی اور تفریحی دورے کا اہتمام ان 34 ڈیلروں کی ضیافت طبع کے لئے کیا تھا، جن کا تعلق ملک کے چاروں صوبوں سے تھا اور جنہوں نے خود کو بہتر ڈیلر ثابت کیا تھا، میری حیثیت مبصر کی تھی، گروپ میں جوان بھی تھے بوڑھے بھی، زاہد تھے، رند بھی اور وہ بھی جن کے لئے شاعر نے کہا ہے۔

رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی۔

سو میرے آئندہ کئی روز رنگ برنگے انسانوں کی اس کاک ٹیل کے ساتھ بسر ہونا تھے، نشہ تو آنا ہی تھا۔

جہاز پرواز کے لئے اپنے پر پھیلائے اور تھوڑی دیر بعد روشنیوں سے جگمگ جگمگ کرتا کراچی ہماری نظروں سے اوجھل ہوتا چلا گیا، روشنیوں کا شہر اب ویسے بھی آنکھوں سے اوجھل ہوتا چلا جا رہا تھا اور اس کی جگہ اندھیروں کے اس شہر نے لے لی، جہاں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا، پرواز نارمل ہوتے ہی تھائی میزبان لڑکیاں حرکت میں آ گئیں اور انہوں نے ساق گری شروع کی، ان تھائی لڑکیوں کے خدوخال ویسے تھے جیسے تھائی لڑکیوں کے ہوتے ہیں، لیکن تھوڑی ہی دیر بعد ان کی ریشم ایسی اکن جس کی تعریف وارث شاہ نے بھی کی ہے، حسن اخلاق، نرم و نازک ہاتھ اور ان ہاتھوں میں پیش کئے گئے، پیمانوں کے زیر اثر مسافروں نے محسوس کیا کہ وہ پریوں کے جھرمٹ میں ہیں، چنانچہ ان میں کئی ایک نے خود کو باقاعدہ راجہ اندر محسوس کرنا شروع کر دیا، میرے کچھ ہم سفر للچائی نظروں سے مینا و جام اور اس کے ساتھ ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھتے رہے کہ شاید گروپ میں سے کوئی جرات رندانہ سے کام لیتے ہوئے مے نوشی آغاز کرے تو وہ بھی ہاتھ بڑھا کر جام اٹھا لیں مہر ہم لوگ اتنا اللہ سے نہیں ڈرتے جتنا ایک دوسرے سے ڈرتے ہیں چنانچہ الحمد اللہ سب نے کوک پر اکتفا کیا۔

اپنے مرزا صاحب

وفد کے قائد اطہر حلیم اپنی نشست پر اب اطمینان اور سکون سے بیٹھے تھے، جو اطمینان اور سکون زچہ، زچگی کے مراحل طے کرنے کے بعد محسوس کرتی ہے، ہم سب لوگوں نے جہاز میں سوار ہونے تک ان کی مت ماری ہوئی تھی، اور ظاہر ہے ایسے ہونا ہی تھا، کہ یہ کوئی ملک کی سربراہی تو نہیں تھی، کہ سربراہ کا مسائل سے کوئی تعلق ہی نہ ہو، میرے ہم سفروں میں سرگودھا کے حمید وائیں، مجید وائیں اور شاہد بھی تھے، وائیں فیملی سے ہمارے گھریلو تعلقات ہیں، لیکن ان کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا موقع اس سفر کے دوران ہی میسر ہو اور میں نے محسوس کیا کہ انکا ظاہر ہی نہیں ان کا باطن بھی خوبصورت ہے، شاہد سے میرا پہلا تعارف تھا، یہ ہنس مکھ نوجوان سارے سفر کے دوران گلاب کی طرح کھلتا اور کھلکھلاتا رہا، باقی مسافروں کا تعارف میں آپ کو باری باری کراؤں گا لیکن اس سے پہلے مرزا عبد القیوم کا تعارف ضروری ہے، چند برس پیشتر مرزا صاحب سے تعلق پیدا ہوا تو برسوں پرانی دوستیوں پر حاوی ہو گیا، وہ گذشتہ تیس برس سے میرے کالم کے قاری ہیں، یہ قاری کا لفظ تو میں نے استعمال کیا ہے وہ اس کے لئے حافظ کا لفظ استعمال کرتے ہیں، معذرت کے ساتھ لیکن کاروباری حضرات میں ایسے صاحب دل بہت کم ہوتے ہیں جو دل کے معاملات میں بھی کاروبار سے صرف نظر کر سکیں، کسی زمانے میں میرے پاس اسکوٹر ہوتا تھا، ایک دفعہ اس کی اوور ہالنگ کی نوبت آ گئی تو اسپئیر پارٹس خریدنے میں میکلوڈ روڈ گیا، جب سیلز میں بل بنانے لگا تو دکان مالک آیا مجھے دیکھ کر وہ دیوانہ اور میری لپکا اور انتہائی گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا قاسمی صاحب میں آپ کی تحریروں کا عاشق ہوں، میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ آج آپ سے ملاقات ہو گئی پھر اس نے چائے کا آرڈر دیا اور دوران وہ مسلسل میرے بارے میں ایسے تعریفی کلمات کہتا رہا جن کا میں خود کو مستحق نہیں سمجھتا تھا، اتنے میں سیلز میں نے بل بنا کر مالک کو دی تو وہ غصے سے لال پیلا ہو کر کہنے لگا، یہ کیا بنا کر لائے ہوں، جانتے نہیں یہ عطاالحق قاسمی صاحب ہیں جو ہماری قوم کا سرمایہ ہیں، پانچ سو بارہ روپے چھ آنے میں سے یہ بارہ روپے چھ آنے نکالو اور دوبارہ بل بناؤ، تم لوگ قوم کے محسنوں کی عزت کرنا جانتے ہی نہیں۔ ۔ بے وقوف جاہل، مجھے یوں لگا جیسا اس ساری گفتگو میں صرف یہ ہی آخری دو لفظ میرے لئے ہیں، خیر یہ تو جملہ ہائے معترضہ تھے، قیوم کی محبت مختلف نوعیت کی ہے وہ کاروبار میں بھی محبت کے قائل ہیں، جبکہ یار لوگ محبت میں بھی کاروبار کرتے ہیں، انکا تعلق پنجاب کے ایک پس ماندہ قصبے پسرور سے ہے اور وہ اپنے اس قصبے کو نہیں بھولتے، ہر سال پوری تحصیل میں امتیازی نمبروں سے امتحان پاس کرنے والے طلبہ و طالبات میں لاکھوں روپے کے انعامات تقسیم کرتے ہیں، گورے چٹے، خوش لباس اور خوش کلام مرزا عبدالقیوم کو اپنے علاقے میں ایک ہیرو کی حیثیت حاصل ہے۔

ایڈز کے خریدار

حالانکہ اس وقت رات کے تین بج رہے تھے، لیکن جہاز میں بہت چہل پہل تھی، مسافروں کی بڑی تعداد بنکاک کے شعلے سیکھنے جا رہی تھی، چنانچہ ان میں وہ ایکسائٹمنٹ پائی جاتی ہے، جو چاند رات کو عشاقان عید میں پائی جاتی ہے، بنکاک کو بین الاقوامی ہیرا منڈی کی حیثیت حاصل ہے، پوری دنیا سے سیاح یہاں ایڈز خریدنے آتے ہیں اور واپسی پر اپنے پیاروں میں تقسیم کرتے ہیں، عصمت فروشی کو یہاں اسمال انڈسٹری کی حیثیت حاصل ہے چنانچہ گھر گھر میں چھوٹے چھوٹے یونٹ قائم ہیں، جہاں چھوٹے چھوٹے بچے بھی بطور ایندھن استعمال ہوتے ہیں، صرف یہی نہیں بلکہ یہاں مارد پرستی کا بازار بھی گرم ہے، یہ بات میں نے محاورتاً نہیں کہی بلکہ اس مقصد کے لئے واقعی خصوصی طور پر ایک بازار موجود ہے، گلزار وفا چودھری ایک میٹنگ کے سلسلے میں بنکاک گیا تو اس کے دل میں یہ بازار دیکھنے کا تجسس پیدا ہوا وہ ایک گھڑیوں کی دکان میں گیا اور اس کے مالک سے بازار کا پتہ پوچھا، مالک نے کہا تم کہاں بازار ڈھونڈتے پھرو گے، دس ڈالر مجھے دو اور۔۔۔۔ گذشتہ دنوں بنکاک کی وزیر سیاحت کا بیان اخباروں میں شائع ہوا جس میں اس نے بنکاک میں ایڈز کی بڑھتی ہوئی شرح پر سخت تشویش کا اظہار کیا تھا، کیونکہ سیاحوں کی تعداد میں کمی کی وجہ سے ملکی معیشت پر برے اثرات مرتب ہو رہے ہیں، تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ بنکاک صرف عصمت فروشی کے لئے مشہور تھا بلکہ اس کے خوبصورت مندر بھی مشہور ہیں، جن میں مہاتما بدھ کی مورتیاں رکھی ہوئی ہیں، چوری میرا پیشہ اور نماز میرا فرض ہے، والا مکالمہ کیسے کیسے مقامات پر اپنی معنویت دکھاتا ہے، بائی دی وے بنکاک کے مگرمچھوں کے فارم بھی بہت مشہور ہیں، جہاں مگر مچھ کا پورا جبڑا کھول کر اپنی گردن اس میں ڈال دیتے ہیں، اس کے علاوہ بقول سید شوکت علی شاہ بنکاک کا مہاراجہ جیت سنگھ بھی یہاں کی خاص چیز ہے جسے دیکھے اور ملے بغیر بنکاک کی سیاحت مکمل نہیں ہوتی مہاراجہ کی سیام اسکائر میں ٹیلرنگ کی دکان ہے، یہ مہاراجہ ہی نہیں امریکی فوج کا چھ ستاروں والا اعزازی جرنیل بھی ہے، اور اس کے علاوہ بہت کچھ ہے جہاں تک تھائی لینڈ کے عوام کا تعلق تھا، وہ انتہائی۔۔۔ میزبانیں مسافروں اور عجز و انکسار کا پیکر ہیں، اس وقت جہاز میں گڑیوں جیسے گڑیوں جیسی فضائی میزبانیں مسافروں کی خدمت میں اس طرح منہمک تھیں جیسے وہ ڈیوٹی پر نہیں مندر میں ہیں، اور عبادت کر رہی ہیں، جہاز کی لینڈنگ کا اعلان ہوا ور پھر تھوڑی دیر بعد ہم اتر گئے، بنکاک میں ہم نے صرف ایک گھنٹوں کے لئے رکنا تھا، یہاں سے کینٹاس ائیر لائنز کے ذریعے ہمیں سنگاپور کے لئے روانہ ہونا تھا پہلے پروگرام میں بنکاک میں ایک دن قیام بھی شامل تھا جو کسی فنی مجبوری کی وجہ سے تبدیل کرنا پڑا، اس وقت میں نے دل میں خدا کا شکر کیا تھا، مجھے بنکاک سے خوف سا آتا تھا، اس کے متعلق کچھ ایسی بری بری کہانیاں سنیں میں آتی رہی ہیں کہ جس یہ تاثر ملتا ہے جیسے سرزمین

پر قدم رکھتے ہی خون میں اجزا شامل ہونا شروع ہو جاتے ہیں، تاہم اس سرزمین کی سیاحت میرے پروگرام میں شال ہے، انشا اللہ آج نہیں تو کل میں اس پراسرار خطے کی کہانی اپنے قارئین کو ضرور سناؤں گا۔

وہ میرے ساتھ تھی

دن کی بھاگ دوڑ اور رات کی بے آرامی نے مجھے بے حد تھکا دیا تھا، میں نے اپنی نشست کو سرکائی اور سر سیٹ پر ٹکا کر آنکھیں موند لیں اور پھر وہ اپنی پازیبیں چھنکاتی میرے برابر میں آن کھڑی ہوئی، اس کی مخروطی انگلیاں میرے بالوں میں رینگ رہی تھیں، اس کے سانسوں کی مہر میرے مشام جاں کو معطر کر رہی تھی۔

پھر اس کی مندروں کی گھنٹیوں ایسی آواز نے میرے کانوں میں رس سا گھول دیا۔

تم بہت خوش تھے کہ ملک سے باہر جا رہا ہوں چلو کچھ سن کے لئے اس سے جان چھوٹی مگر میں تمہارا پیچھا چھوڑنے والی نہیں ہوں، تم جہاں بھی جاؤ گے میں تمہارے ساتھ رہوں گی، تم پھول سے خوشبو کو تو جدا نہیں کر سکتے۔

تم مجھ سے کب جدا ہو میرا تو کوئی لمحہ تمہارے خیال سے خالی نہیں میں جب تمہارے ساتھ زمین پر چلتا ہو تو زمین میرے پاؤں کے نیچے پھول بچھا دیتی ہے۔

میں نے اس کے پھول ایسے چہرے کو دونوں ہاتھوں کے حصار میں لیتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنی جھیل سی آنکھوں سے لمبی لمبی پلکوں کی جھالر اوپر اٹھائی اس کے چہرے پر حیا کے شفق رنگ ابھرے اور اس نے اپنا ریشم جیسا ہاتھ میرے ہاتھوں پر رکھ دیا۔

بنکاک کی آمد آمد تھی، جہاز میں ایک کھلبلی سی مچ گئی، اس ہنگامے میں وہ ایک بار پھر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی جو میری تنہائیوں کو اپنی رفاقتیں سونپ دیتی ہیں، میں نے کھڑکی میں سے نیچے دیکھا تو تھائی لینڈ کی خوبصورت سر زمین کو اپنا منتظر پایا مجھ سے اگلی نشستوں کے مسافر اچھل اچھل کر کھڑکی سے باہر جھانک رہے تھے، وہ شاید رن وے پر بھی بنکاک کے شعلے تلاش کر رہے تھے،ان کا خیال تھا کہ سول ایوی ایشن کا عملہ بھی جہاز کو لینڈ کرانے کی بجائے ہاتھ میں بینر لئے کھڑا ہو گا، بیوٹی فل گرل، اونلی فور ٹین ائیرز اولڈ، پلیز ٹڑائی، لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ سول ایوی ایشن کے عملے نے صرف جہاز کو لینڈ کرایا، تھائی لینڈ میں لینڈنگ کے لئے ان مسافروں کو یقیناً ائیر پورٹ سے ہوٹل تک کا سفر اختیار کرنا پڑا ہو گا، کراچی سے بنکاک تک کی پرواز پانچ گھنٹے کی تھی، ہم تھکے ہارے ائیر رپورٹ کی عمارت میں داخل ہوئے جہاں کچھ دیر قیام کرنا تھا تاکہ سنگاپور کے

لئے کینٹاس ائیر لائن کی فلائٹ پکڑ سکیں، سنگاپور میں بھی ہمارا قیام صرف ایک رات کے لئے تھا، البتہ آسڑیلیا سے واپسی پر ہم نے تین دن اس شہر میں گزارنا تھے جس کی جھلک میں اس سے پہلے دو دفعہ دیکھ چکا ہوں، لیکن اس پر بھر پور نظر ڈالنے کا موقع واپسی پر ہی ملنا تھا، جب انسان کا پورا دن بھاگ دوڑ میں گزرتا ہے،اور ساری رات جاگ کر گذاری ہو اس کی ذہنی حالت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، سو اس وقت ہم سب تھکے تھکے سے تھے، سوائے قیمو صاحب کئے جو ہمیشہ کی طرح تر و تازہ تھے، اور اب ائیر پورٹ کے ایک کونے میں معمول کی ورزش کا کوٹہ پورا کرنے کھڑے کھڑے پاؤں کو حرکت دے رہے تھے۔

بٹ صاحب کی محبوبہ

اتنے میں منیر بٹ میرے پاس آئے، ان کے چہرے پر اداسی کی لکیریں تھیں، اور وہ کھوئے کھوئے لگ رہے تھے۔

خیریت تو ہے بٹ صاحب، بہت مضمحل لگ رہے ہیں ؟ میں نے پوچھا

مجھے وہ بہت یاد آ رہی ہے، ان کے لہجے سے لگتا تھا جیسے وہ ابھی رو دیں گے، میں نے سوچا یہ محبت بھی کیسی ظالم چیز ہے پچپن سالہ، چھ فٹ لمبے تڑنگے شخص کو بھی رلا دیتی ہے۔

کون یاد آ رہی ہے، آپ مجھے تفصیل سے بتائیں تاکہ آپ کے دل کا بوجھ ہلکا ہو میں ان کے لئے یہی کر سکتا تھا۔

دارلماہی کی مچھلی یاد آ رہی ہے، بٹ صاحب نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

لاحول ولا قوۃ میرے منہ سے بے اختیار نکلا میں سمجھا کوئی محبوبہ یاد آ رہی ہے۔

بٹ صاحب میری اس بد ذوقی پر بہت حیران ہوئے۔

مچھلی کے قتلوں کے مقابلے میں بھلا کسی قتالہ کی کیا اہمیت ہے ؟

انہوں نے گلو گیر لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

جہاز میں ان بدبختوں نے کھانے کے لئے جو دیا تھا، وہ آپ نے دیکھا تھا؟

میں تو اس طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

بے شک ایک سچے عاشق کی یہی نشانی ہے بٹ صاحب کا شمار بلا شبہ اشیائے خورد نوش کے سچے اور جان نثار عاشقوں میں ہوتا ہے۔

انتظار کے پانچ گھنٹے ہم نے ائیر پورٹ پو گھوم پھر کر گزارے میر تقی میر نے یہ شعر غالباً کچھ اسی قسم کی صورت حال میں کہا تھا۔

ترے کوچے اس بہانے میرا دن سے رات کرنا

کبھی اس سے بات کرنا، کبھی اس سے بات کرنا

ائیر پورٹ اچھا تھا لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ مقامی حسینائیں مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں آئیں، اگر بنکاک کے شعلے یہی تھے تو یہ خاصے بجھے بجھے تھے۔۔۔۔۔۔۔

اڑنے سے پہلے ہی میرا رنگ زرد تھا

مرحلہ ہفت خواں

مجھے جب آسٹریلیا اور سنگا پور کے دورے کی دعوت موصول ہوئی تو میں نے اندرون ملک اور بیرون ملک وقت مانگنے والوں سے ان تاریخوں میں معذرت کرنا شروع کر دی جو تاریخیں اس دورے کے آغاز اور انجام کے درمیان میں پڑتی تھیں، مگر اس کے نتیجے میں خاصی ناخوشگوار صورت حال کا سامنا کرنا پڑا، انہی دنوں میں ایک دوست نے پینتالیس برس کی عمر میں شادی کے لئے رضا مندی کا اظہار کیا ان کی ہونے والی بیوی نے یہ انقلابی فیصلہ پچاس سال کی عمر میں کیا تھا، چنانچہ دولہا میاں نے یہ نوید مجھے ٹیلیفون پر سنائی اور کہا میری خوشی اسی صورت میں دو چند ہو جائے گی، اگر آپ اس شادی میں شریک ہوں مگر تاریخ وہی تھی، جو ہماری میزبان فلپس کمپنی والوں نے آسڑیلیا روانگی کی بتائی تھی، سو مجھے بادل نخواستہ معذرت کرنا پڑی، اسی طرح تین چار مختلف النوع تقریبات ایسی تھیں، جن میں خود میرا دولہا بننے کا شوق پورا ہوتا تھا، یعنی صدارت ہاتھ آ رہی تھی، مگر شو مئی قسمت سے یہ تقریبات بھی انہی تاریخوں میں پڑتی تھیں، یہاں تک تو معاملہ ٹھیک تھا لیکن ہوا یوں کہ آسڑیلیا روانگی کی تاریخ میں قدرے رد و بدل ہو گیا، جو کہ اس طرح کے دوروں میں عموماً ہوتا ہے، اور چونکہ میں متذکرہ تقریبات میں نہ آنے کا وعدہ کر چکا تھا اور وعدہ خلافی مرد کے شایان شان نہیں چنانچہ میں نے ان تقریبات میں شمولیت مناسب نہیں سمجھی، مگر جب میں ان تاریخوں میں لاہور میں پایا گیا تو احباب نے میری شخصیت کے حوالے سے خاصی نازیبا سی باتیں کہیں، مور اوور کہ اس دوران برطانیہ اور ناروے کے دوستوں نے مجھے اپنے ہاں مدعو کیا، مگر میرے لیئے تاریخ کا تعین ممکن نہیں تھا، آسڑیلیا کے لئے حتمی روانگی کی تاریخ ابھی طے ہونا تھی، بلا آخر یہ مرحلہ ہفت خواں بھی طے ہوا مگر اس کے بعد ایک اور مرحلہ آگیا۔

پسرو کا سر سید

لاہور سے فیصل الیکڑک کے مرزا عبد القیوم جن کی تعلیمی اور سماجی شعبے میں بے پناہ خدمات ہیں اور جنھیں اسی حوالے سے پسرو کا سر سید کہا جاتا ہے میرے ہمراہ تھے، ان سے طے تھا کہ صبح ساڑھے دس بجے ائیر پورٹ پر ملاقات ہو گی، فلائٹ کا ٹائم سوا گیارہ بجے کا تھا، میں ٹھیک ساڑھے دس بجے ائیر پورٹ پر تھا، جہاں برادرم عبدا لقیوم اور بٹ صاحب میرے منتظر تھے، چھ فٹے بٹ صاحب نے اپنی پاٹ دار آواز میں میرا استقبال کیا اور اپنا معمول کا فقرہ دہرایا، ملاقاتوں میں اتنا وقفہ نہ ڈالا کریں، آپ کویں ہمیں بیمار کریں گے، حالانکہ ابھی کل ان سے ملاقات ہوئی تھی، تاہم اصلی تے وڈا استقبال کمپنی کے نمائندوں نے کیا جو سرخ گلاب کے ہار لئے ہمارے منتظر تھے، یہ ہار نہ نہ کرتے ہوئے بھی ہم تینوں کے گلے میں ڈال دئیے گئے تھے، بلکہ تصویریں بھی کھینچیں گئیں، ارد گرد کھڑے مسافر اور ان کے عزیز و اقارب باہم زائرین کو عقیدت کی نظروں سے دیکھ رہے تھے، مگر سوچ رہے تھے، حج کا سیزن نہیں ہے، یہ خوش نصیب یقیناً عمرے پر جا رہے ہوں گے، انہوں نے غالباً اکبر الہ آبادی کا یہ شعر نہیں سنا تھا۔

سدھاریں شیخ کعبہ کو ہم انگلستان دیکھیں گے

وہ دیکھیں گے گھر خدا کا، ہم خدا کی شان دیکھیں گے

سو خدا کی شان دیکھنے کے لئے آسڑیلیا جانے والے مسافروں منے جب ائیر پورٹ پر لینڈ کیا تو کمپنی والے ایک دفعہ پھر استقبال کے لئے کھڑے تھے مگر خدا کا شکر ہے اس دفعہ ان کے ہاتھوں میں ہار نہیں تھے۔

وگر نہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے۔

ڈاکیہ بنے گا؟

یہ مشکل مرحلہ میزبانوں کی طرف سے موصول ہونے والا وہ چھپا ہوا ہدایت نامہ تھا جو روانگی سے صرف ایک دن قبل موصول ہوا، اگر مجھے پہلے سے علم ہوتا کہ کمپنی والے اتنے کڑی شرائط عائد کریں گے تو میں اپنا استعفیٰ بہ حسرت و یاس پیش کر دیتا، مثلاً اس ہدایت نامے میں مسافروں کو ہدایت کی گئی تھی، کہ آسڑیلیا اور سنگاپور میں قیام کے دوران ناپسندیدہ حرکات سے پرہیز کریں نیز سڑکوں پہ گندگی نہ پھیلائیں، حتی کہ تھوک دان کے علاوہ کہیں تھوکنے کی کوشش بھی نہ کریں، یہ سوچ

طبعیت اداس ہو گئی کہ دو ہفتے ادھر ادھر تھوک نہیں سکیں گے اور کوئی ناروا حرکت بھی نہیں کر سکیں گے، ایک ناروا پابندی یہ بھی عائد تھی کہ غیر ملکیوں سے اچھے اخلاق سے پیش آئیں، مسافروں کے لئے ایک ہدایت یہ تھی کہ اپنے ضروری سفری کاغذات دستی بیگ میں رکھنے کے بجائے اپنی پتلون کی جیبوں میں اس طرح محفوظ کریں کہ ان کے چوری ہونے کا اندیشہ نہ رہے، یہاں تک کہ تو معاملہ ٹھیک تھا، لیکن آگے چل کر ان چیزوں کو خفیہ حصوں میں رکھیں، والی بات سمجھ میں نہ آئی نہ پسند آئی، البتہ اس ہدایت نامے میں ایک خوشخبری بھی تھی، اور وہ یہ تھی کہ اگر خدا نہ خواستہ بیمار ہو جائیں یا آپ کو کسی مدد کی ضرورت ہو تو اپنے گروپ لیڈر جناب اطہر حلیم صاحب سے رابطہ کریں، میرے ہمسفر منیر بٹ صاحب خصوصاً اس خبر سے بہت خوش ہوئے انہوں نے ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے کہا اس کا مطلب ہے آسٹریلیا میں حلیم دستیاب ہے سو خواتین و حضرات یہ وہ حالات تھے جن کی وجہ سے دل کی کلی کھلنے سے پہلے وطن کی آزاد فضاؤں میں لوٹتے ہی سڑکوں پو مونگ پھلی، مالٹوں اور کیلوں کے چھلکے وغیرہ بے خوف و خطر پھینک سکیں، دیواروں پہ پان کی پیک سے نقش و نگار بنا سکیں، نیز جس کے ساتھ ساچہیں کھل کر بد اخلاقی کا مظاہرہ کر سکیں۔

منیر نیازی کا شعر ہے۔

اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو

میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

سو مقامات آہ و فغاں یہیں تک محدود نہیں تھے، بلکہ ان کا سلسلہ ابھی جاری تھا، مثلاً یہی کہ ہماری فلائٹ لاہور سے نہیں کراچی سے تھی، کراچی جو ان دنوں اپنوں اور غیروں کی وجہ سے مقتل بنا ہوا ہے، ایک وقت تھا کراچی پاکستان کا ایک مثالی شہر تھا، بلکہ ایک چھوٹا سا مثالی پاکستان تھا، یہاں سب قومیت کے لوگ امن و آشتی سے رہتے تھے، لیکن پھر رفتہ رفتہ نفرتوں نے سر اٹھایا، ہماری سیاسی اور غیر سیاسی حکومتوں نے ان نفرتوں کو ہوا دی، باقی کام بھارت کی خفیہ ایجنسی را نے سر انجام دیا، اور اب شہر ایک عرصے سے شعلوں کی لپیٹ میں ہے، ادھر ادھر سے آنے والی کلاشنکوف کی کوئی ناواقف گولی بھی آپ کے ساتھ بے تکلف ہو سکتی ہے، اور مجھے اسی شہر سے گزر کر جانا تھا۔

پیار کا پہلا شہر

پیرس کا شمار یورپ کے قدیم ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ ازمنہ قدیم میں میں جب یہ علاقہ چند دلدلوں اور جزیروں پر مشتمل تھا سیلٹ نسل کے لوگ یہاں آباد ہوئے۔ پیرس

کا اولین حوالہ جو لیس سیزر کی ایک کتاب میں ملتا ہے وہ لکھتا ہے کہ یہاں پر پارسی نامی قبیلہ آباد تھا۔ جس کے نام پر بعد میں اس نو آباد قصبے کو پیرس کہا جانے لگا۔ دور آیا جو خلیفہ ہارون الرشید کا ہم عصر تھا اور جو اندلس فتح کرنے کے سوق میں کوہ پیرانیز کے اس پار جا کر مسلمانوں کے ہاتھوں اپنی فوج کی گت بنوا کر ٹھنڈا ٹھنڈا واپس آ گیا۔ اس کے بعد کی تاریخ گڈ مڈ ہو جاتی ہے۔ لوئی اور فلپ نام کے درجنوں بادشاہ آئے جس کا سیریل نمبر ہمیشہ ذہن سے اتر جاتا ہے۔ آخر میں عظیم نپولین کا دور ہوا۔ اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ سنان دوسری صبح دیر تک سوتا رہا۔ اس کے ذہن میں آج کے لئے کوئی واضح پروگرام موجود نہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تمام د اس تاریخی شہر کے گلی کوچوں میں بے مقصد گھومتے ہوئے گزار دے اور شام کو دریائے سین کے کنارے پاسکل کی تلاش کرے، پانی کے نل میں آج پانی بھی موجود تھا۔ میڈم زی نے حسب وعدہ نیچے سے پانی کی منقطع سپلائی بحال کر دی تھی۔ شیو بنانے اور کپڑے بدلنے سے فارغ ہو کر سنان دروازے کے پاس رکا۔ اندر بالکل خاموشی تھی۔ اور پھر سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ ہال میں میڈم زی یا اس کی بوڑھی ماں میں سے کوئی بھی موجود نہ تھا البتہ وہ گنجا طوطا مزے سے پنجرے میں بیٹھا آنکھیں جھپکا رہا تھا اور حسب سابق سنان کو دیکھنے ہی ٹین ٹین کرنے لگا۔ سنان نے چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھا اور پھر چپکے سے پنجرے کا دروازہ کھول کر طوطے کے گنجے سر پر ایک دھپ لگا دی طوطے نے ایک لمبی ٹین کی اور پھر خاموش ہو گیا۔ سنان اپنے اس کارنامے پر بیحد مسرور ہوا اور ہاتھ ملتا ہوا مکان سے باہر نکل آیا۔ وہ خاصی دیر یوں ہی بے مقصد گھومتا رہا۔ ایک گلی میں اس کی نظر اس قہوہ خانہ پر پڑی جہاں اس کی ملاقات طوطے والی بڑی اماں کے ساتھ ہوئی تھی۔ آج شام یہاں آ کر کافی پی جائے گی، سنان نے اپنے آپ سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ پاسکل سے نہ ملنے کا غم پیرس کی حسین اور چمکتی ہوئی صبح نے قدرے ماند کر دیا تھا اور وہ ایک تجربہ کار سیاح کی مانند ہر شے، ہر عمارت اور شہر کے مکینوں کو بہ نظر غور دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ شہر کا یہ حصہ خاصا پسماندہ دکھائی دیتا ہے اکثر بالکونیوں کی حالت مخدوش ہے۔ چند مکان گرنے کو ہیں۔ گلیاں کھردرے پتھروں کی ہیں جانے وہ صوبیدار دلنواز نے شیشے کی سڑکیں کہاں دیکھی تھیں۔ لوگ انگریزوں کی نسبت قدرے فربہ، چھوٹے قد کے اور سیاہ بالوں والے ہیں۔ اتنے صاف ستھرے بھی نہیں البتہ انگریزوں کے مقابلے میں زندگی سے بیزار دکھائی نہیں دیتے بلکہ ضرورت سے زیادہ مسرور ہیں۔ وہ یونہی تانکتا جھانکتا سیکرے کر کے کلیسا تک آگیا جس کے خوبصورت گنبد اس کے کمرے سے دکھائی دیتے تھے۔ وہ صدر دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ کلیسا بیحد تاریک اور خشک تھا۔ سامنے حضرت عیسی علیہ السلام اور حضرت مریم علیہ السلام کے درجنوں مجسموں کے نیچے سینکڑوں لامبی اور نازک موم بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ چند لوگ جن میں اکثریت بوڑھی عورتوں کی تھی لکڑی کے سخت پٹچوں پر گھٹنے ٹیکے عبادت میں مصروف تھے۔ سنان کو خیال آیا کہ اگر اس عمارت میں روشنی کا انتظام قدرے بہتر ہو جائے تو طرز تعمیر کی باریکیاں اجاگر ہو سکتی تھیں۔ سنان بھی سستانے کی خاطر ایک بنچ پر بیٹھ کر یونہی جلتی ہوئی موم بتیوں کو گھورتا رہا۔ اس سے کچھ دور سیاہ لباس میں ملبوس ایک

بوڑھی عورت عباد کر رہی تھی عورت سنان کو دیکھ کر مسکرا دی۔ یہ طوطے والی بڑی اماں تھیں۔ سنان کو خفت سی محسوس ہونے لگی۔ وہ اس بڑی اماں کے چہیتے طوطے کو چپت لگا کر آیا تھا۔ وہ جواباً مسکرا دیا اور پھر بنچ سے اٹھ کر جلدی سے باہر آگیا۔ باہر کی تیز دھوپ نے اس کی آنکھیں چندھیاں دیں۔ کلیسا کے عین سامنے چوڑی اور خوبصورت سیڑھیاں نیچے بازار تک اترتی تھیں۔ ان سیڑھیوں پر بیحد رونق تھی۔ فرانسیسی بوڑھے جو پائپ منہ میں اڑ سے اخبار پڑھنے میں مگن تھے یا دھوپ میں اونگھ رہے تھے۔ بوڑھی عورتیں، بے شمار ننھے منے بچے، کچھ بچہ گاڑیوں میں کلبلاتے ہوئے اور ان سے عمر میں بڑے سیڑھیوں کے ساتھ باغیچے میں کیڑی کاڑا قسم کا کوئی کھیل کھیلتے ہوئے۔ سنان نے وہاں نو جوان لڑکے اور لڑکیوں کی کمی بری طرح محسوس کی پھر اسے یاد آیا کہ پیرس کے باشندے کی اکثریت موسم گرما میں ساحلی مقامات کی جانب کوچ کر جاتی ہے اور بقول ایک گائیڈ بک کے وہاں صرف نکمے آوارہ گرد، قلاش مصور، غیر ملکی سیاح اور آوارہ کتے ہی رہ جاتے ہیں۔ یہاں پر کتے تو نظر نہیں آ رہے تھے البتہ مصوروں کی بہتات تھی جو ایزل سامنے رکھے ارد گرد کے شور سے لاتعلق سیکرے کر کے خوبصورت گنبدوں کو کینوس پر منتقل کر رہے تھے۔ سنان بھی وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گیا اور پیرس کی زندگی کے ان دلچسپ پہلوؤں سے لطف اندوز ہونے لگا۔ ابھی وہ وہاں کچھ ہی دیر بیٹھا ہو گا کہ ایک نوجوان مصور اس کے پاس آ کھڑا ہوا مصور کے گلے میں مختلف قسم کی درجنوں مالائیں تسبیحیں اور مندروں میں بجائی جانے والی ایک بڑی گھنٹی لٹک رہی تھی۔ مصور نے گھنٹی اٹھا کر سنان کے کان کے پاس لے کر کر زور زور سے بجائی اور مسکرانے لگا۔ صبح خیر سنان بھی مسکرا دیا۔ مصور اس کے ساتھ ہی سیڑھیوں پر براجمان ہو گیا اور بغل میں دابی ہوئی متعدد تصویروں میں سے ایک نکال کر سنان کے گھٹنوں پر پھیلا دی۔ سنان تصویر کو دیکھ کر بیحد حیران ہوا۔ یہ اس کی اپنی ہی لگ رہی تھی۔ آپ نے شاید دیکھا نہیں۔ میں پچھلے دس منٹ سے آپ کی تصویر کشی میں مصروف تھا۔ مصور نے نہایت ادب سے کہا۔ خوب ہے سنان نے کہا، تصویر واقعی عمدہ بنی تھی۔ میری طرف سے یہ بطور تحفہ قبول فرمائیے۔ مصور نے کھڑے ہو کر جھک کر کہا اور گلے میں بندھی گھنٹی ہلا دی۔ ٹن ٹناٹن۔ سنان اس بے جا خلوص کے مظاہرے سے بیحد متاثر ہوا۔ نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ بہر حال آپ کا شکریہ۔ شکریے کی کوئی بات نہیں۔ آپ کے مشرقی خد و خال اتنے دلفریب ہیں کہ میرے اندر تخلیقی جذبات کا ایک سمندر ابل پڑا اور مجھے آپ کی تصویر بناتے ہی بنی۔ سنان سیدھا ہو کر بیٹھ گیا گویا وہ واقعی خوش شکل تھا۔ اس نے مصور کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا اور تصویر قبول کر لی۔ اسے تو ہمیشہ سے ہی تخلیقی جذبات کی سر پرستی کا خیال رہتا تھا۔ میں بیحد ممنون ہوں سنان اس کے احسان تلے دبا جا رہا تھا۔ مصور نے جواباً صرف گھنٹی بجا دینے پر اکتفا کیا۔ ٹن ٹنا ٹن اور وہیں کھڑا رہا۔ سنان کچھ عرصہ تو اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا تا رہا مگر جب اس کے جبڑے دکھنے شروع ہو گئے تو وہ سنجیدہ ہو گیا۔ آخر یہ مصور یہاں سے جاتا کیوں نہیں۔ میں نے کہا کہ میں بیحد ممنون ہوں۔ سنان نے ایک مرتبہ پھر مسکرانے کی کوشش کی۔ مصور نے بھی ایک مرتبہ پھر وہیں کھڑے کھڑے گلے میں بندھی گھنٹی

بجا دی۔ ٹن ٹناٹن۔ سنان جھلا گیا۔ آخر یہ حضرت چاہتے کیا ہیں ؟ اس نے اپنی تصویر سیڑھیوں پر رکھ دی اور جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ بہترین طریقہ یہی ہے کہ اسے نظر انداز کیا جائے خود بخود چلا جائے گا۔ سنان پیکٹ میں سے سگریٹ نکالنے لگا تو مصور نے جھک کر اپنی مدد آپ کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ایک سگریٹ اٹھا لیا۔ سنان خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔ اپنا سگریٹ سلگانے لگا تو مصور نے بھی منہ میں دابا ہوا سگریٹ آگے کر دیا۔ سنان کو طوعاً کرہاً سلگانا پڑا۔ سگریٹ سلگا کر مصور پھر کھڑا ہو گیا اور گلے میں لٹکتی ہوئی گھنٹی بجا دی۔ ٹن ٹنا ٹن آخر تم چاہتے کیا ہو؟سنان نے تنگ آ کر پوچھا۔ بیس فرانک۔ بیس فرانک وہ کس بات کے ؟تین فرانک کا کینوس اور ایک فرانک کے رنگ تصویر کشی میں صرف ہوئے اور سولہ فرانک میری اجرت۔ سنان میں تخلیقی جذبے کی سر پرستی کے ارفع اعلی جذبات فوراً سرد پڑ گئے۔ ٹن ٹنا ٹن مصور نے پھر گھنٹی بجائی اور کہنا شروع کیا،بیس فرانک کچھ زیادہ نہیں، ہو سکتا ہے آج سے چند سو برس بعد میں ایک بہت بڑے مصور کی حیثیت سے پہچان لیا جاؤں اور یہی تصویر آپ بیس ہزار فرانک میں فروخت کر دیں۔ چند برسوں بعد میں فروخت کر سکوں۔ ۔ سنان نے میں پر زور دیتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ چلئے آپ کی اولاد ہی سہی۔ اب لائیے نا بیس فرانک مجھے کسی اور سیاح کی تصویر بھی بنانی ہے۔ سودا پندرہ میں طے پا گیا اور سنان قیمت ادا کر کے فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا مبادا کسی اور مصور کے دل میں اس کے مشرقی خدو خال دیکھ کر تخلیقی جذبات کا سمندر ابل پڑے۔ کلیسا کے پاس ہی ٹرام اسٹیشن بھی تھا۔ سنان اپنی پندرہ فرانک کی تصویر بغل میں دابے وہیں سے ایک ٹرام میں سوار ہو کر شہر کے مرکز میں اتر گیا جہاں سے نپولین کی تعمیر کردہ فتح کی محراب کھڑی تھی۔ محراب کے چاروں طرف نپولین کی مختلف جنگوں کے واقعات سنگ مر مر کے خوشنما مجسموں کی صورت میں ابھرے ہوئے تھے۔ اس محراب میں سے بارہ خوبصورت سڑکیں نکل کر پیرس کے سینے پر حیات آفرین شریانوں کی طرح پھیل گئی ہیں۔ انہی میں سے ایک مشہور زمانہ شانزے لیزے ہے جسے فرانسیسی دنیا کی خوبصورت ترین سڑک کا خطاب دیتے تھے۔ سنان اس میں تھوڑا سا رد و بدل کرنا چاہتا تھا۔ شانز ے لیزے یقیناً دنیا کی دوسری خوبصورت ترین سڑک کہلانے کی مستحق تھی۔ لاہور کی مال روڈ کو اس پر فوقیت حاصل تھی۔

شائز جیسا کہ اس سڑک کو اہل پیرس پیار سے پکارتے ہیں 1212 میں ماری ڈی میڈیکا کے بنائے ہوئے نقشے کے مطابق تعمیر ہوئی۔ سڑک کے دونوں طرف پیدل چلنے والوں کے لئے وسیع فٹ پاتھ ہیں جن کے گرد ہرے بھرے درختوں کی قطاریں دور تک چلی گئی ہیں۔ فٹ پاتھ کے پہلو میں پیرس کی بہترین فیشن کی دکانیں اور قہوہ خانے ہیں جہاں لوگ مشروب پینے کی خاطر کم اور فٹ پاتھ پر رواں فیشن پریڈ دیکھنے کے لئے زیادہ بیٹھے ہیں۔ ایک میل سے زیادہ طویل یہ سڑک کا نکورد چوک کے درجنوں عالیشان فواروں پر ختم ہوئی ہے جہاں انقلاب فرانس کے دوران میں گلو ٹین گاڑ کر تین ہزار کے لگ بھگ لوگوں کے سر قلم کر دیئے گئے تھے۔ ان میں لوئی سائز دھم کے علاوہ ملکہ ماری انتونیت غریبوں کے پاس اگر روٹی نہیں تو وہ کیک کیوں نہیں کھاتے ؟

سنان بھی ایک عام سیاح کی مانند ایک قہوہ خانے کے باہر بیٹھ کر کافی پینے لگا اور فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے گوں کا جائزہ لینے لگ۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس مشغلے سے اکتا گی۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ دنیا کے بہترین عجائب گھر لودر میں جا کر مصوری کا شاہکار مونا لیزا اور وینس کا خوبصورت مجسمہ دیکھا جائے۔ چنانچہ اس نے ویٹر سے کافی کا بل لانے کو کہا بل کی آمد نے پیرس کی خوبصورتی میں زہر گھول دی۔ پانچ فرانک کافی کے دو فرانک سروس چارج یعنی مبلغ چودہ روپے پاکستانی کافی پ اٹھ گئے ؟ فتح کی محراب کے میٹرو اسٹیشن سے وہ گاڑی میں سوار ہو کر الودر عجائب گھر کے اسٹیشن اتر گی۔ یہ اسٹیشن یقیناً ماسکو کے زیر زمین اسٹیشنوں کے ہم پلہ تھا جنہیں دنیا میں خوبصورت ترین مانا جاتا ہے۔ لودر اسٹیشن کا وسیع پلیٹ فارم ہلکی روشنی سے منور تھا دیواروں میں جا بجا اطالوی اور یونانی مجسمے رکھے ہوئے تھے۔ چھت سے درجنوں بیش قیمت جھاڑ اور فانوس لٹک رہے تھے۔ وہ اس اسٹیشن کی مسحور کن خوبصورتی میں کھویا ہوا تھا کہ پیچھے کھڑے ہوئے ایک مسافر نے اسے کندھے سے پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو ایک پاکستانی حضرت جن کی صورت سے وہ قطعاً نا آشنا تھا کھڑے مسکرا رہے تھے ؟ آپ کا نام سنان ہی ہے ن۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا آپ کسی زمانے میں لاہور کے نیشنل کالج آف آرٹس میں بڑی باقاعدگی سے آیا کرتے تھے۔ سنان کو یاد آیا کہ وہ اس کالج میں ایک دوست تنویر کے پاس اپنے گھر کا نقشہ بنوانے کی غرض سے جایا کرتا تھا۔ تنویر کو انہی دنوں لاہور کے چڑیا گھر کا نقشہ بنانے کا ٹھیکہ بھی مل گی۔ چنانچہ جب سنان کے گھر کا نقشہ مکمل ہوا تو تنویر کی غیر حاضر دماغی کی وجہ سے باورچی خانے کی بجائے وہاں ریچھوں کے پنجرے کا نقشہ بن گیا اور سنان کا باورچی خانہ چڑیا گھر کے نقشے میں منتقل ہو گی۔ ای لئے تو شاید آج کل یہ کہا جا رہا ہے کہ لاہور کے چریا گھر میں جانوروں کو گھر کا سا ماحول میسر ہے۔ بہر حال سنان یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ ان حضرت کا نیشنل کالج آف آرٹس سے کیا تعلق ہو سکتا ہے ؟ مجھے افسوس ہے کہ میں اپ کو پہچان نہیں پایا سنان نے شرمندہ ہو کر کہ۔ مجھے کہاری کہتے ہیں ان صاحب نے نہایت انکساری سے اپنا تعارف کروایا ایک روز آرکی ٹیکچر کے لیکچرار تنویر صاحب کے کمرے میں آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ آہا کہاری صاحب سنان نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا پہچان وہ اب بھی نہیں پایا تھا.بھئی بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر کہاری صاحب تو آپے سے باہر ہو رہے تھے مدتوں بعد کسی آشنا صورت سے واسطہ پڑا ہے .شاید یہ صاحب تنویر کے ہاں چڑیا گھر کی تعمیر نو کے ٹھیکے کے لئے آیا کرتے تھے ،سنان کو یاد آ گیا، اور سنائیے کہاری صاحب آپ کے چڑیا گھر کا کیا حال ہے۔ سنان نے سوشل ہونے کی کوشش کی، چڑیا گھر ؟کہاری صاحب نے حیرت زدہ ہو کر پوچھ۔ جی ہاں چڑیا گھر؟بندروں اور ریچھوں کے پنجرے وغیرہ؟ بندروں کہاری صاحب باقاعدہ ہنسنے لگے آپ مجھے پہچان نہیں سکے میرا پیشہ تو مصوری ہے۔ پچھلے چند ماہ سے پاکستان کے ایک صنعتی ادارے کے توسط سے پیرس میں مقیم ہوں اور یہاں پاکستانی دستکاریوں کو فروغ دینے کے لئے کوشاں ہوں۔ سنان بے حد شرمندہ ہوا اور بھر پور معذرت کی۔ کیا آپ بھی یہ مصوری وغیرہ کے سلسلے میں پیرس آئے ہیں۔

کہاری صاحب نے سنان کے بغل میں دابی ہوئی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کی۔ اوہ یہ تصویر ،سنان نے ہنس کر کہا پندرہ فرانک اٹھے ہیں اس پر اور پھر اپنی سیاحت کے بارے میں بتایا 'اب کیا پروگرام ہے ' 'لودر کے عجائب گھر میں جانے کا خیال تھا' چھوڑئیے صاحب کہاری صاحب نے خوشدلی سے کہا پچھلے پہر تو عجاب گھر سیاحوں سے ٹھسا پڑا ہوتا ہے ہجوم کی وجہ سے آپ کو تصویروں کے فریم اور مجسموں کی ٹانگوں کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔ صبح سویرے جا کر دیکھئے اور اس وقت میرے ساتھ چل کر میرے کمرے میں کافی کی ایک پیالی پیجئے ؟ کہاری کی دعوت میں اتنا خلوص تھا کہ سنان انکار نہ کر سکا۔ لودر بعد میں دیکھ لیں گے۔ اس نے سوچا اور کہاری کے ساتھ چل دی۔ کہاری کے چھورے سے کمرے پر اچھے خاصے عجائب گھر کا گمان ہوتا تھا۔ پاکستانی دستکاریوں کے نمونے مغل طرز مصوری کی لاتعداد تصاویر پیرس کی تاریخی عمارتوں کے پنسل اسکیچ رنگوں کے ڈبے خالی کینوس اور خالی بوتلیں ؟ کہاری نے سنان کو اپنی بنائی ہوئی تصاویر اور مٹی کی نقش شدہ اینٹیں دکھائیں جنہیں پیرس کے فن پرست حلقوں نے بے حد سراہا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے ایک کونے میں رکھے ایک شوو پا کافی تیار کی اور وہ دونوں وہیں قالین پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

آخر پیرس میں ایسی کونسی کشش ہے کہ دنیا جہاں کے مصور یہاں کھنچے چلے آتے ہیں۔ مجھے تو ابھی تک اس شہر میں کوئی خاصی بات نظر نہیں آتی۔ سنان نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہاری سے پوچھا فن کے بارے میں یہاں کے لوگوں کا خوشگوار رویہ حکومت کی طرف سے مراعات اور سرپرستی یہاں کا ماحول اور پھر پیرس کی تاریخی عمارتیں جو کینوس پر منتقل ہو کر اور بھی دیدہ زیب ہو جاتی ہیں۔ مصور بھی ایک شاعر کی طرح ہوتا ہے - وہ چاہے اپنے فن کے ذریعے سے دو وقت کی روٹی کھانے میں ناکام ہو جائے مگر وہ داد ضرور چاہتا ہے۔ اہل پیرس اس معاملے میں وسیع القلب واقع ہوتے ہیں اور یہی چیز مصوروں کو یہاں کھینچ لاتی ہے۔ کافی ختم کرنے کے بعد کہاری نے اسے پاکستانی موسیقی کے ریکارڈ سنوانے کے دوران میں یکدم دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی ایک شوخ و شنگ قسم کی نوجوان فرانسیسی لڑکی مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے سنان کو ایک نظر دیکھا اور پھر کہاری سے مخاطب ہو کر فرانسیسی میں کچھ کہا۔ کہاری نے ہنستے ہوئے اسی زبان میں جواب دیا اور لڑکی اسی وقت باہر نکل گئی۔ آپ نے بھی رکھی ہے سنان نے سنجیدگی سے پوچھا،

کیا چیز؟

یہ لڑکی؟

لاحول ولا کہاری صاحب باقاعدہ شرما گئے۔ آپ کو کیسے خیال آیا؟

میرا خیال تھا کہ پیرس میں رہنے والے تمام مصوروں کی بود و باش کا یہ لازمی حصہ ہے ؟

نہیں صاحب یہ بیچاری تو مالک مکان کی لڑکی ہے ؟پوچھنے آئی تھی کہ تمہارے دوست دوپہر کا کھانا تو کھائیں گے ؟دوپہر کے کھانے کے بعد پھر کافی چلی اور پھر شام تک پاکستان اور پیرس کے بارے میں گپ شپ ہوتی رہی۔ تقریباً چھ بجے کے قریب سنان کہاری صاحب کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد ٹرام کے ذریعے واپس مومارت آ گیا اس نے ان سے پیرس سے روانگی سے قبل ملاقات کا وعدہ بھی کیا ؟اب اس کا ارادہ تھا کہ دریائے سین کے کنارے پاسکل کی تلاش میں نکلنے سے قبل اپنا کیمرہ کمرے میں رکھ آئے اور شام کی خنکی کے پیش نظر کوئی اونی چیز بھی پہن لے۔ ۔ ۔ ؟

کلیسا سیکرے کر کی سیڑھیاں طے کر کے جب وہ بائیں ہاتھ پر ایک ڈھلوان کی ٹیڑھی ترچھی اور اونچی نیچی گلیوں نے اسے تھکا دیا تھ؟اسے پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔ سنان قہوہ خانہ کے اندر چلا گیا اور اورنج اسکوائش کی ایک بوتل خرید کر کونے میں پڑی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ نیم تاریک قہوہ خانے میں اسے بیحد سکون کا احساس ہو۔ وہاں اس کے علاوہ اور کوئی گاہن موجود نہ تھ۔ مالک حسب معمول سفید جھاڑن سے کاؤنٹر کی سطح چمکانے میں مصروف تھ۔ ماحول میں تازہ کافی اور وائن کی ملی جلی مہک حیرت انگیز طور پر خوشگوار تھی؟ موسیو ہوٹل۔ قہوہ خانے کے مالک نے وہیں کھڑے کھڑے سنان سے پوچھا اسے شاید یاد آ گیا تھا کہ یہ وہی لڑکا ہے جو اس روز ہوٹل کے بارے میں دریافت کرنے آیا تھ؟ مل گیا سنان نے سر ہلا کر خوش دلی سے کہا۔ ترے بیان مالک نے بھی سر ہلایا اور پھر الماری میں رکھے ہوئے شراب کے نازک اور پتلے گلاس نکال کر پونچھنے لگا۔ اتنے میں قہوہ خانہ کا دروازہ کھلا اور وہی مصور پال جسے میڈم زی نے کرایہ نہ ادا کرنے کی پاداش میں کمرے سے نکال دیا تھا اندر داخل ہوا۔ اس کی پشت چونکہ سنان کی جانب تھی اس لئے وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہ پائے۔ پاس سیدھا کاؤنٹر پر گیا اور مالک سے سرخ شراب کا ایک گلاس خرید کر وہیں اسٹول پر بیٹھ کر چسکیاں لینے لگا تقریباً آدھا گلاس شراب پی کر اس نے جیب سے ایک رنگ دار پنسل نکالی اور کاؤنٹر کی سطح پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچنے لگا۔ سنان نے اورنج جوس کا آخری گھونٹ بھرا اور میز سے اٹھ کھڑا ہو۔ وہ پاس سے مل کر یہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ کل کمرے سے نکلنے پر اس نے رات کہاں گزاری تھی اور آج کل کہاں رہتا ہے ؟ اسی اثنا میں جب قہوہ خانے کے مالک نے شراب کے گلاسوں کو جھاڑ پونچھ کر الماری میں رکھ کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو پال کو کاؤنٹر کی صاف اور چمکیلی سطح کو مشق مصوری بناتے دیکھ کر اس کا پارہ چڑھ گیا اور اس نے بڑی درشتگی سے اسے کچھ کہا پاس اسی طرح بڑے سکون سے کاؤنٹر پر لکیریں کھینچتا رہا مالک کچھ دیر تو وہاں کھڑا ہے اس عمل سے باز رکھنے کی کوشش کرتا رہا مگر جب نتائج خاطر خواہ بر آمد نہ ہوئے تو اس نے پال کی جیکٹ پکڑ کر زور سے کھینچا۔ اس کے بعد حالات ایک دم بگڑ گئے اور تھوڑی دیر بعد وہ ایک دوسرے کو دھما دھم پیٹ رہے تھے۔ مالک چونکہ بھاری تنو توش کا مالک تھا اس لئے اس کا پلڑہ بھاری نظر آ رہا تھا۔ سنان تھوڑی دیر تو انہیں یوں گتھم گتھا ہوتے دیکھتا رہا اور پھر صلح صفائی کرانے کی غر ض سے آگے بڑھ؟ اے بھائی موسیو۔ یہ لڑائی؟ ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ ان میں سے کسی نے ایک

روز دار گھونسہ اسے بھی جڑ دیا۔ سنان لڑکھڑاتا ہوا واپس اسی میز کے پاس آ پہنچا جہاں وہ اس سے پہلے اورنج جوس پی رہا تھ۔ اس کا جی چاہا کہ خالی بوتل اٹھا کر یونہی لڑھکا دے مگر پھر کچھ سوچ کر وہیں کرسی پر بیٹھ کر اپنا جبڑا سہلانے لگا۔ اسن نے کاؤنٹر کی طرف دیکھا تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ پال اور قہوہ خانے کا مالک بڑے بے تکلی سے بغل گیر ہو رہے تھے اور خوب قہقہے لگا رہے تھے۔ فرانسیسیوں کی کھوپڑی ہی الٹی ہے۔ سنان نے غصے سے منہ پھلایا لیکن اس حرکت سے اس کے جبڑے میں شدت کا درد اٹھا اور وہ پھر چپکے بیٹھ گیا، مکہ شاید زور سے لگا ہے۔ پاس اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ زور سے ہی لگا ہے سنان نے رکھائی سے جواب دیا۔

پیرس میں آج کا دن واقعی ہنگامہ خیز گزرا تھا۔ اب تک صرف مصوروں ہی سے ملاقات ہوتی رہی تھی۔ صبح ایک صاحب پندرہ فرانک ہتھیا کر لے گئے۔ دوپہر کو ایک مصور نے کافی پلائی اور کھانا کھلایا اور اب ایک اور مصور نے اس کے خوبصورت جبڑے کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ پرائے پھڈے میں خواہ مخواہ ٹانگ اڑاتے پال اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر بولا قہوہ خانے کا مالک میرا دوست ہے۔ ہم اکثر کسی نہ کسی بات پر الجھتے رہتے ہیں۔ ویسے اب کی بار غلطی میری تھی جو اس کے صاف شفاف کاؤنٹر کا ستیا ناس کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب جبڑے کا درد قدرے کم ہوا تو سنان کا موڈ بھی قدرے بحال ہو گیا۔ کل جب تمہیں میڈم زی نے کمرے سے نکال دیا تھا تو اس کے بعد شب بسری میں خاصی دقت ہوئی ہو گی۔ اس نے پاس سے پوچھا

ہاں قدرے پال نے لمبی داڑھی میں انگلیوں کے کنگھی کرتے ہوئے جواب دیا۔ میں اپنی پہلی دوست لڑکی کے پاس گیا تو وہاں پیشگی بکنگ ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ آج کل ایک انڈونیشین مصور رہتا ہے۔ بہر حال وہ رات تو فٹ پاتھ پر گزری اور دوسری صبح یہاں سے قریب ہی ایک اور جگہ رہائش کا بندوبست ہو گیا۔ مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمہیں اتنی پریشانی اٹھانی پڑی۔ کوئی بات نہیں، بلکہ مجھے تو الٹا تمہارا شکر گزار ہونا چاہئیے۔ تم نے مجھے تین ماہ کے کرائے سے نجات دلا دی۔ وہ تمہاری پہلی بیوی جو قہوہ خانے میں کام کرتی تھی۔ اس کا کیا ہوا۔ سنان جاننا چاہتا تھا۔ اوہ لوئیس۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی ہے۔

پال نے اسے بتایا کہ وہ جرمنی کے شہر ہیمبرگ کا رہنے والا ہے۔ ماں باپ جنگ عظیم کے بھینٹ چڑھ گئے اور وہ قصابوں کی دکانوں پر سور کاٹتا۔ اسٹیشنوں پر جھاڑو دیتا اور غسل خانوں کی صفائی کرتا جوان ہو گیا۔ اس دوران میں اسے مصوری کی لت پڑ گئی اور وہ پیرس آگیا۔ یہاں وہ پچھلے کئی برسوں سے مقیم تھا۔ آمدن نہ ہونے کے برابر تھی۔ تو پھر گزارا کیسے ہوتا ہے۔ سنان نے پوچھا

نہیں ہوتا، پال نے سر ہلایا۔ کبھی کبھار کوئی تصویر بک جاتی ہے تو چند روز اچھی طرح کٹ جاتے ہیں کسی نیک دل اور فن پرست خاتون سے تعارف ہو جائے تو کچھ عرصہ ہر شام وہاں کم از کم کھانے کے لئے کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے اور مجھے وہاں

صرف مصوری کے بارے میں گفتگو کرنی پڑتی ہے۔ خاتون اگر فن پرستی چھوڑ کر شخصیت پرستی پر اتر آئے تو چار پیسے بھی مل جاتے ہیں یا پھر اور کچھ نہ ملا تو سیکرے کر کلیسا کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر کسی سیاح کی تصویر بنا کر چار پانچ فرانک زبردستی وصول کر لیے۔ چار پانچ فرانک۔ سنا کو اپنے پندرہ فرانک کا خیال آگیا۔

جو بھی مل جائے غنیمت ہوتا ہے۔ کئی تو صرف ایک فرانک پر ہی ٹرخا دیتے ہیں۔ ایک۔ ۔ لیکن میں تو پندرہ فرانک دے کر چھوٹا تھا۔

ہا ہا ہا۔ پال نے بے تحاشا ہنسنا شروع کر دیا۔ گویا تم بھی پھنس گئے تھے۔ پیرس کے قلاش مصوروں کا یہ پسندیدہ طریقہ ہے۔ دس بارہ کینوس لے کر ان پر سیکرے کر کا پس منظر پہلے سے بنا لیا اور پھر چند لکیریں کھینچ کر کسی سیاح کو جا دبوچا۔ آپ کے خد و خال نے میرے دل میں۔ ۔ ہاں ہاں باقی کا حصہ مجھے معلوم ہے۔ سنان نے پشیمان ہو کر کہا۔

اسے یاد آگیا کہ وہ تصویر تو کہاری کے کمرے میں ہی رہ گئی تھی کل سہی۔

اگر تمہیں اور کہیں نہیں جانا تو میرے اسٹوڈیو میں چلو۔ میرے پاس لمبی فرانسیسی ڈبل روٹی اور پنیر بھی ہے۔ پال نے میز سے اٹھتے ہوئے اسے دعوت دی۔

ابھی صرف سات بجے تھے۔ سنان نے سوچا وہ ایک ڈیڑھ گھنٹہ اس دلچسپ شخصیت کے ساتھ گزارے گا اور بعد میں دریائے سین پر چلا جائے گا چنانچہ اس نے پال کے ساتھ اسٹوڈیو جانے کی حامی بھر لی۔ پال کا اسٹوڈیو یا وہ کمرہ جہاں وہ تصویریں بنانے کے ساتھ ساتھ سوتا بھی تھا قہوہ خانے سے کچھ فاصلے پر ایک نہایت بوسیدہ عمارت میں واقع تھا۔ حکومت کی طرف سے اس عمارت کو خطرناک قرار دے کر اسے مسمار کر دینے کے احکام جاری ہو چکے تھے۔ اس اثنا میں چند قلاش مصوروں اور آوارہ گردوں نے وہاں ڈیرے ڈال دیے۔ پال نے سنان کو بتایا کہ بلدیہ کے کارندے تقریباً ہر روز عمارت کو گرانے کے لئے آ دھمکتے ہیں مگر وہاں کے مکین منت سماجت کر کے چند روز کی مہلت لے لیتے ہیں۔ بحر حال یہاں پر کم از کم کرائے کی مصیبت نہ تھی۔ اسٹوڈیو میں سوائے ان رنگوں کے ڈبوں اور چند بوتلوں کے اور کچھ نہ تھا جو کل تک سنان کے کمرے کی زینت تھے۔ کمرے میں پلنگ بھی نہ تھا۔

تمہارا بستر کہاں ہیں ؟

بستر۔ پال نے حسب معمول داڑھی کھجائی۔ میں اپنی جیکٹ میں ہی سو رہتا ہوں کافی گرم ہے۔ اس نے اپنی ہلکی سی جیکٹ کا کونا انگلیوں میں مسلتے ہوئے کہا۔

پال نے چند پرانے اخبار فرش پر پھیلا دیئے مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس بیٹھنے کے لئے کرسی وغیرہ نہیں ہے۔

کوئی بات نہیں سنان زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ یہ طریقہ سراسر مشرقی ہے پال نے میلی جیکٹ کی ایک جیب میں سے اخبار کے کاغذ میں لپٹی ہوئی لمبی ڈبل روٹی نکالی اور دوسری میں سے پنیر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا، ڈبل روٹی درمیان میں سے توڑ کر اس نے آدھی سنان کو تھما دی اور پنیر فرش پر رکھ دیا۔ پال ابھی یہ پر تکلف دسترخوان بچھانے کا تردد کر ہی رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ یکدم کھلا اور ایک چپٹے ناک والی خوبصورت لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔

پال ڈارلنگ آج مجھے تنخواہ مل ہی گئی۔ اس نے اندر آتے ہی پال کے لمبے بال پیار سے کھینچے اور پھر اس کی داڑھی ایک طرف ہٹا کر اس کے لبوں پر بوسہ دیا۔ یہ ہے میری بیوی۔ ۔ آہم۔ ۔ میرا مطلب ہے اس کا نام لوئیس ہے۔ پال نے تعارف کروایا۔ اور یہ ہے میرا دوست۔ اور پھر قدرے رک کر سنا ن سے کہنے لگا۔ بھائی نام کیا ہے تمہارا اور کیا کرتے ہو؟

سنان نے اپنا مکمل تعارف کروایا۔

آپ میرے پہلے پاکستانی دوست ہیں۔ لوئیس نے ان دونوں کے پاس فرش پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے یہ فقرہ ایسے ادا کیا جیسے وہ کسی نادر الوجود پرنے کی نسل سے تعلق رکھتا ہو جو پہلی مرتبہ قابو آیا ہو۔

پنیر اور ڈبل روٹی۔ لوئیس نے فرش پر رکھے طعام کے انتظامات کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوئے دہائی دی۔ میں پچھلے دس روز سے پنیر اور ڈبل روتی کھا رہی ہوں۔ آج مجھے تنخواہ ملی ہے اور ہم کسی قہوہ خانے میں جا کر مناسب قسم کا کھانا کھائیں گے مثلاً تلا ہوا مرغ اور اس کے ساتھ سرخ شراب۔

سرخ شراب۔ پال کی باچھیں کھل گئیں سنان تم بھی آؤ۔

بہت بہت شکریہ پال لیکن آج سارا دن پیرس میں گھومتا رہا ہوں اور اب اپنے کمرے میں جا کر آرام کرنا چاہتا ہون سنان نے فرش سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ملنے آؤ گے۔ پال نے اس کا ہاتھ دبا کر بیحد خلوص سے کہا۔

ضرور جب بھی وقت ملا۔

سنان کمرے سے باہر نکلنے لگا تو پال نے ڈبل روٹی اور پنیر فرش سے اٹھا کر اس کی جیبوں میں ٹھونس دیا کمرے میں جا کر کھا لینا۔ لوئیس کو جان کیوں پسند نہیں۔ سنان نے اس کا دل رکھنے کے لئے دونوں چیزیں قبول کر لیں ورنہ اسے ڈبل روٹی اور پنیر سے کوئی خاص رغبت نہ تھی۔

پال اسے نیچے دروازے تک چھوڑنے یا۔ سنان باہر نکلنے لگا تو پال اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔ اور ہاں میڈم زی سے ذرا بچ کر رہنا۔

کیا مطلب۔ سنان وہیں کھڑا ہو گیا۔

تمہارے جیسے لڑکوں کو تو آملیٹ بنا کر کھا جاتی ہیں موصوفہ پال آنکھ میچ کر مسکرایا۔

پال تمہیں یہ کیسے معلوم ہو۔ اوپر سے لوئیس کی آواز آئی جو شاید ان کی باتیں سن رہی تھی۔

میں نے تو صرف سنا ہے لوئیس ڈارلنگ پال نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بلند آواز میں کہا اور پھر سنان کے پاس آ کر آہستہ سے کہنے لگا۔ مجھے نہ معلوم ہو گا تو اور کس کو ہو گا۔ بھلا تین ماہ کا کرایہ اس نے یونہی تو نہیں چھوڑ دیا تھا۔

وارننگ کا شکریہ۔ سنان نے پال سے ہاتھ ملا یا اور باہر آگیا۔

مومات کے گلی کوچوں میں خوب رونق تھی۔ اکثر لوگ اپنی بالکونیوں میں بیٹھے گلی کے پار اپنے ہمسایوں سے محو گفتگو تھے۔ سنان نے دیکھا کہ جیسے اندرون لاہور پردہ نشین عورتیں سارا دن کھڑکیوں میں بیٹھی خوانچہ فروشوں کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ ریوڑیوں والا آیا تو جھٹ ایک ٹوکری میں چونی رکھی اور رسی سے نیچے لڑھکا دی۔ گھر بیٹھے سبزی اور پھل وغیرہ کی بھی خرید اسی طریق سے کی جاتی ہے۔ کچھ اسی طرح کا نظام یہاں پیرس میں بھی رائج تھا۔ ریوڑیو ں کی بجائے ڈبل روٹی یا وائن خریدی جا رہی تھی۔ قہوہ خانوں کے بر آمدوں میں بچھی ہوئی کرسیاں فٹ پاتھ پھلانگ کر سڑک تک آ پہنچی تھیں۔ ان پر بیٹھے ہوئے لوگ خوش گپوں میں مصروف تھے۔ قہوہ خانوں کے بر آمدوں میں سجاوٹ کی خاطر بانس کے ساتھ بندھی ہوئی رسیوں کے ساتھ رنگ برنگے قمقمے لٹک رہے تھے۔ ہوا چلتی تو بلب جھولتے اور روشنیوں کا عکس بے فکر مصوروں طالبعلموں اور جوان عورتوں کے چہروں پر پڑتا۔

ایک دم سنان کو خیال آیا جس مقصد کے لئے ایک روز سے زیادہ اس شہر میں ٹھہرا تھا وہ تو پورا ہی نہیں ہوا، ابھی تو اسے دریائے سین کے کنارے پاسکل کی تلاش میں نکلنا تھا، وہ سارا دن کی آوارہ گردی سے بیحد تھک چکا تھا اور دریائے سین وہاں سے کافی فاصلے پر تھا، ایک موہوم امید پر وہ اس وقت اتنی دور جانے کے موڈ میں نہ تھا، اس لئے اس نے وہاں جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اپنے مکان کی جانب چل دیا۔

مکان کا دروازہ کھلا تھا، وہ ہال میں داخل ہوا تو دائیں ہاتھ کے کمرے سے ہلکی سی روشنی آ رہی تھی۔

کون ہے۔ اندر سے میڈم زی کی آواز آئی جس نے شاید دروازہ کھلنے کی آواز سن لی تھی۔

میں ہوں آپ کا پاکستانی کرایہ دار میڈم زی نائیلون کے باریک نائٹ گاؤن میں ڈھکی باہر نکل آئی۔

اس کی سرخ آنکھوں سے ظاہر تھا، سنان کے ادا کئیے ہوئے پیشگی کرائے کی رقم کا استعمال ابھی تک جاری ہے، وہ ایک ہاتھ کولہے پر رکھ کر کواڑ کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی، اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

شب بخیر سنان نے جلدی سے کہا اور سیڑھیوں کے طرف بڑھا۔

اتنی جلدی کیا ہے۔ میڈم زی نے وہیں کھڑے کھڑے جھوم کر کہا میرے کمرے میں آ جاؤ ذرا باتیں کریں گے، میں اکیلی بیٹھی بور ہو رہی تھی۔

ادھ کھلے کواڑ سے تپائی پر رکھی شراب کی گدلی سبز بوتل اور ایک گلاس نظر آ رہا تھا۔

شکریہ لیکن۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں بے حد تھک چکا ہوں اب آرام کرنا پسند کروں گا۔

میرے کمرے میں بھی بے آرامی تو نہیں ہو گی، میڈم زی نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

ہلکی روشنی میں اس کے چہروں کی جھریاں ماند پڑ گئی تھیں اور وہ خاصی قبول صورت نظر آ رہی تھی۔

دراصل میں نے ابھی تک شام کا کھانا بھی نہیں کھایا اور یہ۔ ۔ ۔ ۔ سنان نے جیکٹ کی جیب میں ٹھنسی ہوئی ڈبل روٹی کی طرف اشارہ کیا پنیر کے ساتھ کھاؤں گا۔

تھوڑی دیر بعد پھر دستک ہوئی۔

سنان جو بڑے مزے سے سفری رضائی میں لپٹا ہوا تھا، بڑا بڑا تا ہوا اٹھ کھڑا ہوا، اسے شبہ تھا کہ کہیں میڈم زی شراب کے دو چار گلاس اور چڑھانے کے بعد وہ آملیٹ والی دعوت دہرانے نہ آ گئی ہو۔

کیا مصیبت ہے۔ سنان نے ایک لمبی سانس لی اور دروازہ کھول دیا۔

دہلیز پر ساتھ والے کمرے والی لڑکی تھی، اس کے کھلے ہوئے کالے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

میں نے تمہارے کمرے میں روشنی دیکھی تو چلی آئی، مخل ہونے کی معافی چاہتی ہوں۔

فرمائیے سنان نے اباسی لیتے ہوئے پوچھا۔

تمہارے پاس سرخ شراب ہو گی۔

شراب؟سنان نے منہ بنا لیا۔

ہاں انگوروں کی سرخ شراب میں شام کو جلدی میں خریدنا بھول گئی، کل لوٹا دوں گی۔

میں شراب نہیں پیتا سنان نے وہیں کھڑے کھڑے اکتاہٹ سے کہا۔

کافی تو ہو گی۔ مجھے اس وقت کسی شراب کی شدت سے طلب ہے، لڑکی کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔

سنان دروازے سے ہٹ کر پلنگ کے پاس آگیا اور اس کے نیچے سے اپنا سفری تھیلا گھسیٹ کر باہر نکال لیا، تھیلے کی بیرونی جیب میں کھانے پکانے کا سامان تھا، اس نے کافی کا ڈبہ نکال کر لڑکی کے حوالے کر دیا۔

بہت بہت شکریہ، وہ بیحد ممنون نظر آ رہی تھی، میں صرف ایک پیالی بنا کر ابھی واپس کیے دیتی ہوں۔

اس کی ضرورت نہیں سنان نے اخلاقاً مسکرا کر کہا صبح واپس کر دیجئیے گا۔

اور دروازہ بند کر کے اپنے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔

ابھی وہ رضائی کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹنے بھی نہ پایا تھا کہ دروازے پر پھر دستک ہوئی۔

دروازہ کھلا ہے، سنان اٹھ کر بیٹھ گیا، اب ضرور میڈم زی ہو گی، دروازہ کھلا تو پھر وہ ہی لڑکی تھی، اس نے کافی کی دو پیالیاں اٹھا رکھی تھیں،

ایک تمہارے لیے اس نے بستر کے قریب آ کر ایک پیالی سنان کو تھما دی اور وہیں کھڑی ہو گئی، تم مخل ہو تو ہو گے مگر کیا میں یہاں بیٹھ کر کافی پی سکتی ہوں۔ میں اپنے کمرے میں اکیلی بور ہو رہی تھی اور یہ رہا تمہارا کافی کا ڈبہ۔

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس گھر میں عورتوں کی اکثریت بیٹھی بور ہو رہی تھی، پہلے میڈم زی اور اب یہ محترمہ۔

ہاں ہاں ضرور سنان رضائی میں سے نکل کر بستر کے سر پر بیٹھ گیا کمرے میں تو کرسی ہے نہیں آپ پلنگ پر ہی بیٹھ جائیں۔

شکریہ لڑکی نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا، سنان لاشعوری طور پر بالکل ہی کونے میں سمٹ گیا، اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

میرا نام جینا ہے، لڑکی نے اس کی طرف بڑی بے چارگی سے دیکھا۔

مجھے سنان کہتے ہیں اس نے جلدی سے کہا اور پھر سر جھکا کر کافی پینے لگا، اسے بیحد الجھن ہو رہی تھی، وہ سوشل بات چیت کے موڈ میں نہیں تھا اور اب سونا چاہتا تھا۔

آپ کا خاوند ابھی کام سے نہیں لوٹا کیا۔ سنا نے تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اونگھتے ہوئے پوچھا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ لڑکی کی موجودگی میں ہی وہ سو جائے۔

لڑکی ہنس دی میں شادی شدہ نہیں ہوں۔

پچھلی شب آپ کے کمرے میں موسیقی کی بڑی خوبصورت دھنیں بج رہی تھیں۔

شاید کسی مرد کی آواز بھی آ رہی تھی۔

ہاں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پچھلی شب۔ ۔ ۔ ۔ لڑکی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

سنان کی کافی ختم ہو چکی تھی مگر وہ پیالی دونو ں ہاتھوں میں تھامے بستر کے سرے پر اکڑوں بیٹھا رہا، اب وہ کیسے غیر مہذب ہوئے بغیر اس لڑکی کو کمرے سے چلی جانے کو کہے، اس نے جان بوجھ کر ایک طویل جمائی لی۔

خوبصورت دھنیں تھیں۔ لڑکی نے کھڑکی سے نظریں ہٹا کر سنان سے پوچھا۔

ہوں سنان نے چونک کر کہا۔

تم کہہ رہے تھے کہ میرے کمرے میں پچھلی شب بڑی خوبصورت دھنیں بج رہی تھیں۔

ہاں۔ ۔ ۔ وہ۔ ۔ ۔ بالکل۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ستار بہت اچھی تھی۔

میرے کمرے میں آ جاؤ دونوں بیٹھ کر موسیقی سنیں گے، لڑکی نے بڑے خلوص سے دعوت دی۔

ہوں سنان پھر چونک گیا۔

میرے کمرے میں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اچھا۔ ۔ ۔ میرا مطلب ہے پھر کبھی سہی سنان نے بستر سے اٹھ کر پیالی لڑکی کو دی، میں بیحد تھکا ہوا ہوں اور اب سونا پسند کروں گا امید ہے کہ آپ برا نہیں مانیں گی۔

میں کسی بات کا برا نہیں مانتی، لڑکی نے بستر سے اٹھ کر دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا اگر برا مناؤں تو کھاؤں کہاں سے ؟۔ ۔

سنان کو پہلے سے ہی اس لڑکی کے بارے میں موہوم سی بے چینی تھی مگر اب وہ اس فقرے سے سب کچھ جان گیا وہ ایک فرانسیسی محاورے کے مطابق چنچل لڑکی تھی، ایک کاروباری عورت۔

سنان کو اس سے پہلے اس قسم کی لڑکی سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا تھا اور وہ حیران ہو رہا تھا کہ شکل و صورت کے لحاظ سے وہ نہایت عام سی لڑکی لگ رہی تھی، اس نے

اس کے لئے اپنے دل میں ہمدردی سی محسوس کی، ایک چنچل لڑکی ہوتے ہوئے بھی اس نے اس کی باتوں میں بے پناہ خلوص اور چہرے پر معصومیت تھی، اس میڈم زی سے کہیں زیادہ جو شرافت کا لبادہ اوڑھے ہوئے بھی شاید اس لڑکی سے زیادہ گھناؤنے کردار کی مالک تھی۔

میرا خیال تھا کہ مجھے اتنی نیند بھی نہیں آ رہی تھی کہ ستار ی ایک دو دلکش دھنیں بھی نہ سن سکوں، سنان نے بیحد دھیمے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

جینی وہیں رک گئی اور جھجک کر کہنے لگی میں مخل نہیں ہونا چاہتی۔

ایسی کوئی بات نہیں، سنان نے سلیپنگ سوٹ کے اوپر جیکٹ پہنتے ہوئے کہا کافی پینے سے نیند بالکل غائب ہو گئی ہے، میں ستار کی دھنیں ضرور سننا پسند کروں گا۔

جینی کا کمرہ سنان سے کہیں بہتر تھا، کھڑکی پر لیس کے باریک پردوں کو مخل کے بھاری پردوں نے ڈھک رکھا تھا، کونے میں پڑا وسیع پلنگ اپنے متعدد گدوں اور شیل کے رضائی کی وجہ سے بیحد آرام دہ دکھائی دے رہا تھا، پلنگ کے چاروں طرف سفید لیس والے پردے جھول رہے تھے، ایک کونے میں ایک بڑی ڈریسنگ ٹیبل پر دینا جہاں کا سامان بکھرا پڑا تھا، فرش پر ایک پرانا قالین تھا اور اس پر ایک دہ اور نرم صوفہ سیٹ، کمرے میں مختلف خوشبوؤں میں خوراک کی بھی خوشبو تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنا کھانا پکانا بھی وہیں کرتی ہے، کھڑکی کے ساتھ تپائی پر شراب کی ایک خالی بوتل اور دو گلاس دھرے تھے، ان کے پیچھے ایک بیحد خوبصورت گڑیا پڑی تھی گڑیا کے لبوں پر لپ اسٹک لگی ہوئی تھی۔

جینی نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بستر کی شکنیں، درست کیں، کھڑکی کا پردہ آگے کھینچ دیا اور پھر بھاری صوفے پر رکھے گدے کو تھپتھپا کر وہیں رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

میر ا کمرہ زیادہ آرام دہ نہیں۔ - - - - - - پلیز بیٹھئے- - -

سنان صوفے پر بیٹھ گیا۔

جانے کیوں وہ بیحد نروس محسوس کر رہی تھی، یوں لگتا تھا جیسے اس کے ہاں اس سے پہلے بھی کبھی کوئی مہمان نہ آیا ہو۔

بڑا اچھا کمرہ ہے۔ سنان نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے خوش اخلاقی سے کہا۔

جینی بڑی بے چینی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی، جیسے وہ کمرے کی سجاوٹ سے مطمئن نہ ہو۔

آرام دہ بھی ہے، سنان نے پھر کہا۔

میری آمدن اس سے بہتر کمرے میں رہنے کی اجازت نہیں دیتی، بس گزارا ہے، جینی نے وہیں کھڑے کھڑے کہا اور مسکرانے لگی۔

اوہ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے ایکدم منہ پر یوں، ہتھیلی جمادی جیسے کوئی حادثہ ہو گیا ہو۔

مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں کوئی مشروب پیش نہیں کر سکتی اور پھر قدرے پشیمان ہو کر کہنے لگی تم کہو تم تو تمہارے کمرے سے وہ کافی کا ڈبہ اٹھا لاؤ اور تمہیں کافی بنا دوں ؟؟

سنان نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عجیب لڑکی ہے۔

جینی اسی بے قراری کے عالم میں دوڑتی ہوئی سنان کے کمرے میں سے کافی کا ڈبہ لے آئی اور ڈریسنگ ٹیبل کے نیچے سے ایک اسٹو نکال کر اسے جلا دیا اور کافی کے لئے پانی رکھ دیا۔

علیحدہ باورچی خانے والا کمرہ بے حد مہنگا ملتا ہے۔ جینی نے معذرت بھرے لہجے میں کہا میں اپنا کھانا یہیں اس اسٹو پر ہی بنا لیتی ہوں۔

کافی تیار ہو گئی تو اس نے ایک پیالی سنان کو دی اور خود اس کے پہلو میں ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

وہ اب بے چینی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

وہ خوبصورت دھنیں کیا ہوئیں۔ سنان نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

اوہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں تو بھول گئی تھی، اس نے جلدی سے اٹھ کر پلنگ کے نیچے ایک پرانا ریکارڈ پلئیر گھسیٹ کر باہر نکال لیا میرے پاس جو ستار کا ریکارڈ ہے وہ ایک فرانسیسی موسیقار کا ہے۔

فضا میں پھیلی شب والی دلکش دھن پھر گونجنے لگی۔

جینی نے سنان کو بتایا کہ وہ فرانس کے ساحلی شہر مار سلیز کی رہنے والی ہے، اس کی ماں فرانسیسی تھی اور باپ ایک الجزائری ملاح جواس کی پیدائش کے فوراً بعد ان دونوں کو چھوڑ کر بھاگ گیا تھا، اس کی ماں نے بندرگاہ کے ساتھ ایک شراب خانے میں ویٹرس کی حیثیت سے نوکری کر لی، وہ سارا دن شراب خانے کے ایک کونے میں بیٹھی اپنی ماں کو تکتی رہتی جو گاہکوں کو بھگتانے کے ساتھ ساتھ اس پر بھی نظر رکھتی اور جب بھی فرصت ملتی تو جلدی سے اسے چاکلیٹ یا دودھ کا گلاس تھما دیتی، جینی اس شراب خانے میں جوان ہوئی اور پھر ان پڑھ ہونے کی بنا پر چونکہ اسے اور کہیں نوکری نہیں مل سکتی تو اس نے بھی وہیں کام شروع کر دیا، اس دوران میں اس کی ماں چل بسی اور وہ اپنا مختصر اثاثہ سمیٹ کر ایک نئے مستقبل کی تلاش میں پیرس چلی آئی۔

پیرس میں مجھے نئے مستقبل کے بجائے صرف خوشگوار ماحول کی پیشکشیں ہوئیں رہیں جن کی مدت کبھی بھی دو چار گھنٹے سے بڑھنے نہ پائی جینی کے لہجے میں تلخی تھی، پہلے تو میں نے شریفانہ زندگی گزارنے کی بھر پور کوشش کی لیکن مجھے اس میں بری طرح ناکامی ہوئی اور پھر آخر کار۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ خاموش ہو گئی۔

اور پھر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سنان کے لہجے میں بے پناہ ہمدردی تھی۔

بس پھر کیا۔ ۔ ۔ ۔ میں بھوکی نہیں رہ سکتی، میں اس معاملے میں بیحد کمزور واقع ہوئی ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب تو یہ پیشہ زندگی کا معمول بن چکا ہے، جینی کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی تھی۔

سنان خاموش بیٹھا کافی پیتا رہا اور اس کی باتیں سنتا رہا۔

پاسکل ہی اپاہج نہیں وہ سوچ رہا تھا اس دنیا میں اکثر لوگ اپاہج ہیں۔

معذوری جسمانی نہ بھی ہو تو کبھی مجبوری اور کبھی بھوک ان کو اپاہج کر دیتی ہے۔

پھر جینی نے اپنے بچپن کی باتیں کرنے لگی، کس طرح اس چھٹی کے دن اس کی ماں اسے مارسلیز سے باہر پکنک پر لے جایا کرتی تھی، جنوبی فرانس کا خوشگوار موسم اور چمکیلے دن جو اب ایک خواب ہو کر رہ گئے تھے۔

جینی آہستہ آہستہ باتیں کرتی رہی اور وہ خاموشی سے سنتا رہا اور پھر جینی کی آواز مدھم ہوتی گئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بالکل مدھم۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جانے کب اسے گہری نیند نے آ لیا۔

گوروں کے دیس میں

کراچی سے ہیتھرو تک

یہ صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب چھوٹی کار تیز اور بڑی کار کو آہستہ چلایا جائے بخش کے پاس بڑی کار ہے۔ مگر نہ وہ اسے آہستہ چلاتے ہیں اور نہ تیز چلاتے ہیں بس یہ ہے کہ جب بریک پر پاؤں رکھنا ہو بخش صاحب ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھ دیتے ہیں اور جب پاؤں ایکسیلیٹر پر ہونا چاہئیے اس وقت بخش صاحب کا پاؤں بریک پر ہوتا ہے۔

تاہم بخش صاحب کا کمان فن یہ ہے کہ ان کا آج تک چالان نہیں ہوا جیسے آج تک ہمارے ملک کے صاحبان اقتدار کا کبھی چالان نہیں ہو سکا جو ملک اسی طرح چلاتے ہیں۔ جس طرح بخش لائل پوری کار چلاتے ہیں۔ لندن کی پرانی طرز کی سیاہ عمارتوں اور تنگ گلی کوچوں سے گزرتے ہوئے اب ہم ۳۳۷ میٹر روڈ ویٹ بانسلو کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ گھر مجھے بہت عزیز ہے۔ میں نے گذشتہ برس بھی اس گھر میں دو ہفتے گزارے تھے۔ سویٹی بیٹی، فرحانہ بیٹی، شاہد، شفقت، بھابی شمیم اور مور اوور کے طور پر بخش لائل پوری کی پر خلوص مہمانداری کے طفیل مجھے اپنے گھر سے ہزاروں میل دور یہ گھر اپنا سا لگتا ہے۔

بزرگ خراب نکل آیا

میرے خیال میں یے مثال صحیح نہیں کیونکہ اپنے گھر میں انسان کی اتنی عزت کہاں ہوتی ہے۔ بہر حال ایک بیگ میں نے اٹھایا اور ایک بخش لائل پوری نے اور ہم گھر میں داخل ہو گئے اتفاق سے اس روز شفقت، شاہد فرحانہ، سویٹی اور بھابی گھر پر تھے شفقت اور شاہد بخش کے بڑے بیٹے ہیں صحیح معنوں میں پنجاب کے گھبرو جوان۔ شفقت کی شادی گذشتہ برس فرحانہ سے ہوئی اور اب وہ ایک خوبصورت بیٹی کا باپ ہے۔ چندا بخش کا سب سے چھوٹا بیٹا ہے اور سویٹی لاڈلی بیٹی۔ یہ خاندان برطانیہ میں مقیم ان چند پاکستانی خاندانوں میں سے ہے جو برطانیہ میں تمام تر خوشحالی کے باوجود واپس پاکستان جا کر آباد ہونے کی خواہش رکھتا ہے۔ جو پاکستانی بچے برطانیہ میں پیدا ہوتے اور یہیں پلتے بڑھتے ہیں وہ پاکستان واپس جانے

کا نام تک نہیں لیتے بلکہ ان کے والدین اپنے بچوں کی ضد اور ان کے قانونی حق کی وجہ سے بھی وطن واپس نہیں آ سکتے جبکہ بخش صاحب کے ہاں سلسلہ الٹا ہے۔ ان کے بچے پاکستان میں آباد ہونے کی خواہش رکھتے ہیں مگر والد صاحب پاکستان کے لئے دن رات تڑپنے کے باوجود اس مرحلے پر واپس جانے کے حق میں نہیں یعنی بعض لوگوں کی اولاد خراب نکل آتی ہے یہاں بزرگ خراب نکل آیا ہے۔ تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئیے افراد خانہ کے پر جوش استقبال سے مجھے محسوس ہوا کہ گذشتہ ایک برس کے دوران ان کی مشرقی اخلاقیات کمزور نہیں۔ مضبوط ہوئی ہیں بچون نے میرا سامان میرے کمرے میں پنچا یا اور میں چائے کی گرم چسکیاں لیتے ہوئے گپ شب میں مشغول ہو گیا۔ بخش کا گھر بھی اپنی تعمیر کے حوالے سے برطانیہ کے روٹین گھروں جیسا ہے یعنی گھروں میں داخل ہوتے ہی پاؤں اوپر کی منزل پر جانے والی سیڑھیوں پر پڑتا ہے جو کم جگہ میں بنائی گئی ہوتی ہیں اور ان پر چڑھنا اور اترنا کسی موٹے انسان کے بس کا روگ نہیں۔ اوپر دو چھوٹے چھوٹے کمرے ایک گیٹ روم جس میں ایک گیسٹ اور اس کی چارپائی آ سکتی ہے۔ درمیان میں باتھ روم جس میں موجود ٹب کے گرد کرٹن نہیں ہوتا کیونکہ برطانیہ میں نہانے کا نہیں اشنان کرنے کا رواج ہے۔ ایک بیسن جس میں گرم اور ٹھنڈے پانی کی ٹوٹیاں الگ الگ ہوتی ہیں مگر مکسر نہیں ہوتا ٹھنڈا اور گرم پانی بیسن میں جمع کر کے منہ پر پانی کے چھٹے مارے جاتے ہیں۔ باتھ روم کے ساتھ ایک چھوٹا ٹائلٹ جس کے تنگی دامان کی وجہ سے کئی قسم کی تنگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس میں داخل ہونے اور نکلنے کی پریکٹس ضروری ہے۔ گراؤنڈ فلور پر ایک ڈرائنگ روم، ٹی وی لاؤنج اور کچن گھر کے پچھواڑے میں ایک لان برابر والے کمرے کے لان سے اسے علیحدہ کرنے کے لئے لکڑی کی چھوٹے قد کی باڑ جس کے اور پار دیکھا جا سکتا ہے۔ گرمیوں میں میمیں ادھورے کپڑوں میں باہر آ کر لیٹ جاتی ہیں اور ان کے پاکستانی ہمسائے پورے کپڑے پہنے کالی عینک لگائے دھوپ سینکنے اپنے لان میں آن کھڑے ہوتے ہیں۔
تقریب کچھ تو بہر حال ملاقات چاہئیے۔ بخش لائل پوری عمر میں مجھ سے پندرہ سال بڑے ہیں۔ مگر ان سے بے تکلفی کا رشتہ ہے میں بھابی اور بچوں سے گپ شپ کے بعد ڈرائنگ روم میں قالین پر آ کر لیٹ گیا۔ بخش صوفے پر بیٹھے کاغذ میں تمباکو بھر بھر کر اپنے ہوم میڈ سگریٹ پیتے رہے جنہیں تھوڑی تھوڑی دیر بعد انہیں دوبارہ جلانا پڑتا۔

انقلابی شاعری۔۔۔۔ اور شاعری

بخش انجمن ترقی پسند مصنفین برطانیہ کے صدر ہیں،بعض ترقی پسندوں کے دو غلے کردار پر بڑے جارحانہ انداز میں تنقید کرتے ہیں انہیں اپنی زبان پر قابو نہیں ہے۔ جب تک دل کی بات مخاطب کے منہ پر نہ کہہ لیں اتنی دیر بے چین سے پھرتے ہیں۔ اس کے بعد ان کا مخاطب مہینوں بے چین رہتا ہے۔ آج کل کے ماسکو برانڈ پاکستانی ترقی

پسندوں کے بر عکس پاکستان سے والہانہ محبت رکھتے ہیں اور اس ضمن میں کسی قسم کے کمپرومائز کے قائل نہیں غزل اور نظم کے بہت خوبصورت شاعر ہیں اور ابھی تک ان کے تین مجموعے لہو کا خراج، زندان شب اور باد شمال شاعری پر مشتمل ہیں۔ بخش رات کو ایک پلیٹ سلاد اور بھنا ہوا گوشت کھاتے ہیں اس وقت وہ ڈنر میں مشغول تھے جبکہ بھابی نے کھانے کے ضمن میں خصوصی اہتمام کیا تھا۔ ہمدم دیرینہ کھانے کے بعد میں نے اپنے عزیز دوست اعجاز احمد اعجاز کو فون کیا مگر وہ گھر پر نہیں تھا۔ اعجاز کے والدین ۱۹۳۰میں ترک وطن کر کے متحد ہندوستان سے یوگنڈا چلے گئے تھے۔ ۱۹۶۲میں اس کے والد نے اسے تعلیم کے حصول کے لئے پاکستان بھیجا جہاں اس نے لاہور کے ایم اے او کالج میں داخلہ لیا جہاں میں زیر تعلیم تھا۔ اعجاز سے دوستی کا آغاز وہیں سے ہوا وہ تعلیم حاصل کر کے واپس یوگنڈا چلا گیا بعد میں جب عیدی امین نے غیر ملکیوں کو یوگنڈا سے نکالا تو اعجاز اپنے خاندان کے ساتھ برطانیہ میں سکونت پذیر ہو گیا۔ اب تیس برس سے یہیں مقیم ہے بے پناہ پر خلوص انسان دوستوں پر جان چھڑکتا ہے، قانونی طور پر پاکستان سے کبھی کوئی رشتہ نہیں رہا لیکن کٹر پاکستانی اور شدید جذباتی مسلمان ہے۔ اعجاز کے شوق بڑے متنوع ہیں شاعری کرتا ہے مشاعروں میں شاعروں پر ہوٹنگ کرتا ہے فلسفے اور جدید علوم کی کتابیں پڑھتا ہے دوستوں کی محفلیں جماتا ہے۔ اسپورٹس میں حصہ لیتا ہے۔ گذشتہ دنوں اس نے برطانیہ میں ہونے والی سب سے لمبی ریس یعنی چھتیس میل دوڑ میں حصہ لیا پاک باز ہے پانی کے علاوہ کچھ نہیں پیتا اور بیوی کے علاوہ کسی کو کچھ نہیں سمجھتا یے شخص ترقی نہیں کر سکتا ترقی کرنے والوں کے لچھن کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔ آزادیاں سلب کرنے والے رشتے میں نے گھڑی دیکھی تو اس وقت رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے مگر سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا خدا کا شکر ہے لیٹ سہی مگر اب سورج یہاں غروب تو ہو جاتا ہے جب کہ ایک وقت تھا سلطنت برطانیہ پر سورج غروب ہی نہیں ہوتا تھا۔ سفر کی تھکن اب مجھ پر غالب آ رہی تھی حتی کہ نیند کی وجہ سے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ میں نے بخش سے اجازت لی اور اپنے کمرے میں جا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ میں اپنے گھر سے کتنی دور ہوں گھر میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ یہ سوچ کر نیند مجھ سے دور ہوتی چلی گئی میں سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا بخش ہوم میڈ سگریٹ کے سوتے لگا رہے تھے۔ کیا بات ہے سوئے نہیں ہمارے گھر کے قریب ایئر پورٹ ہے جہازوں کے شور نے تو نہیں جگا دیا؟ بخش نے پوچھا۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں میں پچھلے سال بھی ان جہازوں کو بھگتا ہوں لگتا ہے کم بخت پائلٹ جہاز میرے کمرے میں لینڈ کرانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تو پھر کیا مسئلہ ہے بس گھر والوں کا خیال آ گیا تھا۔ میں وطن سے بہت دور ہوں گھر میں کوئی مسئلہ نہ ہو۔

گذشتہ چند برسوں کے دوران کچھ اتنے سفر کیے ہیں کہ اب مسافر تخلص رکھنے کو جی چاہتا ہے۔ حالیہ سفر ۲۴مئی ۱۹۸۹ء کو شروع ہوا۔ میں، امجد اسلام امجد، خالد احمد اور حسن رضوی برطانیہ میں انجمن ترقی اردو برمنگھم کے مشاعروں میں شرکت کے لئے پاکستان سے روانہ ہوئے۔ انجمن ترقی اردو کا نام میں نے محض اردو کی ترقی کی نیت سے لیا ہے ورنہ یہ سارا کیا دھرا ڈاکٹر صفی حسن کا تھا۔ جس کا شمار برطانیہ میں مقیم ممتاز سائنس دانوں میں ہوتا ہے اور جو اپنی سائنس دانیاں

دکھانے کے ساتھ ساتھ خوبصورت غزلیں بھی کہتے ہیں۔ کچھ ہم سفروں کے بارے میں امجد اسلام امجد بہت دور اندیش انسان ہے۔ وہ ہماری بھابی یعنی بیگم فردوس امجد کے ساتھ پی آئی اے کے جمبو جیٹ میں نان اسموکنگ گوشے بلکہ گوشہ عافیت میں جا بیٹھا تاکہ لندن تک کے سفر کے دوران کم از کم نو گھنٹے میرے اور خالد احمد کے شر سے محفوظ رہے جن کی بدولت سگریٹ ساز ادارے یہ منافع بخش کاروبار چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ تاہم چند گھنٹوں کے سفر کے دوران خالد احمد کو دیوانہ وار سگریٹ پیتے دیکھ کر مجھے اپنی کوتاہ دامنی کا شدت سے احساس ہوا دھواں خالد احمد کے صرف منہ سے خارج نہیں ہوتا تھا بلکہ لگتا تھا اس کا پورا جسم چمنی بنا ہوا ہے۔ لندن میں تو اعجاز احمد اعجاز کمرے میں میں دھواں بھرا دیکھ کر گھبراہٹ کے عالم میں فائر بریگیڈکا نمبر ڈائل کرنے لگ گیا تھا۔ یہاں جہاز میں بھی ایئر ہوسٹس پانی کا جگ ہاتھ میں لئے احتیاطا خالد احمد کے گرد و نواح میں گھومتی رہتی ہے کراچی سے لندن تک کے سفر کے دوران خالد نے مسلسل سگریٹ نوشی کا عالمی ریکارڈ قائم کیا اور مجھے یقین ہے کہ اس کا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل ہو گیا ہو گا۔ خالد احمد نے لندن سے واپسی تک کے سفر کے دوران ایک ریکارڈ اور قائم کیا اور یہ زیادہ سے زیادہ وقت باتھ روم میں گزارنے کا تھا۔ اس نے اتنا وقت لندن میں نہیں گزار ا جتنا لندن کے باتھ روموں میں گزارا۔ پیرس میں خالی پلاٹ حسن رضوی سارے سفر کے دوران جہاز کے ذرا سے ہچکولے سے پریشان ہوتا رہا یا کان سے ہیڈ فون لگا کر غلام فرید صابری کی قوالیاں سنتا رہا۔ اس کی اس حرکت سے کوفت ہونے لگتی تو میں اسے یقین دلاتا کہ جہاز کے حالات مخدوش ہیں۔ اس پر اس کا رنگ زرد ہو جاتا۔ وہ کان سے ہیڈ فون اتارتا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتا تا کہ وہ بچشم خود مقامات آہ و فغاں کا مشاہدہ کر سکے۔ خالد احمد اور حسن رضوی کے بارے میں بتانے کی ابھی اور بھی کچھ باتیں ہیں لیکن میں کراچی سے لندن تک کا یہ سفر جلد از جلد طے کرنا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے یاد ہے میرے ایک دوست نے لاہور سے اسلام آباد تک کا سفر نامہ ساڑھے تین سو صفحات میں مکمل کیا تھا جن میں سے پہلے پونے دو سو صفحات میں وہ اپنے گھر سے نکل کر صرف لاہور ایئر پورٹ تک پہچا تھا۔ کراچی سے لندن تک کے سفر کے دوران میرا پہلا اسٹاپ پیرس ہے۔ مگر میں یہاں بھی آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا یہاں مجھے آپ کو صرف دو مکالمے سنانا ہیں۔ پہلا مکالمہ پی آئی اے کا جمبو جیٹ پیرس کے ایئر پورٹ پر لینڈ کرنے کے لئے شہر کے اوپر نیچی پرواز کر رہا ہے۔ حسن کھڑکی میں سے جھانکتا ہے کچھ سوچ بھی رہا ہے۔

میں : کیا سوچ رہے ہو؟

حسن : کچھ نہیں۔

میں:پھر بھی بتہ تو چلے آخر کیا سوچ رہے ہو؟

حسن:دراصل کچھ خالی پلاٹ نظر آ رہے ہیں سوچ رہا ہوں کیسے الاٹ کرائے جا سکتے ہیں۔ دوسرا مکالمہ پیرس ایئر پورٹ کے لاؤنج میں پاکستان کے ممتاز باؤلر عبدالقادر اپنے مداحوں کے درمیان گھرے ہیں۔ مداح ان سے اپنی محبت اور عقیدت کا

اظہار کر رہے ہیں اتنے میں خالد مسعود احمد دونوں ہاتھوں سے اپنی پتلون سنبھالتے ہوئے تیز تیز قدم اٹھاتا ان کی طرف بڑھتا ہے۔

خالد: اگر میں آپ کو پہچاننے میں غلطی نہیں کر رہا تو آپ عبدالقادر ہیں

عبدالقادر : جی آپ کا خیال صحیح ہے۔

خالد : تو پھر میرا مسئلہ حل ہو گیا۔ آپ اکثر پیرس میں آتے رہتے ہیں۔ آپ کو تو پتہ ہو گا یہاں ٹائلٹ کدھر ہے۔ پلیز ذرا جلدی بتائیے۔ لندن کے ہیتھرو ایئر پورٹ پر امگریشن کے سامنے مسافروں کی طویل قطاریں لگی تھیں۔ گذشتہ دو برسوں میں میں چوتھی دفعہ لندن آیا ہوں ایک دفعہ نومبر ۸۷ء میں امریکہ جاتے ہوئے دوسری دفعہ جنوری ۸۸ء میں امریکہ سے واپسی پر، تیسری دفعہ اگست ۱۹۸۸ء میں اور اب مئی ۱۹۸۹ء میں۔ چنانچہ انگریز کا رعب میرے دل سے ختم ہو چکا ہے بلکہ اس عرصے میں انگریز میری انگریزی سن سن کر مجھ سے خوف زدہ اور انگریزی کے مستقبل کے بارے میں متفکر رہنے لگے ہیں۔ میں نے اپن وزنی بینڈ بیگ اپنے پاؤں میں رکھا ہوا تھا ۔ جب قطار ذرا سی کھسکتی تو میں بیگ کر پاؤں سے آگے گھسیٹ دیتا۔ میرے سامنے والی قطار میں ایک گورا تھا۔ جس سے ذرا پرے ایک گوری قطار میں کھڑی تھی۔ گورے نے اپنے بیگ میں سے ایک غبارہ نما گیند نکالا جس میں منہ سے ہوا بھرنے کے بعد گورا اور گوری اسے والی بال کے طور پر استعمال کرنے لگے۔ ہمارے سامان میں قرشی کا جوشاندہ بھی ہو تو ہم یوں خوف زدہ ہوتے ہیں جیسے ہیروئن لے جا رہے ہیں اور یہ لوگ ہیروئن بھی لے جا رہے ہوں تو اتنے خوشگوار موڈ میں نظر آتے ہیں جیسے جوشاندہ لے جا رہے ہیں۔ ہمیں قطار میں کھڑے کافی دیر ہو گئی تھی۔ کیونکہ امگریشن افسر ہر ایک سے مختصر انٹرویو کے بعد پاسپورٹ پر انٹری کی مہر لگا رہا تھا۔ کسی ایک جگہ پر زیادہ کھڑے رہنے سے میری کمر کا معمول کا درد خاصا تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ اور اس وقت میں اسی کیفیت میں مبتلا تھا، اب امجد اسلام امگریشن آفیسر کو انٹرویو دے رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ انسان اپنے وطن سے باہر کس طرح اہم سے غیر اہم ہو جاتا ہے۔ اس گورے کے فرشتوں کو بھی اس امر کی خبر یا پروا نہیں کہ وہ جس شخص کا انٹرویو لے رہا ہے وہ اپنے ملک کا ایک مشہور آدمی ہے۔ ورنہ وہ روٹین کی کاروائی مکمل کرنے کے باوجود کرٹسی کے اظہار کے طور پر دو تین جملے بول دیتا جن سے اپنے ملک میں سفر کے دوران تھکن دور ہو جاتی ہے اور راتوں کو دیر تک جاگ کر اپنے لوگوں کے لئے ادب تخلیق کنے کا اجر اپنے لوگوں کی ایک محبت بھری نظر سے وصول ہو جاتا ہے۔

محترمہ میں شاعر ہوں امجد اور بھابی امگریشن سے فارغ ہو کر ہمارے انتظار میں کاؤنٹر کی دوسری طرف کھڑے ہو گئے۔ اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی۔ میرا انٹرویو ایک گوری لے رہی ہے۔ مگر اس کا انداز انٹرویو کا نہیں ایک دیرینہ دوست سے گپ شپ کا ہے۔

ہیلو

ھے۔ ۔ ۔ لو۔ ۔ ۔ ہاؤ اور یو؟

فائن

کدھر کے ارادے میں ہیں ؟

بس آپ کے ملک میں مشاعرے پڑھنے آیا ہوں

یہ مشاعرہ کیا ہوتا ہے ؟

شاعر اسٹیج پر کھڑے ہو کر اپنا کلام سناتا ہے اور کچھ لوگ واہ واہ کرتے ہیں

اوہ تو تم واہ واہ کے لئے آئے ہو

محترمہ میں شاعر ہوں۔

آئی ایم سوری۔ کہاں کہاں جانے کا ارادہ ہے ؟

ایک مشاعرہ برمنگھم میں ہے۔ ایک بریڈ فورڈ میں، ایک لندن میں ایک مانچسٹر میں ایک۔ ۔ ۔ بس بس اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے۔ اور وہ پاسپورٹ پر چھ ماہ قیام کی مہر لگا کر میرے حوالے کر دیتی ہے۔

اب خالد اور حسن پیچھے رہ گئے ہیں۔ خالد امگریشن افسر کے روبرو کھڑا ہے۔ اس کے چہرے پر خوش اخلاقی ہی خوش اخلاقی نظر آ رہی ہے۔ چہرے پر ایک مسکراہٹ ہے جس کے وسیع و عریض حدود ارے نے دونوں ماچھو ں کا فاصلہ دلوں کے فاصلے جتنا بڑھا دیا ہے۔ خالد کی خلاصی جلد ہو جاتی ہے اور پھر حسن کی بھی اب ہم سامان والے حصے میں جاتے ہیں اور اپنا سامان ٹرالی میں ڈال کر کسٹمز والوں کو چیک کروائے بغیر گرین چینل سے باہر نکل جاتے ہیں کہ ہم درویشوں کے پاس چیک کرانے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ لہذا ہمارا رستہ نہ روکا جائے۔

باہر ہال میں پہنچ کر میں نے ریلنگ کی طرف ایک نظر دوڑائی جس کی دوسری طرف لوگ اپنے عزیز و اقربا کے استقبال کے لئے آئے ہوئے تھے، ناگاہ میری نظر بخش لائل پوری پر پڑی ان کے ساتھی ڈاکٹر صفی حسن، عاشور کاظمی اور باقر نقوی کھڑے تھے۔ بخش لائل پوری، عمر ساٹھ کے قریب، چہرے پر عینک، بالوں میں خضاب، اردو بولتے ہیں تو پنجابی لگتے ہیں۔ پنجابی بولتے ہیں تو بہت پنجابی لگتے ہیں۔ تو لاہور میں ان کا قیام مشکوک سا ہو جاتا ہے۔ باقر نقوی، چینی خد و خال، چہرے پر عینک عمر پچاس کے لگ بھگ، ابھی ان دوستوں کی صرف شناخت پریڈ کرائی ہے ان کی صفات کا بیان بعد میں آئے گا۔ بخش لائل پوری کے ساتھ ان کا چھ سات سال کا پیارا سا بیٹا چندا بھی تھا۔ جو مجھ سے بہت مانوس ہے۔ میں نے اسے گود میں لے کر پیار کیا اور پھر ہم مختلف گاڑیوں میں بیٹھ کر باقر نقوی کے گھر روانہ ہو گئے جہاں تازہ دم ہو کر میں، بخش لائل پوری کے ساتھ اور حسن عاشور کاظمی کے ساتھ

ان کے گھروں میں قیام کے لئے چل پڑے صفی حسن کا قیام برمنگھم میں ہے، وہ خالد کو اپنے ساتھ برمنگھم لے جاتا ہے۔ اور ہاں میں یہ تو بتانا ہی بھول گیا کہ امجد کا دوست مکرم اسے لینے کے لئے آیا ہوا تھا چنانچہ وہ اور بھابی مکرم کی میزبانی میں آ جاتے ہیں کراچ سے لندن تک یہ ہمارا پہلا پڑاؤ تھا۔ سفر تو اس کے بعد شروع ہوتا ہے۔

اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو

میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

چنانچہ انگلینڈ کے مختلف شہروں کے علاوہ فرانس، جرمنی،بلجیم، ہالینڈ، سویڈن ڈنمارک اور ناروے کے احوال سننے کے لئے تیار رہئے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس میں پردہ نشینوں کے نام نہیں آ سکیں گے۔ کیونکہ ان ملکوں میں پردہ تو کجا پردہ داری کا رواج بھی نہیں ہے۔

ایئر پورٹ سے گھر تک بخش لائل پوری نے کار خود ڈرائیو کی۔ بخش صاحب جب کار چلا رہے ہوں تو یہ بھی ان کی طرح جھومتی جھامتی چلتی ہے جیسے گانا بھی گار ہی ہو۔

یارو مجھے معاف کرو میں نشے میں ہوں

اگلا دن میں نے صرف اپنے لندن کے گلی کوچوں کے لئے مخصوص رکھا ہوا تھا چنانچہ میں ناشتے کے بعد گھر سے نکلا اور اسٹینز روڈ سے بانسلو ویسٹ کے ٹیوب اسٹیشن کی طرف پیدل چل پڑا۔ آج سورج نکلا ہوا تھا چنانچہ انگریز جامے سے باہر ہو رہے تھے مردوں نے ہمارے بھائی گیٹ کے پہلوانوں کی طرح قمیض اتار کر کاندھوں اور ڈالی ہوئی تھی اور عورت حسب توفیق موسم کا لطف لے رہی تھی۔ اتنے خوبصورت چہرے اور صحت مند جسم مگر ایک ایسے نظام کے شکنجے میں کسے ہوئے جس نے آغاز میں مشینوں کو انسان کا تابع بنایا۔ لیکن اب یہ مشینیں انسان کو موبل آئل کے طور پر استعمال کر رہی ہیں۔ جس طرح قربانی کے جانور کا صحت مند ہونا ضروری ہے اسی طرح سرمایہ داری نظام میں انسانوں کا صحت مند ہونا ضروری ہے تاکہ مشین کی کالی دیوی ان کی قربانی قبول کر سکے۔ بانسلو ویسٹ کا ٹیوب اسٹیشن ہمارے ہاں کے قصباتی اسٹیشنوں کی طرح ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی دائیں طرف کتابوں کی دکان پر ایک انڈین لڑکی کاؤنٹر کے دوسری طرف کھڑی تھی جو مردوں کو دیکھ کر یہاں بھی فوری طور پر دفاعی پوزیشن اختیار کر لیتی تھی۔

سینیٹر سٹیزن بائیں جانب ٹکٹ کی مشین، جس میں پیسے ڈال کر ٹکٹ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ چینج حاصل کرنے والی مشین، پاؤنڈ ڈالیں اور چینج حاصل کریں۔ ایک کونے میں ٹیلی فون پلیٹ فارم تک پہنچنے کے لئے سیڑھیاں اترنے سے پہلے بائیں ہاتھ پر ٹکٹ بابو جو ٹکٹ چیک بھی کرتا ہے اور مشین خراب ہو تو ٹکٹ دیتا بھی ہے۔ اس وقت رش کے اوقات ختم ہو چکے تھے چنانچہ پلیٹ فارم پر پہنچا تو

وہاں ہو کا سماں تھا۔ ابھی مجھے یہاں کھڑے ہوئے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ خوبصورت آہنگ کے ساتھ انڈر گراؤنڈ ٹرین ایک نئی نویلی دلہن کی طرح بنی ٹھنی پلیٹ فارم پر آ کر رک گئی۔ ٹرین کے آٹو میٹک دروازے خود بخود کھل گئے اور میں روشن روشن اجلی اجلی ٹرین میں داخل ہو گیا۔ چند لمحو ں میں دروازہ دوبارہ بند ہو گیا اور ٹرین نے چلنے کے فوراً ساتھ تیز اسپیڈ پکڑ لی خلاف توقع ٹرین میں ساری سیٹیں پر تھیں۔ بلکہ چند مسافر کھڑے بھی تھے۔ میں بھی چھت کے ساتھی پلاسٹک کی مٹھ پکڑ کر چمگادڑ کی طرح لٹک گیا۔ انگریز کو مطالعے کا بہت شوق ہے چنانچہ تمام خواتین و حضرات ایک دوسرے سے بے نیاز اخبار کے مطالعے میں مشغول تھے یا کوئی انعامی معمہ حل کر رہے تھے اس کے ساتھ یہ اونگھ بھی رہے تھے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ یہ صرف ایک دوسرے سے بات نہ کرنے کا بہانہ ہے کیونکہ ان سے گفتگو کریں تو اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ لوگ کتاب تو کیا اخبار بھی پڑھتے ہوں گے۔
میرے سامنے والی سیٹ پر ایک بوڑھی میم بیٹھی تھی اس نے اپنے پاؤں میں سودا سلف کین کی بنی ہوئی ٹوکری رکھی ہوئی تھی اور وہ اپنے ساتھی والے مسافر سے مسلسل گفتگو کرتی جا رہی تھی جو اس کی طرف دیکھے بغیر مسلسل اخبار کے مطالعے میں مشغول تھا۔ وہ مسافر اگلے اسٹیشن پر اتر گیا تو بوڑھی میم نے نئے مسافر کے ساتھ بے ربط قسم کی گفتگو شروع کر دی جس پر اس نے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ یورپ اور امریکہ میں بوڑھوں کو سینئر شہری کہا جاتا ہے اور ریاست انہیں زندگی کی تمام سہولتیں فراہم کرتی ہے صرف اتنا ہے کہ ان بوڑھوں سے کوئی بات نہیں کرتا۔

میرا نام ولیم ہے

انڈر گراؤنڈ ٹرین کبھی سرنگ میں داخل ہو جاتی اور کبھی کھلی فضاؤں میں فراٹے بھرنے لگتی دونوں طرف سرخ ڈھلوان چھتوں اور سفید رنگ میں کھڑکیوں والے مکان تیزی سے گزرتے چلے جاتے ایک اسٹیشن پر ٹرین رکی تو دو نشستیں خالی ہوئیں جن پر ایک بوڑھا انگریز اور اس کا گیارہ سالہ بچہ بیٹھ گئے اچانک انگریز کی نظر مجھ پر پڑی اس نے بچے سے کہا وہ میرے لئے نشست خالی کر دے۔ بچہ پوری سعادت مندی سے اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا اور انگریز نے پورے اصرار کے ساتھ مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ میرا نام عطا ہے۔ تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ کہاں کے ہو؟
اس نے ناک میں انگلی پھیرتے ہوئے پوچھا۔ پاکستانی ہوں۔

یہاں کام کرتے ہو؟

نہیں لوگوں کو دن رات کام کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔

اس پر ولیم نے قہقہہ لگایا۔ یہ تم نے میرے دل کی بات کہی یہ لوگ کریڈٹ کارڈوں کے قرضے اتارنے کے لئے گدھوں کی طرح کام کرتے ہیں یہ بھولتے جا رہے ہیں کہ انہوں نے انسانوں کے ہاں جنم لیا ہے۔ مجھے ایک بات تو بتاؤ پوچھو۔

میں مغربی ممالک میں آتا جاتا رہتا ہوں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ کسی نے کسی دوسرے کے لئے سیٹ خالی کی ہے۔ ولیم اپنی انگلی اپنی ناک کی طرف لے گیا اور سنجیدگی سے بولا یہ میں نے تم لوگوں سے سیکھا ہے۔

کیا مطلب ؟

میں پاکستان میں رہا ہوں۔ اس نے ایک دفعہ پھر ناک میں انگلی پھیری، مجھے یقین ہو گیا کہ یہ واقعی پاکستان میں رہا ہے اور اس نے وہاں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ مگر تمہارا یہ بیٹا تو پاکستان میں نہیں رہا۔ اس نے کیسے چپ چاپ تمہاری بات مانتے ہوئے میرے لئے سیٹ خالی کر دی۔

بابا مراد سے ملاقات

یہ میرا بیٹا نہیں پوتا ہے۔ میرا بیٹا، میری بہو، میرے پوتے پوتیاں ہم سب ایک گھر میں رہتے ہیں۔ میں نے ان کی تربیت اپنے ذمے لی ہوئی ہے۔ تمہیں ایک اور بات بتاؤں ؟ ولیم نے کہا میرا چھوٹا سا کاروبار ہے۔ میرا بیٹا ایک جگہ ملازمت کرتا ہے۔ میری بہو گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ ہمارے گھر میں کریڈٹ کارڈز کا داخلہ منع ہے۔ ٹیلی ویزن پر مصنوعات کی کمرشلز آتی ہیں تو میں اپنے بچوں کو کہتا ہوں اپنی آنکھیں بند کر لو ورنہ یہ خوبصورت چیزیں تمہیں بد صورت بنا دیں گی۔ زندگی کو آرام دہ بنانے کے لئے زندگی کو عذاب نہ بناؤ۔ یہ میرا کارڈز ہے وقت ملے تو ضرور آنا۔ مجھے تم لوگ اچھے لگتے ہو۔ اس کا اسٹیشن قریب آ گیا تھا۔ وہ دروازے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور پھر ناک میں انگلی پھیرتا ہوا ٹرین سے اتر گیا۔ مجھے لگا جیسے میری ملاقات وزیر آباد کے بابا مراد سے ہوئی ہے۔ جس نے لندن میں اپنا نام ولیم رکھا ہوا ہے۔

جنس کا ہیضہ زیر زمین ٹرین ہسلو ویسٹ سے ہسلو سنٹرل، ہسلو ایسٹ، اوسٹر لے، بوسٹن میز، ناتھ فیلڈز، ساؤتھ ایلنگ، ایکشن ٹاؤن، ہیمر اسمتھ، بیرنز کورٹ، ارلز کورٹ اور ساؤتھ کنگسٹن کے گلی کوچوں میں مسافروں کو اتارتی ٹائٹس بریج پر رکی تھی، یہاں سے ایک ماں اپنے ایک اللہ لوک قسم کے بیٹے کے ساتھ ٹرین میں سوار ہوئی۔ نوجوان کی عمر چوبیس کے لگ بھگ تھی۔ اس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی۔ جسے اس کی ماں ٹشو پیپر سے بار بار صاف کرتی، وہ ہمارے ہاں کے دولے شاہ کے چوہوں ایسا تھا مگر اپنی ماں کے لئے چاند کے ٹکڑے کی طرح تھا۔ ماں پاکستان کی ہو یا انگلینڈ کی،اپنے بچوں کے لئے اس کی مامتا یکساں ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے

کہ پاکستان میں بچے بھی عموماً اپنے والدین کی خدمت اور دیکھ بھال کرتے ہیں جب کہ مغرب میں بچے اپنے والدین سے غافل رہتے ہیں۔ والدین بوڑھے ہو جائیں تو یہ بچے انہیں اولڈ پیپل ہومز میں جمع کر وا دیتے ہیں اور رسید حاصل کر لیتے ہیں تا کہ سند رہے اور بوقت ضرور کام آئے۔

ٹائٹس بریج کے بعد زیر امین ٹرین ہائیڈ پارک کارنر اور گرین پارک پر رکی اور اب پکاڈلی سرکس کا اسٹیشن قریب آ رہا تھا۔ میں اپنی نشست سے اٹھا اور گیٹ کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ ٹرین ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ رک گئی اس کے دروازے کھلے اور میں آہستگی سے پلیٹ فارم پر اتر گیا۔

میمیں کہاں ہیں ؟

زیر زمین ٹرین یعنی ٹیوب میں سفر کرتے ہوئے یہ احساس نہیں ہوتا کہ ہم واقعی زیر زمین سفر کر رہے ہیں کیونکہ یہ ٹرین دوران سفر زمین میں سے نکل کر کھلی فضا بھی آ جاتی ہے مگر پکاڈلی سرکس کے پلیٹ فارم سے اوپر سڑک پر آنے کے لئے جتنی برقی سیڑھیاں طے کرنا پڑتی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہزاروں مسافر کتنے گہرے غار میں سفر کر رہے ہوتے ہیں۔ پکاڈلی سرکس لندن کا مصروف ترین مرکزی علاقہ ہے اور اس کے پلیٹ فارم پر بھی گہما گہمی نظر آتی ہے۔ حالانکہ یہ رش کے اوقات نہ تھے۔ لیکن اس وقت بھی کھوے سے کھوا چل رہا تھا۔ سکرٹ، جین، ہاٹ پینٹ اور دوسرے ملبوسات یا غیر ملبوسات سے خود کو آراستہ کئے ہوئے میمیں زلفیں کاندھوں پر لہراتے اور اونچی ہیل کی جوتی سے ٹک ٹک کی آواز پیدا کرتی ہوئی تیزی سے برقی سیڑھیوں کی طرف لپک رہی تھیں۔

یہ وہی میمیں ہیں جو پورب کا سفر اختیار کرنے والے بیشتر مسافروں کے اعصاب پر سوار ہوتی ہیں بلکہ ایک پاکستانی دوست کے متعلق تو شنید ہے کہ جب دوران سفر اس کے ہم سفر نے اسے بتایا کہ ہمارا جہاز لندن ایئر پورٹ پر اترنے والا ہے تو اس نے پوری وارفتگی سے کھڑکی میں سے نیچے جھانکا اور بے تابی سے کہا لندن آگیا ہے۔ تو پھر میمیں کہا ں ہیں ؟ اس وقت یہی میمیں اپنے آپ سے بیزار، کسی کام کو نمٹانے کے لئے اپنی منزل مقصود کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔ یہی حال مردوں کا بھی تھا۔ لگتا تھا ہر کوئی کسی لمبی پسوڑی میں پڑا ہوا ہے برقی سیڑھیوں کے پاس تین چار نوجوان گٹار پر گانا گا رہے تھے۔

یہ وہی گانا تھا جس کے متعلق ایک فلمی شاعر نے کہا ہے ٹین کنستر پیٹ پیٹ کر گلا پھاڑ کر چلانا یار میرے مت برا مان یہ گانا ہے نہ بجانا ہے ان میں سے ایک نوجوان اپنا ہیٹ راہ گیروں کے آگے پھیلائے کھڑا تھا، لوگ اس میں سکے ڈالتے تھے۔ کچھ بے پروائی سے فرش پر پھینک کر آگے نکل جاتے تھے۔ یہ برطانیہ کی بھکاری نسل

تھی جس کے آبا و اجداد تاجروں کے روپ میں ہندوستان آئے اور پھر پورے بر صغیر پر قابض ہو گئے۔

دوسری جنگ عظیم اور بعض دوسرے عوامل کے نتیجے میں جب ان کی تمام نو آبادیاں ایک ایک کر کے ان کے ہاتھ سے نکل گئیں جہاں سے لوٹ کھسوٹ کر کے وہ اپنے ہاں خوشحالی لاتے تھے تو ان پر تنگ دستی کا دور ٹیا۔ جس کی شدت میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے چنانچہ اس فلاحی مملکت کے باشندوں سے بہت ہی مراعات حکومت ایک ایک کر کے واپس لے رہی ہے۔ یہ بھکاری نسل برطانیہ کی معاشی بد حالی کے علاوہ ذاتی ہڈ حرامی کی پیداوار بھی ہے۔

اصولوں پر سمجھوتہ نہیں ہو سکتا

دو برس بیشتر امریکہ کے چھ ہفتے کے دورے کے دوران ڈینور شہر میں اپنے ہوٹل سے کھانا کھا کر چہل قدمی کے لئے نکلا تو ایک سفید فام امریکی نے میرے آگے ہاتھ پھیلا دیئے۔ میں نے جیب میں سے ایک ڈالر نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا اور کہا کل اسی وقت اسی جگہ پر پھر ملنا ایک ڈالر اور دوں گا۔ چنانچہ دوسرے روز مقررہ وقت پر وہ نوجوان گدا گر اسی جگہ کھڑا تھا۔ میں نے اسے ایک ڈالر اور دیا اور کہا کل پھر اسی جگہ اسی وقت ملنا ایک ڈالر اور دوں گا۔ نوجوان ٹھیک وقت پر وہاں موجود تھا۔ میں نے ایک ڈالر اس کی ہتھیلی پر رکھا اور کہا،کل اسی وقت اسی جگہ۔ ۔ مگر یہ فقرہ مکمل ہونے سے پہلے اس نے چیخ کر کہا کیوں۔ تم مجھے کیوں روزانہ بلا کر ایک ڈالر دیتے ہو ؟ میں نے نرمی سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے کافی پینے کی دعوت دی۔ جس پر وہ چپ چاپ سر جھکائے میرے ساتھ ایک کافی شاپ میں داخل ہو گیا۔ میں نے کاؤنٹر سے کافی کے دو کپ خریدے اور میز پر آ کر بیٹھ گیا۔ تم جاننا چاہتے ہو کہ میں روزانہ ایک ڈالر کیوں دیتا ہوں ؟ ہاں مجھے لگتا ہے تم مجھے ذلیل کرنا چاہتے ہو۔ نہیں میرے عزیز میں تمہیں ذلیل نہیں کرنا چاہتا بلکہ اپنی ذلت میں کمی کرنا چاہتا ہوں امریکہ برس ہا برس سے پاکستان کو اس انداز میں قرضہ دے رہا ہے جس انداز میں میں تمہیں ڈالر دے رہا ہوں چنانچہ ہمارے ہاں پیدا ہونے والا ہر بچہ امریکہ کا ہزاروں ڈالر کا مقروض ہے۔ میں بھی ان مقروضوں میں سے ایک ہوں اور اپنے حصے کے قرض کی رقم قسطوں میں ادا کر رہا ہوں۔ امید ہے تمہیں پوری بات سمجھ آ گئی ہو گی۔ تم ایک دلچسپ آدمی ہو۔ اس نے خوشی طبعی سے کہا۔ دراصل ہماری حکومت اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کے لئے اربو ں ڈالر مختلف حکومتوں کو قرض دیتی ہے۔ لیکن اس کے اپنے لاکھوں عوام فٹ پاتھوں پر اور پلوں کے نیچے رات بسر کرتے ہیں اور اپنی ضروریات کے لئے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ یہ تو ٹھیک ہے لیکن ایک بات تو بتاؤ؟

کیا؟

تم جوان آدمی ہو نوکری کیوں نہیں کرتے ؟

نوکری نہیں ملتی۔

کیوں ؟

اس نے اپنے لمبے بالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ان لمبے بالوں کی وجہ سے۔ وہ کیسے۔ ؟ جہاں ملازمت کے لئے جاتا ہوں وہ کہتے ہیں یہ بال کٹوا کر بھلے مانسوں ایسی شکل بنا کر آؤ ملازمت مل جائے گی۔ تو تم بال کٹوا کیوں نہیں دیتے ؟ میں کسی کو یہ اختیار دینے کو تیار نہیں ہوں کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ مجھے زندگی کس طرح گزارنا ہے۔ میں محض نوکری کے لئے اپنے بال نہیں کٹوا سکتا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے شدت جذبات سے میز پر مکہ مارا اور کہا اصولوں پر سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔

اردو مرکز

اور اب میں اردو مرکز کی طرف رواں دواں ہوں۔ اردو مرکز جناب الاطف گوہر کی تھرڈ ورلڈ فاؤنڈیشن کا ایک ذیلی ادارہ ہے جس کا مقصد اردو کا فروغ ہے افسوس کہ یہ ادارہ اب بوجوہ بند ہو چکا ہے۔ افتخار عارف اس ادارے کے سربراہ ہیں۔ اردو مرکز کے حوالے سے اگر یہ کہا جائے کہ یہ ادارہ اسم با مسمی ہے تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہو گا کہ اردو مرکز کی یاترا کو ضرور جاتا ہے۔ افتخار عارف نے اس ادارے کے استحکام کے لئے بے پناہ محنت کی ہے۔ افتخار عارف لوگوں سے عداوتیں کم اور دوستیاں زیادہ پالتا ہے،پھر ادب میں اس کا غیر متنازعہ مرتبہ بھی اس کے کام کو آسان بناتا ہے۔ افتخار کے معاون فاروق حیدر بھی افتخار کی طرح خلیق اور اپنے کام کی مکمل اہلیت رکھنے والے شخصیت ہیں اور یوں اردو مرکز نے اردو دنیا میں اپنے پاؤں بہت مضبوطی سے جمائے ہیں۔ تاہم جناب الطاف گوہر سے میری گذارش ہے کہ بطور ایک محب وطن پاکستانی، وہ پاکستانی ادب کے فروغ کو ادارے کے اغراض و مقاصد میں سر فہرست رکھیں۔ الطاف گوہر سیاسی ڈپلومیٹک اثر و نفوذ کے طریقوں پر گہری نظر رکھنے والے دانشور ہیں۔ اور اس امر سے بخوبی واقف ہوں گے کہ کلچر اور زبان کے حوالے سے پاکستان اور بھارت میں اشتراک کے پہلو تلاش کرنا اور پھر اس کے ذریعے اپنے مقاصد کے لئے راہ ہموار کرنا بھارت کی بنیادی پالیسیوں میں سے ایک پالیسی ہے۔ چنانچہ وہ پنجابی کے نام پر مغربی اور مشرقی پنجاب کے لوگوں میں اشتراک، سندھی کے نام پر سرحد پار کے سندھیوں کے ساتھ اشتراک اور اب اردو کے نام پر ایک بڑے ثقافتی اشتراک کے لئے راہ ہموار کر رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اردو مرکز اس دام ہم رنگ زمیں کا شکار نہیں ہو گا کہ الطاف گوہر اور ان کے قابل لیفٹیننٹ افتخار عارف ایسے معاملات کی باریکیوں کو سمجھنے والے لوگوں میں سے ہیں۔

ٹیوب اسٹیشن سے نکلنے کے بعد میں زیبرا کراسنگ عبور کر کے بائیں جانب کی پر ہجوم سڑک پر گھوم گیا اور تقریباً آدھ فرلانگ فاصلہ طے کرنے کے بعد سیکاول اسٹریٹ میں اردو مرکز کی عمارت کے سامنے کھڑا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی بائیں ہاتھ پر فاروق حیدر کرسی پر بیٹھے اپنے کام میں پوری طرح منہمک تھے۔ میں نے کھنگورا مار کر انہیں اپنی طرف متوجہ کیا انہوں نے گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر کرسی سے اٹھ کر مجھ سے بغل گیر ہو گئے۔ اردو مرکز کے ایک رفیق جمشید مرزا سے بھی یہیں ملاقات ہوئی۔ جمشید مرزا افسانہ نگار ہیں اور ایک عرصے سے لندن میں مقیم ہیں۔ اس چھوٹے سے ہال میں کتابوں سے بھری ہوئی نئی الماریاں دھری تھیں۔ ان میں سے ایک میں اخبارات و جرائد پڑے تھے۔ یہاں محبوب سیالکوٹی اور محمود دیوان بالکل اسی جگہ بیٹھے مطالعے میں مصروف تھے۔ جہاں میں انہیں گزشتہ برس چھوڑ کر گیا تھا۔ محبوب سیالکوٹی اور محمود دیوان دونوں صاحب دیوان اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ اور ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ان سے مل کر میں چند سیڑھیاں طے کرنے کے بعد افتخار عارف کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ میز پر کتابوں کا ڈھیر،دیوار پر فیض احمد فیض اور ن۔ م۔ راشد کی تصاویر، افتخار عارف کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ بے ساختہ گرم جوشی کے ساتھ اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے بغل گیر ہوئے۔ ارے .....تو پھر آگیا۔ ارے کے بعد میں نے جتنے ڈاٹ ڈالے ہیں ان کی گنتی کر کے افتخار کو اتنے ہی کوڑے لگوائے جا سکتے ہیں۔ گرم گرم چائے کی چسکیاں لینے کے بعد غیبت کا ایک سیشن ہوا جس میں طرفین نے پاکستان اور بھارت کے بعض ادیبوں کی بھر پور عیب جوئی کی۔ اختتام پر افتخار عارف نے کہا یار ہم دونوں بہت عجیب ہیں جن لوگوں کی ہم غیبت کر رہے ہیں ہم ان کے فن اور شخصیت کے متعدد روشن پہلوؤں کے بہت مداح ہیں پھر ہم ان کی غیبت کیوں کر رہے تھے ؟

میں نے کہا اللہ بہتر جانتا ہے۔ مگر جس طرح ان کی غیبت کی وجہ سمجھ نہیں آئی اسی طرح ان کی تعریف کی وجہ ڈھونڈو گے تو وہ بھی سمجھ نہیں آئے گی۔ اس پر افتخار عارف کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔ امجد اور حسن کہاں ہیں افتخار نے پوچھا۔ حسن تو عاشور کاظمی کے ہاں ہے جب میں گھر سے نکلا وہ سو رہا تھا، امجد اپنے دوست مکرم کے ساتھ ہے اور مجھے یقین ہے کہ رات بھر امجد کے لطیفے سن سن اس وقت مکرم سو رہا ہو گا۔ بلکہ وہ لطیفوں کے دوران ہی سو گیا ہو گا۔ میں نے بات ختم کر کے حسن کو فون کیا۔ وہ اس وقت جاگ رہا تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر افتخار عارف کے پاس پہنچ جاؤ وہ پکاڈلی اور سوہو کی سیر کو نکل رہے ہیں۔

سوہو ؟ پیپسنگ شو، اسٹرپٹیز آہا میں ابھی آ رہا ہوں اور اس نے فون بند کر دیا۔ امجد فردوس بھائی کے ساتھ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد حسن رضوی نیلے رنگ کی جیکٹ اور نیلی جین پہنے ہمارے ساتھ تھا۔ ٹریفا لگر سکائر پر پوری دنیا سے آئے ہوئے سیاحوں اور ہزاروں مقامی کبوتروں کا ہجوم تھا۔ سیاح تو کچھ دیر یہاں گزارنے کے بعد آگے چلے جاتے ہیں جبکہ یہ کبوتر یہیں رہتے ہیں۔ لوگ انہیں دانا ڈال دیتے ہیں اور زمین پر بکھرے ہوئے بے پناہ اناج کے باوجود یہ کبوتر جس ہاتھ میں دانے

دیکھتے اس شخص کے سر کاندھوں اور ہاتھو ں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ ذرا اوپر گورے لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے تھے بیٹھے اور لیٹے ہوئے تھے۔ اس دن گرمی بھی زیادہ تھی مگر ان کے لباس سے لگتا تھا بہت زیادہ ہے۔ حسن ایک لڑکی کو بہت بری طرح گھور رہا تھا۔ اس کے گھورنے میں کافی غصہ تھا کیوں کہ وہ لڑکی کافی بے حیا قسم کی تھی۔ جب حسن نے کچھ دیر تک نظریں نہ ہٹائیں تو میں نے اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھا اور کہا اب بس کرو بلکہ اگر میری مانو تو عزت بچا کر یہاں سے نکل چلو۔ وہ کیوں؟ حسن نے پوچھا۔ اس لئے کہ لڑکی کے ساتھ جو لڑکا ہے وہ لڑکی سے بے نیاز تمھیں انہیں نظروں سے گھور رہا ہے جن نظروں سے تم لڑکی کو گھور رہے ہو۔ حسن نے اس کو دیکھا تو اس کی گھگی بندھ گئی اور اس نے فوراً قدم آگے بڑھا دیئے۔

جنس کا بیضہ

سفید فام نوجوانوں کو سلام

پکاڈلی سرکس کے علاقے میں جنوبی افریقہ کے سفارت خانے کے سامنے نوجوانوں کی ایک ٹولی ہاتھوں میں بینر اٹھائے جنوبی افریقہ کی نسلی پالیسیوں کے خلاف مظاہرہ کر رہی تھی۔ یہ نوجوان سفید فام ہوتے ہوئے جنوبی افریقہ کے سفید فام حکومت کی رسوائے زمانہ اور ننگ انسانیت پالیسیوں پر نفریں بھیج رہے تھے۔ اگر مغرب کے روشن چہرے کے فریب میں آنے کی بجائے اس کے اندروں کو اپنی قوم کے سامنے لانے کی کوشش کریں گے جو چنگیز سے تاریک تر ہے۔ افتخار عارف نے بتایا کہ جنوبی افریقہ کے سفارت خانے کے سامنے ہا برس سے دن اور رات چوبیس گھنٹوں میں سفید فام نوجوانوں میں کوئی نہ کوئی گروہ اپنی نفرت کے اظہار کے لئے مظاہرہ کرتا رہتا ہے۔ میں ان نوجوانوں کو سلام کرتا ہوں۔ ہم پکاڈلی سرکس کے علاقوں میں پھرتے پھرتے لندن کے گڑ سوہو کی طرف گامزن تھے۔ یار مجھے ایک بات بتاؤں۔ حسن نے مجھ سے پوچھا۔ یہ جو لڑکے لڑکیاں لندن کی سڑکوں پر پھرتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کے بازو کیوں تھامے ہوئے ہیں۔ ؟ بے اعتباری ہے۔ میں نے ہہستے ہوئے کہا۔ سوہو کے "گڑ"میں سوہو کے علاقے میں فاحشہ عورتیں دیواروں کے ساتھ ننگی کھڑی تھیں یا کسی ہال میں ہونے والے شو میں شرکت کی دعوت کاروباری تبسم اور اشاروں کے ساتھ دے رہی تھیں۔ اس علاقے میں جنسی رسالے، جنسی ادویات، اور جنسی اعضاء کی دکانیں تھیں پیسنگ شو تھے جس کے لئے کھڑکی میں سکہ ڈال کر عورت کی تذلیل کا زندہ تماشہ دیکھا جا سکتا تھا۔ ایک جگہ فٹ پاتھ پر نشہ بازوں کا ایک گروہ آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ ان کے شیو بڑھے ہوئے تھے۔ کپڑوں سے بو کے بھبھوکے اٹھ رہے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور ان کے ہاتھوں میں شراب کی خالی بوتلیں اور بیئر کے خالی ٹن تھے۔ جنھیں وہ بار بار منہ کے ساتھ لگاتے کہ شاید شراب کا کوئی بچا کچا قطرہ ان کے حلق میں چلا جائے۔ ان نشہ بازوں میں عورتیں بھی تھیں اور مر د بھی تھے جو اپنی اصل عمروں سے زیادہ لگ رہے تھے۔ ایک نشئی اچانک اپنی جگہ سے اٹھ کر میری طرف بڑھا اور اس نے اپنے ہاتھ میرے آگے پھیلا دیئے۔ "اللہ کے نام پر ایک پاؤنڈ دیتے جاؤ سخی بابا"اس کے چہرے سے مجھے لگا جیسے وہ یہی کہہ رہا ہے۔ حسن نے اپنا کیمرہ نکالا اور ان نشے بازوں کی تصویر اتارنے لگا۔ یہ دیکھ کر ایک ہوشمند نوجوان دوڑ کر اس کی طرف آیا اور بولا تصویر اتارنے کا ایک پاؤنڈ لگے گا نکالو ایک پاؤنڈ۔

حسن نے کیمرہ کیس میں بند کر دیا اور اپنا ہاتھ اس کی طرف پھیلا کر کہا تم ایک پونڈ مجھے دو اور میری تصویر بنا لو۔

لوگو میں لٹیا گیا۔

ایک نائٹ کلب کے باہر ایک جاپانی نوجوان کھڑا شور مچا کر لوگوں کو جمع کر رہا تھا۔ مجھے کلب والوں نے لوٹ لیا ہے۔ میں ٹکٹ خرید کر اندر گیا میں ابھی اپنی نشست پر بیٹھا ہی تھا کہ نیم عریاں لڑکیاں میرے دائیں اور بائیں آ کر بیٹھ گئیں انہوں نے مجھے شراب منگوانے کو کہا۔ میں نے ان دونوں کے لئیے ایک ایک پیگ منگوایا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے بل طلب کیا۔ یہ ایک سو ستر پونڈ تھا۔ میں نے بل ادا کرنے سے انکار کیا تو کلب کا منیجر ایک پولیس والے کو بلا لایا جس نے مجھ سے کہا کہ تمہیں یہ رقم ادا کرنا پڑے گی۔ انہوں نے مجھے سے سارے پیسے چھین لیے ہیں۔ میں یہاں کتنی دیر سے کھڑا فریاد کر رہا ہوں پولیس والے میرے قریب سے کان لپیٹ کر گزر جاتے ہیں۔ پولیس ان چوروں سے ملی ہوئی ہے اوئے لوگو میں لٹیا گیا۔ سوہو کا ایک راؤنڈ لگانے کے بعد واپس جاتے ہوئے افتخار عارف نے کہا تم نے جنس کی یہ ارزانی دیکھی؟ یہ جنس نہیں جنس کا ہیضہ ہے۔ مجھے اس جاپانی سے ہمدردی ہے مگر ہیضے والے گھر میں سوچ سمجھ کر جانا چاہئیے۔

پکاڈلی سے واپسی پر حسن اور میں ایک دفعہ پھر ٹیوب میں سوار ہوئے۔ حسن ونڈر میئر کے اسٹیشن پر اتر کر عاشور کاظمی کی طرف چلا گیا اور میں وجش کی طرف۔ "عازم سفر"ہوا۔ بخش لائل پوری کے ہال میرے قیام کو ابھی دو تین روز ہی ہوئے تھے کہ ایک روز اعجاز احمد اعجاز، بخش کے گھر آیا اور اس نے میرا سامان اٹھا کر اس طرح اپنی کار میں ڈال لیا جس طرح تہہ بازاری والے فروٹ اور سبزیوں کے چھابے ٹرک میں ڈال کر چلتا بنتے ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ لندن میں میرے علاوہ تمہارا کسی اور جگہ قیام قابل دست اندازی پولیس جرم ہے۔ چنانچہ "زندگی" کے بقیہ ایام اعجاز کے ہاں ہی بسر ہوئے بلکہ انگلینڈ کے مشاعروں سے فراغت کے بعد ڈنمارک اور ناروے میں مشاعروں میں شرکت کے لئے ہم لوگ اعجاز کے ساتھ ہی بذریعہ کار یورپ کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اس دوران میرے عزیز دوست اور ممتاز مزاح نگار طارق طور بھی امریکہ جاتے ہوئے لندن رکے میں اور اعجاز انہیں ایئر پورٹ سے اچک لائے۔ سو اس وقت صورت حال یہ تھی کہ میرا اور طارق کا قیام اعجاز کے ہاں تھا۔ حسن رضوی عاشور کاظمی کی طرف تھا۔ خالد احمد برمنگھم میں صفی حسن کے پاس قیام پذیر تھا اور امجد اسلام امجد اپنے دوست مکرم سید کی طرف تھا۔

چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی تھی داستاں اپنی، حسن کے علاوہ باقی دوستوں سے رابطہ صرف فون کے ذریعے تھا چنانچہ ہم باری کے بخار کی طرح ایک دوسرے کو فون کرتے رہتے اور ایک دوسرے کو دعا دیتے کہ جہاں رہو، خوش رہو، عاشور

کاظمی اور باقر نقوی تقریباً ہر روز فون کر کے میری خیریت دریافت کرتے۔ بخش لائل پوری سے تو دن میں تین چار بار فون پر ملاقات ہو جاتی ایک روز باقر نقوی اور عاشور کاظمی ہمیں ایک ماڈل ولیج دکھانے لے گئے جہاں پر ایک قصبہ منی ماڈلز کی صورت میں آباد کیا گیا تھا۔ عاشور کاظمی کے ساتھ ہماری بھابی اور بھتیجیاں خوشبو اور بتول بھی تھیں۔ خوشبو اور بتول تتلیوں کی طرح اس سے "مثالی قصبے " میں پھرتی رہیں اور ہم لوگ اپنا دامن ان بچوں کی خوشیوں سے بھرتے رہے۔ اسی طرح ایک روز عاشور کاظمی مجھے اور حسن رضوی کو اپنی کار پر اردو مرکز چھوڑنے چلے گئے اور اندر جانے کی بجائے باہر ہی سے لوٹ گئے کیونکہ اندر افتخار عارف تھا۔ حالانکہ عاشور کاظمی کو خوش ہونا چاہئے تھا کہ افتخار عارف اندر ہے۔

لندن میں اعجاز احمد اعجاز کی "گوڑھی" دوستی اگر کسی سے ہے تو وہ ابرار حسین ترمذی سے ہے۔ ابرار ترمذی بہت خوبصورت مصور ہے۔ فوٹو گرافی کا بھی شوقین ہے۔ اور فوٹو گرافی میں فرد سے زیادہ بیک گراؤنڈ کو ترجیح دیتا ہے چنانچہ اس کی تصویروں میں فرد اپنی پہچان کے ضمن میں اسی عمل سے گزرتا ہے جس عمل سے صوفی اپنی پہچان کے عمل سے گزرتے ہیں اور اگر تصویر میں فرد کی بجائے افراد ہوں تو تصویر اترواتے وقت وہ جس ترتیب سے کھڑے تھے انہیں اپنی پہچان کے لئے وہ ترتیب یاد رکھنا پڑتی ہے۔ ابرار ترمذی ایک انتہائی دلچسپ کردار ہے اور اگر کوئی اس کا خاکہ لکھے تو دونوں امر ہو جائیں سخت بد لحاظ، چڑ چڑا، اذیت پسند، جز رس فسادی اور اس کے ساتھ ساتھ بہت خوش مزاج، دوستوں کے ساتھ محفلیں جمانے والا بذلہ سنج۔ میں نے اجتماع ضدیں کی اس سے بہتر مثال نہیں دیکھی۔ وہ چشم زون میں کوئی محفل اجاڑ بھی سکتا ہے اور اس کی رونق میں اضافہ بھی کر سکتا ہے۔ لندن اور سفر یورپ میں ابرار شاہ سے مسلسل نشستیں رہیں۔

قبضہ غاصبانہ

اعجاز کا گھر ساؤتھ ہال میں واقع ہے۔ یہ علاقہ پاکستانیوں اور بھارتیوں کا ہے۔ بلکہ بھارتی زیادہ ہیں اور بھارتیوں میں سے بھی سکھ یہاں اکثریت میں ہیں۔ چنانچہ اس کے بازاروں میں پھرتے ہوئے لگتا ہے کہ لندن کے ساؤتھ ہال میں نہیں امرتسر کے ہاں بازار میں گھوم رہے ہیں۔ ایک انگریز نے ساؤتھ ہال میں مقیم ایک سردار جی کے گھر کی گھنٹی بجائی سردار جی باہر نکلے تو انگریز کا نام لے کر پوچھا کہ کیا وہ اس گھر میں رہتا ہے ؟ سردار جی نے یہ سن کر دروازہ بند کرتے ہوئے کہا "اس علاقے میں کوئی غیر ملکی نہیں رہتا" انگریز نے یہی کیا تھا اور پورے ڈیڑھ سو سال تک کیا تھا۔ ساؤتھ ہال کی خصوصیت یہاں بولی جانے والی پنجابی بھی ہے۔ جو کچھ اس قسم کی ہوتی ہے۔ ڈوراں دروازے کلوز کر دیو،انگلینڈ دیاں روڈاں سڑکیں بیوتی فل نیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

انگریزی نہ جاننے کا فائدہ

انگلینڈ میں جو پاکستانی آباد ہیں ان کی غالب تعداد پنجاب اور آزاد کشمیر سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ لوگ آج سے تقریباً تیس سال قبل ترک وطن کر کے یہاں آئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر کا تعلق لیبر کلاس سے تھا اور انگریزی سے نا بلد چنانچہ انہیں مجبوراً اپنے بچوں سے پنجابی بولنا پڑی۔ جس کا فائدہ یہ ہوا کہ یہاں پیدا ہونے اور نشو و نما پانے والے بچے بھی پنجابی سیکھ گئے مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ بچے پنجابی صرف اپنے والدین کے ساتھ بولتے ہیں۔ آپس میں ہمیشہ انگریزی میں بات کرتے ہیں ان میں سے جو احساس کمتری کا شکار ہیں وہ اپنے بچوں کو فر فر انگریزی بولتے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اور فرط مسرت سے اپنے سینے کے ساتھ چمٹا کر کہتے ہیں "آہا میرا بیٹا تو کسی انگریز کا بیٹا لگتا ہے " مگر جنہیں اپنی ثقافت اور زبان کے ضمن میں کوئی احساس کمتری نہیں ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ مغرب میں رہنے ہوئے بھی ان کی تربیت مشرقی اقدار کے مطابق ہو۔

اعجاز کے ڈرائنگ روم میں طارق طور اور میں گرم گرم کافی کے گھونٹ لے رہے تھے کہ اعجاز کا چھ سالہ بیٹا فراز ننھی منی شلوار قمیض پہنے سر پر کپڑے کی ٹوپی اوڑھے کمرے میں داخل ہوا اور باپ کی گود میں چڑھ گیا فراز قریبی مسجد میں مولوی صاحب سے قرآن شریف پڑھ کر آ رہا تھا۔ اعجاز نے اس سے آج کا سبق سنا اور پھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے پر فون سننے چلا گیا۔

یہ تو سب ٹھیک ہے۔ مگر۔۔۔۔۔۔

قاسمی صاحب لندن میں مجھے ایک چیز بہت پسند آئی ہے۔ طارق طور نے کہا۔ وہ کیا؟ یہاں گرد بالکل نہیں ہے۔ چیزیں تو یہاں اور بھی بہت سی اچھی ہیں۔ میں نے کہا۔ وہ کیا؟ اس دفعہ طارق نے پوچھا۔ مثلاً یہ کہ سرخ فیتے کا چکر نہیں ہے۔ جو قانون بنایا جاتا ہے اس پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ نہیں۔ معاشی طبقے موجود ہونے کے باوجود غیر طبقاتی فضا موجود ہے۔ یعنی کسی کی عزت نفس کو کچلنے کی پوری آزادی نہیں۔ جہیز کا چکر نہیں۔ دفتروں میں سازشیں ہوئی ہیں مگر ترقی سازش کی بنیاد پر نہیں عموماً میرٹ پر ہوئی ہے دوسروں کے معاملات میں اس کی عدم موجودگی میں تو بات ہو جاتی ہے مگر اس کو بنیاد بنا کر کسی کی زندگی حرام نہیں کی جاتی۔ دماغ اگرچہ ذرائع ابلاغ کے مفتوح ہیں مگر بظاہر فکر کی آزادی نظر آتی ہے۔ اور گرد تو یہاں بالکل نہیں ہے۔

بالکل بالکل۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر میں نے جتنی خوبیاں گنوائی ہیں اور جتنی خوبیاں ابھی نہیں گنوائیں اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ مغرب کے دو چہرے ہیں ایک جو اصلی ہے ایک جو دکھانے کے لئے ہے۔ میرے نزدیک یہ سوسائٹی بہت بری طرح زوال پذیر ہے اور سوشلزم کے بعد سرمایہ داری نظام بھی اپنی موت آپ مرنے والا ہے مگر اس پر تفصیلی بات چیت پھر کبھی ہو گی۔ وہ تو ٹھیک ہے طارق طور نے کہا "مگر آپ دیکھیں یہاں گرد بالکل نہیں " اعجاز فون سن کر آیا تو اس کے ہاتھ میں کار کی چابیاں تھیں۔ آپ لوگ لندن میں علمی مذاکرے کرنے نہیں آئے چلیں دریائے ٹیمز کی سیر کو چلتے ہیں اعجاز نے کہا۔

یہ آنکھیں کچھ چھپاتی بھی ہیں مجھ سے

رات کو تقریباً برہ بجے گھر واپس جاتے ہوئے اعجاز نے کار ایک ویران سڑک پر موڑ لی جس کے دونوں طرف گھنے درخت تھے۔ میں آپ کو ایک عجیب و غریب چیز دکھاؤں اعجاز نے کار میں ہیٹر چلا لیا تھا کیونکہ رات ہوتے ہی فضا میں خنکی بڑھ گئ تھی۔ ابھی کار کی روشنی میں آپ کو ایک عورت نظر آئے گی جو سڑک پر کوڑا کرکٹ والا بیگ اٹھائے چل رہی ہو گی یا جھاڑیوں میں دبکی بیٹھی ہو گی۔

یہ انگریز عورت گذشتہ بیس برس سے اسی سڑک پر دن اور رات کے چوبیس گھنٹو ں میں شدید برف باری کے موسم میں اور طوفانی بارشوں کے دوران فٹ پاتھ پر بیٹھی رہتی ہے یا ایک فرلانگ کے حصے میں چلتی رہتی ہے۔ اسے کسی نے سوتے نہیں دیکھا اس پر موسموں کا کوئی اثر نہیں ہوتا نہ بیس برس مسلسل جاگتے رہنے سے اسے کچھ ہوا ہے۔ لوگ رات کو ادھر سے نہیں گزرتے ان کا خیال ہے یہ کوئی بد روح ہے۔

ایک کپکپی سی تو ہم سب کے جسم پر طاری ہوئی مگر حسن رضوی کی گھگی بندھ گئی۔ یار گاڑی موڑ " حسن نے اعجاز سے کہا وہ سامنے کھڑی ہے " اعجاز نے چیخ مار کر کہا۔ حسن نے اپنا سر سیٹ میں چھپا لیا۔ اعجاز نے کار آہستہ کر لی کار کی ہیڈ لائٹس اس کے چہرے پر پڑیں تو اس نے روشنی سے بچنے کے لئے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا مگر جب لائٹ مدھم نہ ہوئی تو اس نے آنکھوں سے ہاتھ اٹھا کر بھوکی شیرنی کی نظروں سے ہمیں دیکھا۔

اس کی عمر چالیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس نے ہمارے ہاں کی خانہ بدوش عورتوں ایسے کپڑے پہنے تھے اور وہ سرخ و سفید رنگت کی حامل تھی۔ حسن رضوی سر جھکائے ناد علی پڑھ رہا تھا۔ یہ کون ہے ؟ طارق نے اعجاز سے پوچھا۔ یہ کوئی نہیں جانتا نہ کوئی جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ اعجاز نے کہا لوگ اس کے سائے سے بھی بچنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کہیں اس کی نحوست کا سایہ ان پر نہ پڑ جائے۔ آگے

چلو، آگے چلو " حسن نے آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ واپس گھر پہنچ کر میں نے خود کو تھوڑی دیر کے لئے اکیلا کر لیا۔ ایک وقت آتا ہے کہ انسان کے دکھ اسے تمام دکھوں سے بے نیاز کر دیتے ہیں اس "بد روح" کے دکھو ں نے میری آج کی رات کی نیند چھین لی ہے۔

مگر وہ اپنے دکھوں کی سر زمین کو کب سے فتح کر چکی ہے۔ لوگ اس کی کیفیات سے واقف نہیں ہیں۔ مگر ممکن ہے وہ اس مقام پر ہو کہ جو لوگ اس پر ترس کھاتے ہوئے ادھر سے گزرتے ہیں وہ ان کے دکھوں سے واقف ہو اور اس کے دل میں ان کے لئے رحم کے جذبات ہوں ہماری آنکھیں حقیقت کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتیں۔ جو ہم دیکھتے ہیں۔ ممکن ہے وہ حقیقت نہ ہو اور جو ہمیں نظر نہیں آتا ممکن ہے وہی حقیقت ہو؟

میں لندن میں تھا اور ابھی تک عبداللہ حسین، مشتاق احمد یوسفی، ساقی فاروقی اور افتخار عارف میں سے صرف افتخار عارف سے رابطہ قائم کر سکا تھا۔ میں نے خود پر نفریں بھیجی اور ٹیلی فون گھمانا شروع کر دیا صرف یوسفی صاحب اور ساقی فاروقی سے گفتگو ہو سکی۔ عبد اللہ حسین پاکستان گئے ہوئے تھے۔ طے پایا کہ ملاقات عنقریب ہو گی اور دن مقام اور وقت "مہمان" کی سہولت کے مطابق طے کیا جائے گا۔

غلام قادر آزاد کا کیا حال ہے ؟ میں نے گھر کی لابی سے ڈرائنگ روم کی طرف آتے ہوئے اعجاز سے پوچھا۔ لندن کے بعد اب نیو کاسل میں مقیم اپنے عزیز دوست کی یاد نے مجھے ستانا شروع کر دیا تھا۔ آزاد صاحب بالکل ٹھیک ہیں اور ان سے تقریبات میں ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ وہ برمنگھم کے مشاعرے میں آ رہے ہیں۔ وہاں ملاقات ہو جائے گی۔ اعجاز نے بتایا۔ یہ سن کر دل کو اطمینان ہوا ورنہ یا مجھے نیو کاسل جانا پڑتا اور یا آزاد صاحب کو لندن کا سفر اختیار کر نا پڑتا۔ میں اپنی زندگی میں جن چند نفیس ترین لوگوں سے ملا ہوں غلام قادر آزاد ان میں سے ایک ہیں، فلسفے کے رسیاں، علمی بحثوں کے شائق، جہاں اختلاف جھگڑے میں تبدیل ہونے لگے وہاں میں موضوع تبدیل کر دیتا۔ محفل باز، دوستی کے تقاضوں سے واقف، روپے پیسے کے ازلی دشمن، منطق یہ کہ پیسہ اگر جین میں رہے تو رونق بازار ختم ہو جائے چنانچہ ادھر جیب میں پیسہ آیا اور ادھر رونق بازار میں اضافے کے لئے دوستوں کے ساتھ کسی رستوران میں جا محفل جمائی لاہور میں برادر عزیز احمد حسن حامد اور ارشد کیانی ان کے یونیورسٹی کے زمانے کے دوست ہیں۔

غلام قادر آزاد سے میرا تعارف احمد حسن حامد کی معرفت ہوا تھا۔ ارشد کیانی یونیورسٹی کے زمانے میں دوستوں کو قرض دیا کرتے تھے۔ اور ان مقروضوں میں غلام قادر آزاد بھی تھے۔ آزاد ان دنوں سینئر بنکر ہیں دو برس بیشتر لاہور میں آئے تو ارشد گیلانی نے ان کی فضول خرچی پر گفتگو کے دوران انہیں مخاطب کیا اور کہا تم اگر ورلڈ بینک کے صدر بھی ہو جاؤ تب بھی ارشد کیانی کے مقروض ہی رہو گے۔ اس دن سے سوچ رہا ہوں کہ احمد حسن حامد سے ملاقات ہو تو پوچھوں گا کہ ارشد کیانی دوستوں کو قرض ڈپٹی نذیر احمد کی طرح تو نہیں دیتے تھے ؟

طارق طور ابھی سو کر نہی اٹھے تھے اور میں ایک گھنٹے سے پوری طرح تیار بیٹھا تھا۔ اس دوران میں نے طارق کو دو تین بار جگانے کی کوشش کی مگر مجھے اندازہ ہوا کہ سوئے ہوئے شیر کو نہیں چھیڑنا چاہئے چنانچہ میں اس شیر کو سوتا چھوڑ کر اعجاز کے ساتھ گھومنے کے لئے گھر سے نکل آیا۔

مغرب کا ڈرائنگ روم

آج موسم بہت خوشگوار تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی چنانچہ انگریزوں کے چہروں پر بھی شتابی کے آثار کم کم تھے اور وہ ریلیکسنگ موڈ میں دکھائی دیتے تھے۔ لندن کی سڑکیں بہت تنگ ہیں کہ اگر ان کے دونوں اطراف میں گاڑیاں پارک ہوتی ہی۔ چنانچہ بعض سرکیں تو اتنی تنگ ہیں کہ اگر سامنے سے گاڑی آ جائے تو آپ کو اپنی گاڑی ریورس کر کے کسی خالی جگہ میں لمحے بھر کو کھڑی کرنا پڑتی ہے تا کہ سامنے سے آنے والے کے لئے گزرنے کار راستہ بنایا جا سکے۔

مجھے مغرب کی ایک بات بہت پسند ہے ایک تو بقول طارق طور "یہاں گرد بالکل نہیں ہے " اور دوسرے مغرب والے گھر سے نکلتے وقت یہ سوچ کر نکلتے ہیں کہ بہت صاحبان نظر ہزاروں میل کا سفر صرف ان چہروں کو دیکھنے کے لئے طے کرتے ہیں جن کے دیکھنے سے منہ پر رونق آ جاتی ہے اور بقول شاعر وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے چنانچہ حسینان فرنگ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ گھروں سے نکلتی ہیں اور یوں فضا کچھ اجلی اجلی سی لگنے لگتی ہے۔

صاف ستھرے کپڑے، صاف ستھری راہ گزاریں صاف ستھری دکانیں، یوں سب کچھ نکھرا نکھرا سا لگتا ہے۔ امارت اور غربت چہروں کے جغرافیے تبدیل کر دیتی ہے۔ ہمارے ہاں غربت نے شکلیں اور عقلیں خطرے میں ڈال دی ہیں۔ میلے کچیلے کپڑے، میلی کچیلی سوچیں، کپڑے تو دھلنے کے لئے دیئے جا سکتے ہیں، سوچوں کا کیا کریں ؟ کیا وہ دن ہمارے زندگیوں میں آ سکے گا جب ہم لوگ گھروں سے پورے اعتماد کے ساتھ گردنیں تان کر نکلیں گے اور جب ہمارے دلوں میں آنے والے دنوں کا وسوسہ نہیں ہو گا۔

عطاء بھائی کیا سوچ رہے ہیں ؟ اعجاز نے کار ایک گلی کی طرف موڑتے ہوئے پوچھا۔ سوچنا کیا ہے دیکھ رہا ہوں۔ کیا دیکھ رہے ہیں ؟ یہاں سب کچھ کتنا خوبصورت ہے اتنا بھی نہیں جتنا نظر آتا ہے اعجاز نے کہا۔ وہ کیسے ؟ مغرب والے سیاحوں کو اپنا ڈرائنگ روم دکھا کر پورے گھر کے بارے میں ان کی رائے بہتر بنا دیتے ہیں۔

یار ان کا تو پورا گھر ڈرائنگ روم کی طرح ہوتا ہے بلکہ ان کے ہاں تو ڈرائنگ روم کا تصور ہی نہیں ہے ؟یہ بھی ٹھیک ہے لیکن جب سارے گھر کو قالینوں سے ڈھانپ دیا جائے اور ویکیوم کلینر سے اوپر اوپر سے صفائی ہوتی رہے تو ان قالینوں کے نیچے جمی ہوئی تہہ در تہہ میل پر کسی کی نظر نہی پڑتی۔ میں نے چونک کر اعجاز کی طرف دیکھا۔ مغرب میں مقیم پاکستانی دوستوں میں سے یہ پہلا دوست تھا جو

پاکستان آنے والے کسی دوست کو مغرب کی چکا چوند سے مزید متاثر کرنے کی بجائے اسے تصویر کا دوسرا رخ دکھا رہا تھا۔

اندرون تاریک تر

مغرب کے ظاہر اور باطن میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اعجاز نے تقریر شروع کر دی۔ اس کا مظاہرہ بے حد خوبصورت اور باطن بے حد تاریک ہے۔ روح کو تو چھوڑ دیں ان کے جسم بھی صاف نہیں یہ لوگ کم نہاتے ہیں ۱۹۶۰ء تک گھروں میں باتھ روم نہیں ہوتے تھے باتھ روم کی بدعت تو ہم لوگوں کے آنے کے بعد شروع ہوئی ہے۔

یہ جسم کی بدبو کو لونز اور پرفیومز سے مارتے ہیں۔ چہرہ چونکہ نظر آتا ہے اس لئے اس پر پانی چھٹا مار کر صاف کر لیتے ہیں بصورت دیگر ٹیشو پیپر سے کام چلاتے ہیں۔ یہ آپ کو دیکھ کر چہروں پر کس قدر مسکراہٹ بکھیر لیتے ہیں مگر اس میں سے نویں فیصد نسل پرست ہیں اور ہم لوگوں کو انتہائی گھٹیا سمجھتے ہیں۔ نیشنل فرنٹ اور برٹش موومنٹ کے لسانی غنڈے موقع ملتے ہی ایشیائی لوگوں کو تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔

ہم شام کے بعد یہاں پوری آزادی سے نہیں پھر سکتے، خصوصاً ایسٹ لندن میں تو رات کو اکیلا نہیں پھرا جا سکتا۔ پولیس بھی پوری طرح غیر جانب دار نہیں ہے۔ نسل پرست نوجوان ہمارے گھروں کو آگ لگا دیتے ہیں اور عموماً سزا نہی پاتے،ان میں انفرادی طور پر تو پھر بھی بے پناہ اچھے لوگ مل جاتے ہیں۔

لیکن جیسا کہ تم جانتے ہو مغربی ممالک کا من حیث القوم، کمزور اقوام کے ساتھ سلوک انتہائی سفاکانہ ہے۔ اعجاز کا لیکچر جاری تھا کہ میں نے درمیان میں ٹوک دیا یہ سب کچھ ٹھیک ہے مگر ہم لوگوں کا حال ان سے بھی برا ہے۔ ہمارے ہاں بھی لسانی غنڈے ہیں۔ ہم بھی آزادی کے ساتھ شام کے بعد بلکہ دن کے اوقات میں بھی گھروں سے نہیں نکل سکتے۔ ہمارے چھروں پر بھی بظاہر مسکراہٹ، مگر دل تعصبات سے بھرے ہوئے ہیں۔ ہم لوگ کمینے ہیں لالچی ہیں،خود غرض ہیں، منافق ہیں۔ - - - - - -

اس بار اعجاز نے مجھے درمیان میں ٹوک دیا۔ عطاء بھائی آپ ٹھیک کہتے ہیں آپ نے جتنی برائیاں گنوائی ہیں ہم میں اس سے بھی زیادہ ہیں۔ مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں کپٹلزم ادھوری صورت میں نافذ ہے جس سے اس نظام کی صرف بد صورتیاں ہمارے حصے میں آئی ہیں۔ اگر یہ نظام اپنی اصلی شکل میں نافذ کیا جائے تو وہ بد صورتیاں ہمارے ہاں بھی نظر آئیں جو مغرب میں آتی ہیں ویسے بھی ہمارا شمار تو پسماندہ اقوام میں ہوتا ہے، مہذب ہونے کا طعنہ نہ دوں یہ اگر میرے غضب کو عداوت نہیں دینا چاہتے تو انہیں میری طرف سے کہہ دیں کہ یہ خود کو مہذب اور ہمیں

غیر مہذب کہنا چھوڑ دیں۔ اعجاز گفتگو کے اختتام پر شگفتہ بیانی پر اتر آیا تھا۔ اعجاز نے ایک بڑے ڈیپار ٹمنٹل اسٹور کے باہر گاڑی کھڑی کر دی۔ تھوڑی سی شاپنگ کرنا ہے۔ آپ بھی ساتھ آ جائیں۔ دام صد رنگ وسیع و عریض پارکنگ لاٹ سے ہوتے ہوئے اسٹور میں داخل ہوئے تو یوں لگا کسی آئینہ خانے آ گئے ہیں چار منزلہ اس اسٹور میں اشیاء کی ایک دنیا آباد تھی۔ ہر چیز جس کی انسان حتی کہ اس کے پالتو جانوروں کو ضرورت ہے، یہاں اس طریقے سے اس کی نمائش کی گئی تھی کہ ضرورت کے بغیر بھی خریدنے کو جی چاہتا تھا۔ پھر بعض چیزیں جو ایک دن پہلے مہنگی رکھی گئی تھیں۔ آج وہ یکدم نصف قیمت پر بیچی جا رہی تھیں، یعنی گاہک اگر کل بچ گیا تھا تو آج بچ کر نہ جانے پائے۔ گاہک کو دیوالیہ کرنے کی ایک تیکنیک یہ بھی ہے کہ اگر کل اسے شیمپو کی ایک بوتل درکار ہے تو وہ اپنی خواہش کے بر عکس ایک کی بجائے بیک وقت تین بوتلیں خریدنے پر مجبور ہو گا کیونکہ تین پیک میں رعایت دی گئی ہے۔ ان اسٹورز میں تتلیوں جیسی خوش رنگ لڑکیاں کاسمیٹکس کے اسٹال پر مردوں کو الو بنانے کے لئے متعین نظر آتی ہیں۔ اگر کوئی بے وقوف ان کے ہتھے چڑھ جائے تو اس کے دو چار ہزار پاؤنڈ کھڑے کھولتے خرچ کرا دیتی ہیں۔ ان لڑکیوں کی حیثیت ماہرین آرائش کی ہوئی ہے چنانچہ وہ گاہک کو اس کی محبوبہ یا بیوی کے زیبائشی حسن کے لئے مہنگی ترین کاسمیٹکس تجویز کرتی ہیں۔ ان اسٹورز میں گاہک کو دیوالیہ کرنے والی اصل چیز اس کے بٹوے میں پڑی ہوتی ہے۔ جس کریڈٹ کارڈ کہا جاتا ہے۔ یہ کارڈ مختلف سودی کمپنیوں نے جاری کئے ہوتے ہیں،ان میں سے ہر کارڈ پر آپ ایک مقررہ رقم تک کی چیزیں قرض پر لے سکتے ہیں چنانچہ یار لوگ ان کارڈوں پر اندھا دھند خریداری کرتے ہیں اور پھر ان بلوں کی ادائیگی کے لئے مغرب کا انسان ہفتے میں پانچ دن مشینوں کے سامنے روبوٹ کی طرح دست بستہ کھڑا رہتا ہے اور دو دن تفریح کرتا ہے۔ یہ تفریح عموماً شراب و شباب کی صورت میں ہے۔ کانوں کے پردوں اور اعصاب کو تباہ کر دینے والے میوزک پر پاگلوں کی طرح چیخنے چلاتے ناچنے کی صورت میں ہے، انہیں اس حال میں دیکھیں تو لگتا ہے کہ انسان کو مشینوں کا محکوم بنائے جانے کے خلاف احتجاج کیا جا رہا اور ساتویں دن یہ انسان ایک بار پھر ان مشینوں کا موبل آئل بن جاتے ہیں جن مشینوں نے انہیں ایئر کنڈیشنڈ کار، ایئر کنڈیشند گھر، خوشبویات، رنگ برنگے کپڑوں اور کھانے پینے کی وافر اشیاء پر ملازم رکھا ہوا ہے۔ جس طرح ایک ہندو مصنف کے بقول گاندھی کو غریب رکھنے کے لئے قوم کو بہت پیسہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح مغربی معاشرے کو آسائشوں کے لئے زندگی کی حقیقی خوشیوں کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ صنعت کار اور صارفین کے درمیان وہی رشتہ ہے جو ہمارے ہاں بھٹہ مالکان اور مزدوروں کا ہے۔ بھٹہ مالکان اپنے کاریگروں کو ان کی استطاعت سے زیادہ رقم ایڈوانس دے دیتے ہیں جو وہ ساری عمر ادا نہیں کر سکتے چنانچہ بھٹہ مالکان ان مزدوروں کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دیتے ہیں اور ان کی بقیہ تمام عمر غلاموں کی طرح کام کرتے گزر جاتی ہے۔ نظام زر کی اصل خرابی یہ ہے کہ یہ انسانوں میں اشیاء کی اتنی حرص اور ہوس پیدا کر دیتا ہے کہ ان کے حصول کے لئے انسان خود اشیاء میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ گھر کے تمام افراد جنگل میں رہنے والے انسانوں کی

طرح صبح سویرے "شکار" کے لئے اپنی "غاروں " سے نکل پڑتے ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوئے بغیر رات کو اپنی غاروں میں سونے کے آ جاتے ہیں۔ معاشی خود کفالت اور مادہ پرستی کے جبر کی وجہ سے خاندان کے افراد کا رشتہ آپس میں کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور بالا آخر ٹوٹ جاتا ہے چنانچہ طلاقیں ہوتی ہیں،بچے ماں باپ کی محبت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ بہن بھائی کی محبت اور بھائی بہن کی محبت سے محروم رہتا ہے، بوڑھے والدین اولڈ پیپلز ہوم میں اپنے بچوں کی شکلیں دیکھنے کو ترس جاتے ہیں اعلی انسانی قدریں دم توڑنے لگتی ہیں۔ زندگی کا محور اشیاء کا حصول قرار پاتا ہے اور اس کی خاطر جوان خوبرو لڑکیاں بد شکل مالدار بوڑھوں کے ساتھ شادی کرتی ہیں سڑکوں پر بسنس لو کاروباری محبت کی آوازیں لگاتی ہیں،رسالوں کے لئے عریاں تصویریں اترواتی ہیں۔ اسٹیج پر سینکڑوں مردوں کے سامنے خلوت کو جلوت بنا دیتی ہیں۔ میرے خیال میں عورت کی جس قدر تذلیل نظام زر نے کی ہے دنیا کا کوئی دوسرا نظام اس کی نظیر پیش کرنے کی جرات نہیں کر سکتا اسی طرح بوڑھوں کو سسک سسک کر مرنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ خاندانی جھگڑوں کی صورت میں بچے والدین کے التفات اور محبت سے محروم رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بچوں بوڑھوں اور عورتوں کے لئے بظاہر ایک جنت بسائی گئی ہے۔ مگر یہ ظاہر ہے باطن انتہائی تاریک ہے چنانچہ جو نظام بچوں بوڑھوں اور عورتوں کی تذلیل کرتا ہے۔ میں اسے تہذیب یافتہ نظام ماننے سے انکار ی ہوں۔ انسان کو اس کی ذات میں تنہا اور اداس کر دیا گیا ہے۔ مشینوں کے سامنے اس کی حیثیت ثانوی صورت اختیار کر گئی ہے۔ اسے ان مشینوں میں استعمال کرنے کے لئے پالا پوسا جاتا ہے چنانچہ مغرب میں ترقی انسان نے نہیں کی مشینوں نے کی ہے۔ مغرب کی شدید مادہ پرستی کے خلاف سب سے موثر آواز مغرب کے دانشور ہی بلند کر رہے ہیں۔ آئی نیکسو نے اپنے ڈرامے ریسریں میں بتایا ہے کہ مغربی رجحانات نے انسانوں کو گینڈوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ ہر آدمی ذاتی اغراض کی دوڑ میں لگا ہوا ہے۔ اسے دوسروں کی کوئی پرواہ نہیں حتی کہ محبوبہ بھی معاشرتی دباؤں کی وجہ سے گینڈا بن جاتی ہے۔ اس ڈرامے کا ہیرو آخر میں خود کو کمرے میں بند کر لیتا ہے اور کہتا ہے مجھے گینڈا نہیں بننا مجھے انتظار کرنا چاہئے تا کہ ایسا وقت آئے کہ میں گینڈوں کو انسانوں میں تبدیل کر سکوں۔

ساؤتھ ہال

اعجاز احمد نے شاپنگ سے فراغت کے بعد مجھ سے پوچھا اب کیا پروگرام ہے ؟ میں نے کہا واپس چلتے ہیں، ہمارا شیر یشہ مزاح طارق طور بیدار ہو چکا ہو گا، اسے بھی ساتھ لیتے ہیں پھر عاشور کاظمی کی طرف چلتے ہیں وہاں سے حسن کو لیتے ہیں اور آوارہ گردی کرتے ہیں۔ بالکل ٹھیک ہے ابرار ترمذی کو بھی لینا ہے اعجاز نے کہا، دراصل ابرار ترمذی اور اعجاز احمد لازم و ملزوم ہیں بلکہ ایک ستم ظریف کے مطابق ظالم و مظلوم ہیں، مختلف علاقوں سے یہ سواریاں اٹھانے کے بعد اعجاز نے کار لندن کی سڑکوں پر ڈال دی۔ ساؤتھ ہال میں سے گزرتے ہوئے طارق طور نے حیرت سے آنکھیں ملیں اور کہا میں نے اتنے سارے سکھ تو حسن ابدال میں بھی اکھٹے نہیں دیکھے۔ یوں کرتے ہیں کہ انھیں ذرا قریب سے دیکھتے ہیں۔ کیوں نہ کار کہیں کھڑی کر دی جائے میں نے تجویز پیش کی جو کثرت رائے سے منظور کر لی گئی۔ ساؤتھ ہال میں چہل قدمی کرتے ہوئے چند لمحوں کے لئے ہمارے ذہن سے نکل گیا کہ ہم لندن میں ہیں۔ سڑکوں پر ریڑھیاں کھڑی تھیں جن میں ہوزری کا سامان پڑا تھا۔ پان کی دکانیں، اپنی مسند پر چوکڑی مار کر بیٹھا ہوا حلوائی، پٹھورے اور نان چھولے والے، اسکرٹ پہن کر پھرتی ہوئی ہندو لڑکیاں شلوار قمیض میں ملبوس سکھیاں داڑھیوں اور کڑوں والے سکھ، سامنے سے دو کلین شیو نوجوان آ رہے تھے۔ یہ مجھے مونے سکھ لگتے ہیں میں نے کہا۔ میں نے اپنے کانوں سے سنا وہ ہمارے بارے میں یہی ریمارکس دے گئے ہیں۔ طارق طور نے کہا۔ بھارتی لڑکیاں اپنے لباس اور طور اطوار سے پاکستانی لڑکیوں سے الگ طور پر پہچانی جاتی ہیں۔ اعجاز نے اطلاع دی۔ وہ کیسے ؟ حسن نے تفصیل پوچھی۔ بہت آسان ہے۔ اعجاز کی بجائے ابرار ترمذی نے کہا آپ کسی کو چھیڑ کر دیکھیں وہ اپنی گل افشانی گفتار سے سے پہچانی جائیں گی۔ یہ بھی ٹھیک ہے، اعجاز نے ہنستے ہوئے کہا۔ مگر اصل بات یہ ہے وہ اپنے لباس وضع قطع اور روئیے میں بہت ماڈرن ہیں ان میں سے خاص طور پر جو خاندان افریقی ممالک سے ترک وطن کر کے برطانیہ میں آباد ہوئے ہیں ان کے آگے تو انگریز بھی پانی بھرتے ہیں۔ یہ آپ نے پانی بھرنا محض محاورتاً استعمال کیا ہے ؟ طارق طور نے مناسب سمجھا کہ اس امر کی وضاحت ہو جائے۔ اعجاز نے خاموشی اختیار کر لی یہ بات شاید محاورے سے آگے کی تھی۔ شریکوں کی دکان ایک سردار جی کمر کے ساتھ باندھنے والے بٹوے بیچ رہے تھے میں ان کے پاس رک گیا۔ سردار جی یہ بٹوے کیسے ہیں؟ میں نے ایک بٹوا اٹھا کر پوچھا۔ بکواس ہیں جی سردار جی نے صاف گوئی کے اگلے پچھلے ریکارڈ توڑتے ہوئے کہا وہ کیوں ؟ میری ہنسی نکل گئی۔ دیکھیں جی کمر کے ساتھ انہیں باندھنے کا تو مقصد یہ ہے نا کہ یہ جیب کتروں سے محفوظ رہیں تو جیب کترے انہیں بلیڈ سے کاٹ کر بیلٹ سمیت لے جاتے ہیں۔ تو

اس کا مطلب ہے یہ نہیں خریدنے چاہئے۔ پیسے ضائع کرنا ہوں تو خرید لیں۔ میں نے آگے بڑھنے سے پہلے سردار جی کو مخاطب کیا۔ سردار جی ایک بات بتائیں۔ پچھو۔ بادشاہو پچھو۔ "یہ دکان آپ کی اپنی ہے یا شریکو ں کی ہے " ؟ اس پر سردار جی قہقہہ لگا کر بولے دیکھو جی کیسا زمانہ آگیا ہے۔ گاہک سے صاف بات کرو تو وہ آگے سے جگتیں کرتا ہے۔ آپ مجھ سے نہ پوچھتے کہ یہ کیسے ہیں تو میں آپ کے پاس بیچ دیتا۔ آپ نے چب پوچھ ہی لیا تو چند پیسوں کے لئے بچوں کو دھوکا دینا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے نا جی۔

ساؤتھ ہال تیرا کیہ حال اے ہرنام سنگھا؟ ایک بوڑھا سکھ فٹ پاتھ پر "پبوں بھار" بیٹھا ہوا تھا۔ یہ یقیناً سوشل سیکورٹی پر تھا اور اپنا ٹائم پاس کرنے کے رونق بازار دیکھنے گھر سے نکلا ہوا تھا۔ یہ انڈیا میں اگر غریب بھی تھا تو اپنے گاؤں میں بڑا معتبر شخص سمجھا جاتا ہو گا۔ حسن رضوی نے ایک بہت پتے کی بات کہی۔ اسے سیانا سمجھ کر لوگ اس سے مشورہ کرتے ہوں گے۔ گھر میں اس کا حکم چلتا ہو گا اس کے پوتے پوتیاں ساتھ کھیلتے ہوں گے۔ یہ کسی درخت کے نیچے حقہ ڈال کر بیٹھ جاتا ہو گا۔ لوگ اس کے گرد دائرہ بنا کر بیٹھ جاتے ہون گے اس کے ساتھ مذاق بھی کرتے ہوں گے مگر اسے وہاں ایک ایسی خوشی اور بترتی میسر ہو گی جس کا کوئی بدل نہیں۔ اب اس کے بیٹے نے اسے یہاں بلایا ہے۔ یہاں یہ اپنی آنکھوں کے سامنے تمام پرانی قدریں پامال ہوتے دیکھتا ہو گا اور دڑ وٹ جاتا ہو گا۔ بیٹی سے کہتا ہو گا۔ دھیئے سرتے چنی رکھ اور دہی آگے سے کھڑ کھڑ ہنستی ہوئی اپنے ہوائے فرینڈ کی بانہوں میں باہیں ڈال کر گھر کی دہلیز سے باہر نکل جاتی ہو گی آؤ اس سے باتیں کرتے ہیں۔ حسن فٹ پاتھ پر اس کے برابر میں ایڑیوں کے بل بیٹھ گیا۔ بابا جی کیہ حال اے ؟ بابا جی نے اپنی ادھ کھلی آنکھوں کو پوری کھولنے کی کوشش کے دوران حسن پر ایک نظر ڈالی اور کہا گرو دی کرپا اے تیرا کیہ حال اے برنام سنگھا؟ اس پر "برنام سنگھا" ہڑ بڑا کر کھڑا ہو گیا بابا باگل ہو گیا ہے۔ آؤ آگے چلتے ہیں۔ میں نے تمہیں کتنی دفعہ کہا ہے تم یہ ہاتھ میں کڑا نہ پہنا کرو ہنستے ہنستے ہم سب کا برا حال ہو گیا تھا۔ حسن نے ہمیں کھانے جانے والی نظروں سے دیکھا اور ٹیلیفون بوتھ میں گھس گیا۔ آ جاؤ آ جاؤ سارے آ جاؤ حسن نے خوشی سے چیختے ہوئے کہا بوتھ خراب ہے میں نے پاکستان مفت بات کی ہے۔ ابرار نے فوراً بوتھ کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ تمہیں صرف شروع میں ایک پاؤنڈ ڈالنا ہو گا۔ یہ ختم ہی نہیں ہو گا جتنی دیر چاہے بات کرنا۔ ابرار نے فوراً ایک پاؤنڈ کا سکہ فون میں ڈالا مگر ڈائل کرنے کی کوشش کی باوجود فون ڈائل نہ ہوا۔ اس نے ہینڈل کھینچ کر سکہ واپس لینے کی کوشش کی مگر سکہ بھی واپس نہیں آیا۔ یہ تو میرا پاؤنڈ بھی واپس نہیں آ رہا ابرار نے کہا۔ میرا بھی نہیں آیا تھا۔ میں نے تو پہلے ہی بتایا تھا بوتھ خراب ہے۔ اب حسن کے ہنسنے کی باری تھی۔ سردار جی کی بات کا بدلہ ہرنام سنگھ ہم سے لے رہا تھا۔

ساؤتھ ہال شریمتی اور گنڈیریاں طارق ایک کھلونوں کی دکان میں گھس گیا۔ ایک شریمتی جی نے ایک تنگ ٹراؤزر میں گھسنے میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد مور اوور کے طور پر خود کو ایک بیلٹ میں جکڑا ہوا تھا حالانکہ بہت خوشی کے عالم

میں بھی اس جامے سے باہر آنا ممکن نہیں تھا۔ شریمتی جی ماتھے پر بندیا لگائے ابرو کو خنجر بنائے کاؤنٹر کے پیچھے کچھ اس طرح تن کر کھڑی تھیں کہ سی.نہ شمشیر سے باہر تھا دم شمشیر کا میرے خیال میں ان کی مادری زبان پنجابی تھی کیونکہ بقول شخصے مادری زبان وہ ہوتی ہے جو صرف ماں کو آتی ہے چنانچہ وہ طارق کے ساتھ انگریزی میں رواں تھیں۔ کیا چاہئے ؟ انداز ایسے تھا کہ مانگ کیا مانگنا ہے ؟ طارق نے ایک لمحے کے لئے سوچا پھر کیا۔ آپ مجھے پستول دے دیں۔ پستول؟ یہ تو کھلونوں کی دکان ہے۔ تو پھر تین پاؤ گنڈیریاں دے دیں۔ گنڈیریاں تو ختم ہو گئی ہیں۔ شریمتی نے خوشدلی سے کہا۔ آپ یہ باجا لے جائیں پیسے ختم ہو گئے تو کام آئے گا۔ طارق نے ہنستے ہنستے میری طرف دیکھا اور کہا یہ تو مزاح نگار برادری کی رکن لگتی ہے۔ اس میں آپ برادری کے لفظ پر نظر ثانی کریں میں نے کہا ویسے اس کی حس مزاح کو نگخیت آپ نے خود ہی دی تھی۔ وہ کیسے ؟ کھلونوں کی دکان سے پستول مانگ کر اور اس کے بعد گنڈیریوں کی فرمائش کر کے۔ پستول تو میں نے ٹھیک مانگا تھا صرف ناقص العقل ہونے کی وجہ سے شاید اس کا دھیان کہیں اور چلا گیا تھا۔ یہ دیکھیں ان کی ناک کے عین نیچے شوکیس میں پڑا ہوا ہے۔ واقعی وہاں چھرے والا پستول پڑا تھا۔ میں نے باجا نہیں لینا۔ میں نے پستول لینا ہے طارق نے یہ بات کچھ اس طرح کہی کہ شریمتی جی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ لو جی ہسے تے ہے جے طارق نے کہا شریمتی جی جو غالباً پنجابی آتی تھی چنانچہ ان کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی اور انہوں نے دانت بھینچ لئے۔ طارق نے شو کیس میں پڑے پستول کی طرف اشارہ کیا۔ ایک دفعہ پھر شریمتی کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ یہ ندامت کی مسکراہٹ تھی۔ پستول خرید کر نکلے تو طارق نے کہا پستول تو میں نے جرید لی ہے اب مجھے سوچ کر بتائیں کہ میں اس کا کیا کرو کنونکہ میرے بچوں کے پاس ایسی کئی پستولیں ہیں میں نے جیب میں سے بارہ پاؤنڈ نکالے اور طارق کو تھماتے ہوئے کہا یہ آپ مجھے دے دین۔ آپ کیا کریں گے ؟ طارق نے پستول مجھے دیتے ہوئے کہا۔ چھپکلیاں ماروں گا گھر میں ایک چھپکلی مارنے کا دس روپے انعام مقرر ہے۔

برٹش میوزیم میں قاسمی صاحب :اعجاز کے بچے کتے اچھے ہیں۔ کاکی کو دیکھیں، بیٹیوں کی طرح ہماری خدمت کر رہی ہے اسی طرح کاکا اگرچہ کم گو ہے لیکن بہت فرمانبردار ہے، لگتا ہی نہیں کہ یہ بچے لندن میں پیدا ہوئے اور یہیں جمے پلے ہیں طارق طور نے کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ہم لوگ رات کا کھانا سہ پہر کو سات بچے کھا رہے تھے کیونکہ اگر یہاں سورج ڈوبنے کا انتظار کیا جائے تو وہ تو دس بجے کے قریب ڈوبتا ہے چنانچہ اس وقت باہر دھوپ چاندی کی طرح چمک رہی تھی۔ یہ سب تربیت کی بات ہے۔ میں نے کہا۔ اب دیکھ لیں میری اور آپ کی تربیت ٹھیک ہوئی ہے چنانچہ ہم پاکستان میں رہتے ہوئے بھی کتنے اچھے بچے ہیں ؟ یہ کس کے بچوں کی بات ہو رہی ہے ؟ اعجاز پانی کا جگ ہاتھ میں پکڑے کمرے میں داخل ہوا۔ یہ جگ سائز میں کافی بڑا تھا۔ یہ وہ جگ ہے جس کے متعلق شاعروں نے کہا ہے جگ میں آ کر ادھر ادھر دیکھا۔ میں نے اعجاز کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ دراصل سیانوں نے کہا ہے کہ اس قسم کے سوالوں کو اسی طرح نظر انداز کرنا

چاہئے۔ انکل جی آپ کے کچھ فون آئے تھے۔ کالی کی ٹھیٹھ پنجابی مگر برٹش لہجے میں اطلاع دی۔ اس نے کاغذ پر نام بھی نوٹ کئے ہوئے تھے۔ بیٹی مجھے پڑھ کر سنا دو میں کھانے سے نا انصافی کے موڈ میں نہیں تھا۔ کاکی نے اردو فارسی نام اپنے انگریزی ایکسنٹ میں پڑھ کر سنائے تا ہم مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ فون مجاہد ترمذی، بخش لائل پوری،،عاشور کاظمی، باقر نقوی، عبدالرحمن بزمی، پروفیسر شریف بقا، یونس تنویر اور افتخار قیصر کے علاوہ نیو کاسل سے غلام قادر آزاد اور مانچسٹر سے صابر رضا اور برمنگھم سے صفی حسن کے تھے۔

برٹش میوزیم میں اتنے میں فون کی گھنٹی بجی یہ افتخار عارف تھا۔ یار ایک تو لڑکیوں نے بہت تنگ کیا ہوا ہے۔ افتخار فون پر ترنگ میں نظر آ رہا تھا۔ تم ان کے ہاتھوں کیوں تنگ ہوتے ہو؟ میں نے کہا۔ ہمیں کون پوچھتا ہے۔ سب فون تمہارے لئے آ رہے ہیں۔ ان کے بھائیوں کے ہوں گے میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ویسے اس الزام تراشی کا شکریہ۔ عمر کے اس حصے میں اس طرح کے بہتان کو قبول نہ کرنا کفران نعمت کے زمرے میں آتا ہے اور سنو انتظار بھائی کل اوسلو سے واپس آ رہے ہیں۔ اصل میں انتظار حسین کو اوسلو میں لندن یاد آ رہا ہو گا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ لندن آئیں گے تو انہیں لاہور یاد آئے گا۔ لاہور میں انہیں میرٹھ یاد آتا ہے۔ افتخار نے بھر پور قہقہہ لگایا۔ یار کسی کو تو بخش دیا کرو۔ تمہیں پتہ ہے انتظار حسین میرے پسندیدہ افسانے نگار ہیں اور میری ان سے پکی دوستی ہے۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ انتظار بھائی بھی تمہین بہت پسند کرتے ہیں۔ ایک دن بہت محبت سے تمہارا ذکر کر رہے تھے۔ مان لیتا ہوں مگر انہوں نے اپنے افسانوں میں اپنی کسی محبوبہ کا ذکر بھی محبت سے نہیں کیا۔ میں انتظار بھائی تک تمہارے یہ ریمارکس ضرورپہنچاؤں گا۔ افتخار نے زندگی سے بھر پور اپنا مخصوص قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ویسے الطاف گوہر اور مشتاق احمد یوسفی بھی تمہارا پوچھ رہے تھے۔ انہیں میرا بہت بہت سلام کہنا۔ میں پرسوں برمنگھم جا رہا ہوں واپسی پر ان سے ملاقات ہونا چاہئے۔ ، یہ اطلاع ہے یا دھمکی؟ تمہارے لئے تو اطلاع ہے ان شرفاء کے لئے البتہ اس کی حیثیت دھمکی کی ہے۔ ساقی فاروقی سے ملاقات ہوئی؟ سقی سے بھی فی الحال فون پر ہی بات ہو سکی ہے۔ برمنگھم سے واپسی پر انشاء اللہ ساقی سے بھی ملاقات ہو گی۔ مجھے اس کی شاعری بد لحاظ قسم کے تنقیدی مضامین اور دلچسپ شخصیت پسند ہے۔ تمہیں پتہ ہے سقاقے نے میرے ساتھ کتنی زیادتی کی ہے اس کے باوجود میں اسے صاحب مرتبہ معاصر تسلیم کرتا ہوں اور ہاں وہ تمہارا "معاصر" کس مرحلے میں ہے ؟ کتابت ہو رہا ہے۔ سال کے آخر تک شائع ہونے کی امید ہے۔ کون سے سال کے آجر تک ؟ اس کا تعین مشکل ہے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ویسے بھی کل تمہاری طرف آ رہا ہوں تم معاصر کے لئے غزلیں تیار رکھنا۔ طارق طور اور اعجاز کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ میں نے واپس آ کر کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ کیا بات ہے رانگ نمبر تھا؟ طارق طور نے کہا۔ آپ کو کیسے پتہ چلا میں افتخار عارف سے بات کر رہا تھا؟ اس جملے کا جواب جملے کا رخ بدل کر ہی دیا جا سکتا تھا۔ اتنے میں آمنہ بھابی کمرے میں داخل ہوئیں "بھائی جان :آپ نے اتنی لمبی بات کی کہ آپ کا کھانا ٹھنڈا ہو گیا۔ لائیے میں گرم کر کے لاتی ہوں " بھابی برتن اٹھا کر لے گئیں۔ صبح آپ افتخار عارف

کی طرف ہو آئیں،مجھے اعجاز کے ساتھ دو چار جگہوں پر جانا ہے۔ طارق طور نے کہا اور ہاں ایک ضروری بات تو میں نے دو تین روز سے آپ کو بتائی ہی نہیں ؟ وہ کیا؟ یہی کہ لندن میں گرد بالکل نہیں ہے۔ طارق طور کے چہرے پر شرارت آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اعجاز مجھے افتخار کی طرف چھوڑ آیا تھا۔ اس کے ساتھ برٹش میوزیم میں گھومتے ہوئے اسلامی آثار پر مشتمل مختصر سا گوشہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ مسلمانوں نے دنیا میں اتنا کم عرصہ تک حکومت نہیں کی جتنا کہ اس مختصر سے گوشے سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہاں مگر ان کی جگہ لینے والوں نے شاید ان کے آثار تک باقی نہیں رہنے دیئے۔ افتخار عارف نے کہا۔ ویسے آثار میں تو میں اور تم بھی شامل ہیں۔ شاید اغیار کا ہم پر بس نہیں چلا۔ ہمیں اپنے اعمال پر نظر ڈالنے کے بعد اپنے جیسے آثار کے بچ جانے پر خاص حیرت نہیں ہوئی چاہئے۔ افتخار شاید ٹھیک کہتا تھا۔

میں بھی کبھو کسی کا سر پر غرور تھا

برٹش میوزیم کے مختلف حصوں میں گھومتے ہوئے ہم قدیم مصر سے متعلق گوشے کی طرف متوجہ ہوئے، شیشے کے ایک تابوت میں ایک انسانی پنجر پڑا ہوا تھا۔ موصوف کو ذرا پہچاننے کی کوشش کرو اور بتاؤں یہ کون ہے ؟ میں نے لاہور کے ایک شاعر کا نام لیا۔ یہ تمہاری وش فل تھنکنگ ہے۔ اس نے ابھی نہیں مرنا، افتخار نے ہنستے ہوئے کہا۔ یہ پنجر مصر کے ایک فرعون کا ہے میر تقی میر یاد آ گئے۔ کل پاؤں ایک کاسہ سر پر جو آ گیا یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر میں بھی کبھو کسی کا سر پر غرور تھا۔

برٹش میوزیم میں عجائب گھر انسانی تہذیبوں کے قبرستان ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہاں دفن چیزیں انسانی ارتقاء کے بارے میں بہت کچھ بتاتی ہیں تا ہم سب کچھ نہیں بتاتیں۔ آج کے ترقی یافتہ دور کا اندازہ آنے والے دور کے کسی سائنس میوسیم میں رکھے آج کے سائنسی آلات سے ہو گا۔ آج کے دور کے انسان کو رہن سہن میں جو چیزیں میسر آتی ہیں۔ ان کی جھلک بھی کسی میوزیم میں دکھائی دے گی کہ مگر شاید کسی ویت نامی، فلسطینی، کشمیری اور افغانی بچے کو گولیوں سے چھدا ہوا جسم انسان کی ترقی کے اس پہلو کو محفوظ نہیں کر سکے گا۔ ایتھوپیا ور تھل کے قحط زدگان کی نمائندگی بھی کسی میوزیم میں نہیں ہو گی اور صنعتی ترقی نے جن انسانی قدروں کو سسک سسک کر مرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ وہ کسی میوزیم میں محفوظ نہیں ہو سکیں گی، یہ چیزیں کتابوں میں ملیں گی جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملتے ہیں۔ مادام تو ساد کا مومی پتلوں پر مشتمل عجائب گھر انسانی ہاتھوں کی کاریگری کا ایک محیر العقول کارنامہ ہے۔ یہاں دنیا کی مختلف نامور شخصیتوں کے مومی پتلے تیار کر کے رکھے گئے ہیں۔ جنہیں تھوڑے تھوڑے عرصے بعد ہٹا کر ان کی جگہ کسی دوسری

شخصیت پا پتلا رکھ دیا جاتا ہے یہ پتلے ناقابل یقین حد تک اپنے زندہ ہونے کا دھوکا دیتے ہیں۔ برٹش میوزیم کے بعد افتخار کے ساتھ اس عجائب گھر میں گھومتے ہوئے جئی دفعہ یہ شبہ ہوا کہ وہ شخصیت جیتی جاگتی صورت میں میرے سامنے کھڑی ہے۔ گفتگو کے لئے شاید وہ ابھی اپنے لب کھولے گی،اس عجائب گھر میں لنن، شاہ فیصل، ملکہ الزبتھ، پنڈت نہرو، اور دوسری عالمی سیاسی شخصیتوں کے علاوہ نامور کھلاڑیوں موسیقار اور شاعروں کے مومی پتلے موجود ہیں مگر قائد اعظم اور علامہ اقبال کے پتلے نظر نہیں آئے۔ جب کہ قائد اعظم اور اقبال کی عظمت کے بارے میں بغیر کسی احساس کمتری کے انتہائی مبالغہ آمیز بیان بھی دیا جا سکتا ہے کیا اتنے محیر العقول مومی پتلے بنانے والے فنکار بھی اپنے اپنے تعصبات کے اسیر ہوتے ہیں ؟ یا یہ کارنامہ اس عجائب گھر کے منتظمین کا ہے ؟ مجھے اپنے اس سوال کا تسلی بخش جواب نہ مل سکا۔

مادام تو ساد کی ایک "مورت"۔

وہ مومی پتلا نجانے کس لڑکی کا تھا مگر وہ بے حد خوبصورت لڑکی تھی۔ جس کے برابر میں کھڑے ہوتے ہوئے میں نے افتخار عارف کو کیمرہ تھماتے ہوئے تصویر بنانے کے لئے کہا۔ افتخار نے کیمرے کا بٹن دبا دیا۔ تھینک یو لڑکی نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے ایک دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ میں نے ہڑ بڑا کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے میری پریشانی کی نوعیت کا غالباً اندازہ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی جلترنگ آواز میں کہا کوئی بات نہیں میں تھوڑی دیر پہلے ایک مومی پتلے کو زندہ انسان سمجھ کر مخاطب کر چکی ہوں مگر وہ آگے سے بولا نہیں۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ یہ خاتون کسی بے جان مجسمے کو بھی اگر مخاطب کرے تو اس میں زندگی کے آثار پیدا نہ ہوں۔ تھینک یو۔ اس دفعہ میں نے اس گڑیا جیسی لڑکی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے بمشکل یہ دو لفظ زبان سے ادا کئے۔ مجھے کچھ اندازہ سا ہوا کہ اسے دیکھ کر مومی پتلے کی قوت گویائی کیوں سلب ہو گئی تھی۔ مادام تو ساد کے عجائب گھر میں قدیم بادشاہوں کے دور میں سنانوں پر تشدد کے لئے بنائے گئے ٹارچر سیل میں گھومتے ہوئے مجھے لاہور کا شاہی قلعہ دلائی کیمپ اور تھانہ چونا منڈی یاد آ گئے۔ بلکہ مجھے وہ ورکشاپ ہوٹل اور کارخانے بھی یاد آئے جو اپنے سے بھی چھوٹے بھائی بہنوں کے رزق کی تلاش میں آئے ہوئے بچوں کے لئے ٹارچر سیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں زنجیروں میں ں جکڑے ہوئے قیدیوں کے مومی پتلوں کی آنکھوں میں وہ فریاد اور بے کسی تھی کہ زمانے کی گردش کرتی محسوس ہوتی تھی ان کی یہ چیخیں میرے کان میں پگھلائے ہوئے سیسے کی طرح اترتی چلی گئیں اور میں گھبرا کر باہر نکل آیا۔ اور اب ہم نیشنل آرٹ گیلری میں دنیا کے ممتاز مصوروں کی پینٹنگز میں گھرے ہوئے تھے۔ یہاں کلاسیکی مصوروں کی نہایت خوبصورت پینٹنگز دیواروں پر آویزاں تھیں۔ یہ بلاشبہ فن کا اعلی نمونہ تھیں مگر میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں

کہ ان سے بڑے مصور بھی دنیا میں موجود ہوں گے جنہیں کوئی عالمی مقام حاصل نہیں ہ سکا۔

برٹش میوزیم میں فنکار کا پاسپورٹ تجریدی مصوری سے زیادہ میری دل چسپی مصوری کے حقیقت پسند اسکول سے ہے۔ چنانچہ اسی مکتب فکر کی ایک تصوری کے سامنے کھڑے ہو کر میں میں مصور کی لکیروں اور اس کی تفصیلات کے کمال فن میں محو تھا کہ مجھے استاد اللہ بخش یاد آ گئے۔ استاد اللہ بخش کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے ؟ میں نے افتخار عارف سے پوچھا۔ اس فن میں اس کا کوئی جواب نہیں۔ پھر اسے بین الاقوامی سطح پر وہ مقام کیوں نہیں مل سکا۔ جس کا وہ حق دار تھا۔ تحسین فن کے کمال فن کافی نہیں۔ افتخار نے کہا اس کے لئے فن کا پاسپورٹ بھی دیکھا جاتا ہے۔ اس کے نظریات بھی پرکھے جاتے ہیں اور بہت ساری مصلحتیں بھی مد نظر رکھی جاتی ہیں۔ اقبال جیسے شاعر کو نوبل پائز نہیں دیا گیاتھا۔ یہاں سے چلتے ہیں۔ میں نے افتخار سے کہا۔ مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔

پیارے بھائی ایک فاسٹ فوڈ ریستوران میں کھانا کھانے کے بعد میں اور افتخار عارف ٹیوب اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے، افتخار نے اپنے گھر جانا تھا اور میرا ارادہ بخش لائل پوری کی طرف جانے کا تھا کہ بخش سے ملاقات کا وففہ کچھ زیادہ طویل ہو گیا تھا۔ بخش ہانسلوویسٹ کے اسٹیشن پر مجھے "وصول" کرنے کے لئے موجود تھے۔ آپ کا فون جب آیا، اس وقت گاڑی موجود نہیں تھی، میرا خیال تھا تھوڑی دیر تک آ جائے گی مگر شاہد اپنے کسی دوست کے ساتھ غالباً لمبی ڈرائیور پر چلا گیا ہے۔ چلیں اسی بہانے گھر تک تھوڑی سی واک ہی ہو جائے گی۔ ٹیوب اسٹیشن سے گھر تک واک کرتے ہوئے سامنے سے اچانک ایک اٹھارہ انیس برس کا انگریز نوجوان دوسرے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے ہمارے والے فٹ پاتھ پر آ گیا اور اس نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے ہمیں رکنے کے لئے کہا۔ ہم اس کے قریب جا کر رک گئے۔ کیا میں تم سے ایک سوال پوچھ سکتا ہوں۔ اس نوجوان کی آنکھوں میں نفرت تھی،پوچھو میں نے کہا۔ تمہارا تعلق کس ملک سے ہے ؟ میں پاکستانی ہوں۔ اوہ پاکی اس نے پاکستانیوں کے لئے رائج تحقیر آمیز لفظ "پاکی" کے ذریعے اپنی کدورت کا اظہار کیا پھر تو تم یقیناً مسلمان بھی ہوں گے ؟ تمہارا اندازہ درست ہے اور تم کہا کے ہو اس نے بخش سے پوچھا،میں انڈیا کا ہوں بخش نے شرارت آمیز مسکراہٹ سے کہا۔ تم یقیناً سکھ ہو گے نوجوان کی اس مردم شناسی کی داد میں نے ہنسی کے صورت میں دی۔ تم یہاں کیا کرنے آتے ہو؟ کیا تم میری ایک بات کا جواب دینا پسند کرو گے ؟ نوجوان نے ایک ایک لفظ کو چبا کر ادا کرتے ہوئے کہا۔ کیوں نہیں پوچھو میں نے کہا۔ تم لوگ ہمارے ملک میں کیا لینے آتے ہو؟ اس کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں برس رہی تھی۔ لعنت بھیجو جی اس حرامزادے پر بخش نے میرا ہاتھ کھینچتے ہوئے آگے چلنے کے لئے کہا۔ اس کے بعد مجھے گالی نہ دینا مجھے تم لوگوں کی سب گالیاں آتی ہیں۔ نوجوان نے اپنی آستین چڑھاتے ہوئے کہا۔ وہ واضح طور پر ہم سے لڑنے کے موڈ میں تھا بلکہ اس کے عزائم خاصے خطرناک لگتے تھے۔ میں تمام خطرات کے باوجود اس نوجوان سے مکالمے کے موڈ میں تھا مگر بخش نے مجھے وہاں رکنے نہیں دیا

تھوڑی دیر بعد میں بخش کے ڈرائنگ روم میں تھا۔ آج اپنا صدقہ ضرور اتارنا بخش نے کہا اگر ہم تھوڑی دیر مزید وہاں رکتے اور سڑک خالی ہوتی تو پستول کے دو فائر ہونا تھے۔ اس کے بعد اخبار میں دو شاعروں کی وفات کی ایک کالی خبر شائع ہونا تھی اللہ اللہ خیر سلا۔ مگر کیوں ؟ جو پاکستانی اور بھارتی ترک وطن کر کے برطانیہ میں آباد ہوئے، وہ سخت محنت کر کے جو پیسہ کماتے ہیں اس سے جائیدادیں خرید لیتے ہیں جبکہ انگریز تھوڑی بہت محنت کر کے جو پیسہ کماتا ہے وہ اللل تلو ں میں ضائع کر دیتا ہے ہم لوگ یہاں بہترین کاروں میں پھرتے ہیں اور یہ انگریز اپنے ملک میں کنگالوں جیسی زندگی بسر کرتے ہیں چنانچہ ان کے دلوں میں ہمارے لئے شدید نفرت ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس نفرت کے پیچھے بھی معاشی مسئلہ ہے۔ بیشتر اس کے کے بخش اس معاشی مسئلے کے پس منظر اور اس کے حل کے بارے میں اپنا نظریاتی تھیسس پیش کرتے میں نے کوٹ اتار کر صوفے پر رکھا اور خود قالین پر چوکڑی مار کر بیٹھتے ہوئے کہا میں نے آپ کو ایک افسوس ناک خبر سنانا ہے۔ وہ کیا؟ میں آج رات اعجاز کے بجائے آپ کے گھر قیام کروں گا۔ اوئے دل خوش کر دیتا ظالما ویسے سچ مچ کی ایک افسوس ناک خبر تو میں نے آپ کو سنانا ہے۔ وہ کیا؟ مجھے سچ مچ تشویش سی لاحق ہو گئی۔ وہ یہ کہ میں نے گزشتہ دنوں بیس کے قریب تازہ غزلیں کہی ہیں، کچھ نظمیں اس کے علاوہ ہیں۔ میں ابھی بیاض لے کر آتا ہوں۔ آپ اتنی دیر میں کپڑے تبدیل کر لیں۔

پیارے بھائی باقر نقوی کی "حقیقت پسندی"۔ ۔ عاشور کاظمی انجمن ترقی پسند مصنفین انسیٹیٹوٹ آف تھرڈ ورلڈ آرٹ اینڈ لٹریچر کے کرتا دھرتا ہیں۔ اس ادارے کے تحت اردو کی کئی خوبصورت کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ انہیں شاعر اہل بیت ہونے کی سعادت بھی حاصل ہے چنانچہ اپنی غزل گوئی کے باوجود اپنے سلام اور مرسوں کا مجموعہ پہلے شائع کر چکے ہیں۔ غزلوں کے مجموعے کی اشاعت کی نوبت تا حال نہیں آئی "ہارٹ کلب" کے ممبر ہیں چنانچہ ان دنوں ڈاکٹروں کی ہدایت پر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آرام کے موڈ میں ہیں لیکن چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں،چنانچہ صرف کاروبار چھوڑا ہے کاروبار ادب میں پہلے ہی کی طرح دلچسپی لیتے ہیں باقر نقوی برطانیہ میں عاشور کاظمی کے معتمد ترین ساتھی ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ "تازہ ہوا" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ میں پوری دیانتداری سے محسوس کر تا ہوں کہ ان کی غزل اپنے رنگ میں بے مثال ہے۔ تاہم اتنے شریف اور حقیقت پسند آدمی ہیں کہ کسی گندے سے لطیفے کو صحیح تصور کر کے پہلے ذہن میں اس کی تصویر بناتے ہیں اور پھر ہنسنے کی بجائے شرمانے لگتے ہیں۔ بخش لائل پوری اور عاشور کاظمی میں بھی دوستی ہے مگر یہ دوستی کچھ ایسی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو چاقو سے گد گدیاں کرتے رہتے ہیں دونوں ایک ہی تنظیم کے عہدیدار ہیں مگر دونوں نے تنظیم کو اس کے مختلف کناروں سے پکڑا ہوا ہے۔ اس وقت بھی دونوں ایک دوسرے سے ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ میں مشغول تھے اور حسن دونوں کو بار ی باری "اشکل" دینے میں مشغول تھا۔ تھوڑی دیر بعد بخش میری خواہش پر مجھے عاشور کی طرف چھوڑ کر واپس گھر کی طرف روانہ ہو گئے کہ میں حسن کے وہم کی وجہ سے آج یہیں رہنا چاہتا ہوں۔

پیارے بھائی عجیب بے ہودہ آدمی ہے حسن رضوی کی آنکھوں میں اب نیند اتر رہی تھی اور وہ سونا چاہتا تھا چنانچہ عاشور اور بھابی خدا حافظ کہہ کر کمرے سے چلے گئے۔ خوشبو اور بتول کے سو جانے اور اب عاشور اور بھابی کے چلے جانے سے مجھے ایک عجیب سی فیلنگ ہوئی۔ تھوڑی دیر پہلے ہم گھر میں تھے اب ہاسٹل میں ہیں۔ میں نے سوچا اور اس کے ساتھ ہی کمبل تان کر بستر پر لیٹ گیا۔ میں ابھی غنودگی کے عالم میں تھا کہ حسن بستر سے اٹھا اس نے کمرے کی بتی جلائی اور آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر آنکھوں کے پپوٹے اٹھا کر دیکھنے لگا۔ گولی کا اثر شاید ختم ہو گیا تھا۔ میں بستر سے باہر نکلا اور کہا تمہاری آنکھیں تو واقعی ہلدی کی طرح زرد ہو رہی ہیں۔ ہو رہیں ہیں نا؟ بخار بھی ہے میں نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ہے نا؟ لگتا ہے جسم بھی ٹوٹ رہا ہے ٹوٹ رہا ہے نا؟ مالیخولیا بھی ہے۔ یار پھر وہی بکواس تم عجیب دوست ہو میری حالت کا مذاق اڑاتے ہو میں سامان باندھنے لگا ہوں صبح پاکستان جانا ہے۔ تمہاری تشویش ناک حالت کے پیش نظر لگتا ہے سامان بعد میں ہی آئے گا۔ یار آدمی کی شکل بری ہو تو بات تو اچھی کرے مجھے اب تریلیاں بھی آ رہی ہیں۔ تمہاری ایسی تیسی میں دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی "انسان بن جاؤ ورنہ گلا دبا دوں گا۔ یار مجھے چھوڑ دو مجھ سے چھڑایا نہیں جا رہا۔ حسن نے ہولے سے کہا میں نے اس کی طرف دیکھا وہ بہت کمزور لگ رہا تھا۔ اب میں فکر مند ہوا پھر صبح کے چار بجے جتنی نفسیات میں نے پڑھی تھی اسے حوصلہ دینے کے لئے سب اس پر آزما ڈالی کہ میں جانتا تھا اسے کوئی جسمانی تکلیف نہیں۔ میں نے اسے ایک والیم دی گرم دودھ کا ایک کپ پلایا اور پھر اسے کوئی ساڑھے چار کے قریب میں نے دیکھا کہ وہ نارمل محسوس کر رہا ہے پھر تھوڑی دیر بعد وہ گہری نیند سو گیا اس کے چہرے پر سکون کیفیت تھی عجیب بیہودہ آدمی ہے۔ صبح گیارہ بجے کے قریب آنکھ کھلی تو ہم دونوں ہاسٹل سے گھر میں منتقل ہو گئے کہ بھابی ناشتہ بنا کر کمرے میں ہی لے آئی تھی عاشور ہمارے لئے چائے بنا رہے تھے۔ "خوشبو اور بتول کہا ہیں " گھر کے لوازمات پورے ہونا چاہئیں تھے۔ وہ تو اسکول گئی ہیں۔ بھابی نے کہا ویسے وہ حسن بھائی سے بہت مانوس ہیں۔ "اصل میں بچے بچوں ہی میں خوش رہتے ہیں " عاشور نے حسن پر فقرہ اچھالا حسن مسکرا کر خاموش ہو گیا موصوف رات والی صورت حال پر کچھ شرمسار سے لگتے تھے۔ حسن بھائی آپ نے تو ڈرا ہی دیا تھا۔ بھابی نے کہا۔ ڈرایا تو اس نے مجھے آپ لوگوں کے جانے کے بعد ہے،میں نے بتایا۔ کیا مطلب ؟ عتیقہ بھابی نے پوچھا۔ ایسے ہی جھوٹ بول رہا ہے میں تو آپ لوگوں کے جاتے ہی سو گیا تھا اس وقت کا سویا ہوا اب اٹھا ہوں۔ حسن نے آنکھوں ہی آنکھوں میں التجا کی کہ میں خاموش رہوں۔ تم ٹھیک کہتے ہو میں نے کہا مگر یہ بتاؤں آج کا کیا پروگرام ہے برمنگھم جانا ہے کہ پاکستان جانا ہے ؟ برمنگھم وہاں کیا ہے ؟ حسن نے پوچھا والیم کا اثر زیادہ ہی ہو گیا تھا۔ وہاں وہ مشاعرہ ہے جس کے لئے امجد اسلام امجد، خالد احمد اور تمہیں خاص طور پر پاکستان سے بلایا گیا ہے۔ یار میں تو بھول ہی گیا تھا اعجاز تو گھر پر انتظار کر رہا ہو گا۔ تو کیا ارادے ہیں۔ عاشور بھائی سے کہتے ہیں وہ ہمیں اعجاز کی طرف چھوڑ دیں۔

برمنگھم براستہ آکسفورڈ تھوڑی دیر بعد ہم اعجاز کی طرح تھے وہاں ابرار ترمذی، ارشد لطیف اور اطہر راز ہمارے منتظر تھے۔ اعجاز کی اسٹیشن ویگن میں ہم "اہل خانہ" یعنی اعجاز طارق طور حسن رضوی اور میرے سمیت سات آدمی با آسانی سما گئے۔ باقر نقوی کی کار میں عاشور کاظمی اور رشید منظر سوار تھے افتخار عارف اور ظہور نیازی دوسری کار میں تھے۔ ہمارا ارادہ رستے میں پکنک کا تھا چنانچہ ہم ہائی وے کی بجائے مختلف قصبوں اور شہروں میں سے ہوتے ہوئے برمنگھم پہنچے آکسفورڈ میں ہم نے دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کے کنارے بیٹھ کر لنچ کیا اور متفقہ طور پر اسی کو پکنک قرار دیا۔ ہمراہیوں میں سے اطہر راز کا بیان تفصیل طلب ہے تاہم یہاں ان کا مختصر احوال بیان کرنا ضروری ہے۔ ہمارا یہ ہم سفر حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کے اس قول کی روشنی میں بہترین انسان قرار پایا ہے کہ کسی شخص کی اصل پہچان سفر میں ہوتی ہے۔ اطہر راز لحیم شحیم انسان ہیں میرے خیال میں ان کا دل ان کے جثے کے مطابق ہے یعنی خاصا بڑا ہے۔ دوستوں کے لئے ہر تکلیف وہ خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں ان کے تندو تیز جملوں کو مسکرا کر ٹال دیتے ہیں اور ان کی اس عادت کی وجہ سے ہر کوئی ان پر چڑھائی کی کوشش کرتا ہے۔ انتہائی ایثار پیشہ ہیں خود کو تکلیف میں ڈال کر دوسروں کے لئے آسانیاں پیدا کرتے ہیں کھانے پینے کے بے حد شوقین ہیں چنانچہ دوران سفر ایک جیب میں ہاتھ ڈالتے تو بسکٹ نکال لیتے۔ دوسری جیب میں ہاتھ ڈالتے تو خشک میوہ بر آمد ہوتا خود کھانے کی نوبت کم آتی دوسروں کو کھلاتے اور خوش ہوتے سچی بات کہنے سے نہیں ٹلتے لیکن جب اس کا نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے تو پریشان ہو جاتے ہیں۔ تاہم اگلی مرتبہ پھر وہی کہتے ہیں جسے وہ حق سمجھتے ہو،سنجیدہ غزل بھی کہتے ہیں اور طنز و مزاح پر بھی ہاتھ صاف کرتے رہتے ہیں۔ ابرار ترمذی نے اپنی نوکیلی باتوں سے ان کو اتنا زچ کیا کہ کوئی اور ہوتا تو گتھم گتھا ہو جاتا بلکہ اطہر راز ایسا لحیم شحیم انسان تو ابرار ترمذی ایسے دانشورانہ جسم کے مالک شخص کو با آسانی ایک ہاتھ میں اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک سکتا تھا مگر وہ ابرار کو بھی اپنی مسکراہٹوں کی مار ہی مارتے رہے ویسے ابرار نے اطہر راز کے حوالے سے ایک مزید اور بات کہی کی میں نے تو ان سے تو دوستی اس لئے کی تھی کہ کبھی لڑائی وڑائی میں کام آئیں گے مگر جب کبھی ایسا موقع آتا ہے یہ موقع پاتے ہی میدان سے فرار ہو جاتے ہیں۔

برمنگھم یونیورسٹی کی حدود میں داخل ہوتے ہی شلواریں، ساڑھیاں اور شیروانیاں نظر آنا شروع ہو گئیں یہ مشاعرے کے سامعین تھے جوق در جوق مشاعرہ سننے کے لئے چلے آ رہے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ وہ ٹربیونل تھا جس کے سامنے ہم پیش ہونے کے لئے جا رہے تھے۔ اعجاز نے یونیورسٹی کے پارکنگ ایریا میں کار پارک کی تو ڈاکٹر صفی حسن سفید پاجامے گیروی رنگ کے سلکی کرتے میں ملبوس اسٹائلس انداز میں چارد اوڑھے اور ڈارک شیشوں کی عینک پہنے بے تابی سے ہماری طرف بڑھے۔ ارے بھائی بہت دیر کر دی۔ انہوں نے سب سے جلدی جلدی ادھا کچا معانقہ کرتے ہوے کہا۔ ہال میں لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ باقی باتیں مشاعرے کے بعد ہوں گی۔ آئیں چلیں۔ ہال میں امجد اسلام ایک گوشے میں خالد احمد مکرم اور بھابی کے ساتھ بیٹھا آنکھیں نکال کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ کہا مر گئے تھے پریشان کر

دیا چار دفعہ لندن فون کر چکا ہوں ہسپتالوں سے بھی پتہ کیا ہے۔ نرسو ں سے بھی پوچھا، خالد احمد نے لقمہ دیا۔ امجد، بھابی اور خالد احمد ڈاکٹر صفی حسن کے ساتھ سیدھا برمنگھم آگیا تھا۔ تم لوگوں کو ایک ہفتے کے بعد دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، میں نے محبت سے مغلوب لہجے میں کہا۔ تمہارا مطلب یہ ہے کہ آئندہ ہمیں متواتر دیکھ کر تمہی خوشی نہیں ہو گی۔ تار تم ہمیں دیکھ کر خوشی ہونے کے لئے ہفتے کا وقفہ کچھ کم نہیں کر سکتے ؟ خالد احمد کو میرے مہمل جملے سے موقع مل گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مشاعرہ شروع ہو گیا ورنہ خالد کو چپ کرانا مشکل تھا۔ مشاعرے کی صدارت ممتاز اداکار صداکار اور عمدہ ادبی ذوق کے حامل ضیاء محی الدین نے کرنا تھی۔ لیکن وہ عین موقع پر پاکستان چلے گئے۔ ان کی جگہ صدارت کے فرائض افتخار عارف نے انجام دیئے جبکہ عاشور کاظمی کو مہمان خصوصی بنایا گیا۔ تھوڑی دیر بعد عاشور کاظمی طبعیت کی خرابی یا صحبت ہم نشین کی وجہ سے اسٹیج سے اتر باہر چلے گئے اور پھر پتہ وہ مشاعرے میں شرکت سے بچنے کے لئے واپس لندن چلے گئے ہیں۔ لڑائی جھگڑے پاکستان میں بھی بہت ہیں مگر برطانیہ میں ان کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ گالی گلوچ اور مار کٹائی تک بھی نوبت پہنچ جاتی ہے۔

برمنگھم براستہ آکسفورڈ "مشاعرہ " تو دل ناتواں نے خوب کیا ہال سا معین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ان میں سے تین چار با ذوق سکھ اور ہندو حضرات کے علاوہ باقی تمام پاکستانی سامعین تھے جن کی بے پناہ داد سے مشاعرہ خوب جما۔ اسٹیج سیکریٹری خوبرو نوجوان عباس ملک تھے۔ جن سے برس ہا برس پیشتر واہ کینٹ کے ایک مشاعرہ ہی میں ملاقات ہوئی تھی۔ اور وہ مشاعرہ اپنے طور پر ایک یادگار مشاعرہ تھا۔ واہ اسٹیڈیم میں منعقد ہونے والے اس مشاعرے میں شعراء اور سامعین کے درمیان اتنا زیادہ فاصلہ تھا کہ درمیانی حصے میں بیس پچیس کے قریب مزدور حضرات چادریں منہ پر لئے گہری نیند سو رہے تھے۔ اس مشاعرے میں کچھ شاعر بھی ایسے تھے کن ان کے کلام اور سوئے ہوئے لوگوں کے خراٹوں کے مابین یہ فیصلہ مشکل ہو رہا تھا کہ دونوں میں روم کس میں زیادہ ہے۔ واہ کینٹ کے اس مشاعرے کے اسٹیج سیکریٹری اس سے قبل صرف کبڈی کے میچوں کی کمنٹری کرتے رہے تھے۔ مشاعرے کی نظامت ایمرجنسی حالات میں ان کے سپرد ہوئی تھی چنانچہ ان کا شاعروں کو بلانے کا اندازہ بھی "ہٹ کو ڈی کوڈی کوڈی" جیسا تھا۔ برمنگھم میں عباس ملک اور میں واہ کینٹ کے اس تاریخی مشاعرے کو یاد کر کے کافی دیر تک ہنستے رہے۔ اس مشاعرے میں پاکستان سے بطور خاص مدعو کئے گئے شعراء کے علاوہ برمنگھم اور برطانیہ کے مختلف شہروں سے آئے ہوئے شاعر وں نے بھی اپنا کلام سنایا۔ ڈاکٹر صفی حسن تو خاصے کرانک قسم کے شاعر ہیں کہ ان کا کلام گزشتہ برس ہا برس سے پاکستان کے موقر ترین ادبی جرائد میں شائع ہو رہا ہے۔ اب کچھ عرصے سے ان کی بیگم یعنی ہماری بھابی طاہرہ بھی شاعری کی طرف مائل ہوئی ہیں۔ بلکہ اتنی مائل ہوئی ہیں کہ لگتا ہے کے لٹیں نکا ل رہیں ہیں۔ انہوں نے بہت کم عرصے میں مقدار اور معیار کے لحاظ سے خاصی مقبول غزلیں کہی ہیں۔ ان شعراء کے علاوہ یہاں جن شعراء نے اپنا کلام سنایا ان میں رشید منظر، اکبر حیدر آبادی، باقر نقوی، اطہر راز، سید عطا جالندھری، سرمد بخاری، سعید اختر درانی،یوسف مر،

جاگیر سنگھ چوہان، محترمہ یاسمین حبیب، محترمہ طلعت سلیم، اعجاز احمد اعجاز، ارشد لطیف، صداقت حسین سوز، نسیم چوہدری، آدم چغتائی، محمد عارف اور رشید احمد دیوانہ شامل تھے۔ مشاعرے کی "کھڑکی توڑ" کامیابی کو دیکھ کر منتظمین مشاعرہ ڈاکٹر علی حسن،ڈاکٹر سعید اختر درانی، جناب تصدق حسنی، جناب سلیم جاوید اور جناب داور توفیق نہال ہو رہے تھے۔ ایک اداس کر دینے والا خیال مگر ٹھیک انہی لمحوں میں ایک انتہائی اداس کر دینے والے خیال نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں نے سوچا کہ پچاس برس بعد جب اس مشاعرے کے سامعین میں سے بیشتر اپنی فعال زندگی گزار چکے ہوں گے اور ان کی جگہ اردو سے بے بہرہ ان کی آئندہ نسلیں لے چکیں ہون گی اس وقت برطانیہ کی فضائیں ہمارے کلچر کے ان خوبصورت مظاہرے سے محروم ہو جائیں گی مجھے یہ امید بھی کم نظر آتی ہے۔ کہ اس دوران پاکستان سے یورپ اور امریکہ آنے والوں کا سلسلہ یونہی جاری رہے گا۔ ایک تو اس لئے کہ ان ممالک میں پہلے ہی "ہاؤس فل کا بورڈ" لگایا جا چکا ہے اور غیر ملکیوں کی آمد پر پابندیاں سخت سے سخت ہوتی جا رہی ہیں۔ اور دوسرے اس لئے کہ مجھے اس امر کا سو فیصد یقین ہے کہ ہمارا پاکستان آنے والے زمانے میں ایک بڑے مثبت انقلاب سے دو چار ہو گا جس کے نتیجے میں ہماری زندگی کے تمام شعبو ں میں انتہائی اہمیت کی حامل تبدیلیاں آئیں گی۔ سلطانی و ملائی و پیری کا خاتمہ ہو گا۔ جاگیرداری نظام سسک سسک کر مر جائے گا۔ اسلامی اصولوں کی روشنی میں ہر فرد بشر کو انصاف ملے گا۔ اس کی زندگی کی تمام ضرورتیں پوری ہوں گی۔ اور موجود زمانے کی تمام آسائشیں بھی اسے میسر آئیں گی اور اس کے ساتھ ساتھ ہم انشاء اللہ ایک کمپرومائز کے ساتھ ہی سہی مگر اپنی قدریں بھی برقرار رکھیں گے۔ چنانچہ آنے والے دنوں میں پاکستانی آسائشوں کی تلاش میں دنیا کے قدروں اور اپنی آنے والی نسلوں کے دین ایمان اور کلچر کے تحفظ کے لئے پریشان ہونا نہیں پڑے گا۔ بلکہ جس طرح یورپین سیاح ہمارے ملک میں آتے ہیں اسی طرح ہمارے پاکستانی بطور سیاح امریکہ اور یورپ کے ملکوں میں گھوما کریں گے۔ مگر انہیں یہاں اس اپنائیت کا احساس نہیں ہو گا جو ان دنوں اپنے ڈھیر سارے لوگوں کی پر جوش اور بے پایاں محبت سے ہوتا ہے۔ یہاں سے نکلنے والے اردو کے اخبارات بند ہو چکے ہوں گے شعری محفلیں اجڑ چکی ہوں گیا اور خاکم بدہن بہت سی مسجدیں کلب میں تبدیل ہوں جائیں گی۔ یہاں بزرگ نسل کے جن لوگوں سے ملاقات ہو گی وہ اپنے گھروں میں خاندان کے بزرگ کی حیثیت سے نہیں اولڈ پیپلز ہوم میں اپنی زندگی کے بقیہ دن گزار رہے ہوں گے جہاں انہیں اپنے بیٹے کی طرف سے عید یا خدانخواستہ کرسمس کے موقع پر تہنیتی کارڈ موصول ہو گا۔ پچاس سال بعد کے جن اندیشوں کا میں نے ذکر کیا ہے برطانیہ میں اسلام اور پاکستان کے لئے بے پناہ کام کرنے والے اداروں کے سرگرم رکن میری اس کھینچی ہوئی تصویر سے متفق نہیں ہوں گے۔ کیونکہ ان کے خیال میں یورپ کا آئندہ مذہب اسلام ہے مگر میں ان سے متفق نہیں ہوں۔ آپ یورپ اور امریکہ میں پلنے والی زیادہ سے زیادہ ایک نسل کو اپنے قومی اور ملی دھارے کے ساتھ وابستہ رکھ سکتے ہیں اس سے اگلی نسل نے منشیات چھوڑ کر اپنے قومی دھارے کے ساتھ وابستہ ہونا ہی ہونا ہے۔

برمنگھم براستہ آکسفورڈ ہمیں تو اپنے ماجھے گامے اچھے لگتے ہیں یہی وہ ڈراؤنا خواب تھا جس ۱۹۸۷ء میں امریکہ کے تفصیلی دورے سے واپسی پر مجھ سے ایک غزل لکھوائی تھی۔ میں نے یہ غزل برمنگھم کے اس مشاعرے میں بھی پڑھی۔ گھر کو جانے والے رستے اچھے لگتے ہیں جیسے دل کو درد پرانے اچھے لگتے ہیں پھول نگر میں رہنے والوں آ کر دیکھو تو اپنے گھر کے کانٹے کتنے اچھے لگتے ہیں تم جو نہیں ہو راتیں لمبی ہوتیں ہیں آ بھی جاؤ ساتھ تمہارے اچھے لگتے ہیں آ بھی جاؤ ماں نے ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا آ بھی جاؤ ماں کو بیٹے اچھے لگتے ہیں ولیم،پیٹر، ڈکسن تھامس،ہیری سے کیا لینا ہمیں تو اپنے ماجھے گامے اچھے لگتے ہیں بعد میں یہی غزل میں نے مانچسٹر، برمنگھم، بریڈ فورڈ، گلاسگو، لندن، کوپن ہیگن اور اوسلو کے مشاعروں میں بھی سنائی۔ اور مجھے پاکستانی سامعین کی بے پناہ تحسین سے لگا کہ یہ ان کے دل کی آواز ہے مگر میں جانتا ہوں کہ اس دل کی آواز پر لبیک کہنے میں کس قدر دشواریاں ہیں کیونکہ ۱۹۷۰ء میں امریکہ کے گرین کارڈ اور اس ے وابستہ دشواریوں کا ذاتی طور پر اندازہ ہو چکا ہے۔ بہر حال سنا ہے خوابوں کی تعبیر الٹی ہوتی ہے۔ میری دعا ہے کہ اوپر کی سطروں میں جو ڈراؤنا خواب میں نے آپ کو سنایا ہے اس کی تعبیر بھی الٹر نکلے۔

برمنگھم براستہ آکسفورڈ دوستوں کے درمیان مشاعرے کے اختتام پر خواتین نے ابرار ترمذی کو گھیر لیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا ابراز ترمذی خواتین میں اس قدر مقبول ہے میں نے طارق طور سے کہا۔ مجھے خود اندازہ نہیں تھا۔ طارق طور نے جواب دیا۔ البتہ مشاعرے کے دوران اس وقت کچھ احساس ضرور ہوا جب میں نے خواتین کو ہر پانچ منٹ بعد ابرار ترمذی کو مخاطب کرتے دیکھا۔ وہ ابرار سے کیا کہتی تھی ؟ میں نے پوچھا کچھ نہیں طارق نے جواب دیا۔ بس یہی کہتی تھیں کہ آپ مہربانی کر کے خاموشی سے نہیں بیٹھ سکتے ؟ طارق سے گفتگو کے دوران اچانک نظر ایک انتہائی مانوس چہرے پر گئی۔ ہیں یہ تو اپنے پروفیسر ایم اے ملک ہیں۔ پاکستان کے ممتاز دست شناس جن کی بعض پیش گوئیاں حیرت انگیز بلکہ ناقابل یقین حد تک درست ثابت ہو چکی ہیں۔ ملک صاحب آپ کہاں؟ میں نے ان سے بھر پور معانقہ کرتے ہوئے پوچھا۔ میں تو دو ماہ سے برطانیہ میں ہوں۔ آیا تو چند دنوں کے لئے تھا مگر یہاں احباب کی محبت نے پاؤں میں زنجیر ڈالی ہوئی ہے۔ اتنے میں پاکستانی دوستوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ میں ان سے ملنے کا تمنائی تھا ور وہ مجھ سے ملاقات کے خواہاں تھے ان میں داور توفیق بھی تھے۔ انجمن ترقی اردو برمنگھم کے جنرل سیکریٹری ان میں ایک عجیب طرح کی دوستانہ خوشبو تھی۔ جب پاکستان جائیں تو شعیب نظامی اور عارف نظامی کو میرا سلام کہیں شعیب کے ساتھ میری دوستی بہت پرانی ہے۔ یعنی داور توفیق کے ساتھ ایک مشترکہ محبت کا رشتہ بھی نکل آیا۔ لمبے تڑنگے عطا جالندھری سے بھی جو قادر الکلام شاعر ہیں مشاعرے کے اختتام پر دوستوں کے اس ہجوم ہی میں ملاقات ہوئی۔ برطانیہ کے اس استاد شاعر سے گزشتہ برس بھی غالباً بریڈفورد میں ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے متعدد شعراء کے ذوق سخن کی آبیاری کی ہے۔ ڈاکٹر سعید اختر درانی اپنی خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ اپنے بازو میرے لئے وا کئے کھڑے تھے۔ ان کا شمار برطانیہ میں مقیم پاکستان کے ممتاز

ترین شعراء میں ہوتا ہے۔ اور اب کچھ عرصے سے وہ ماہر اقبالیات کے طور پر بھی مشہور ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ماڈل ٹاؤن لاہور کے حوالے سے میرے گرائیں ہیں۔ ان کے والد ماجد اور مربے واجد ماجد دوستی اور محبت کے انتہائی مضبوط بندھن میں بندھے ہوئے تھے۔ ابھی احباب سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ حسن میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گیا اور مجھے ایک لم سلمے شخص کے سامنے کھڑا کر دیا۔ جس کے سر کے بال اٹینشن فوجیوں کی طرح کھڑے تھے۔ یہ جاگیر سنکھ چوہان ہے۔ صحافی ہے۔ شاعر ہے میرا یار ہے۔ حسن نے تعارف کرایا۔ جاگیر سنکھ چوہان نہیں جے ایس چوہان کہو میں کسی مذبب و زہب میں یقین نہیں رکھتا، جاگیر سنگھ سے مذہبی وابستگی کی بو آتی ہے عجیب منہ پھٹ آدمی ہے۔ میں نے سوچا۔ میرا یہ اندازہ بعد میں بھی درست ثابت ہوا کیونکہ اس کھردرے سے شخص سے مسلسل پانچ روز تک پے درپے ملاقاتیں رہیں۔ جو حامل قیام برمنگھم تھیں۔ اور ان سے ملو حسن رضوی نے برابر میں کھڑی ایک خاتون سے تعارف کراتے ہوئے کہا یہ یاسمین حبیب ہیں،پاکستان میں ان کے خاندان سے ہمارے دیرینہ تعلقات ہیں۔ مشاعرے میں ان کی غزل سے تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ یہ کتنی خوبصورت شاعرہ ہیں۔ یہ اندازہ تو مجھے واقعی ہو گیا تھا۔ مگر حسن رضوی کے بارے میں مجھے گمان نہیں تھا کہ وہ مشاعروں ہی میں نہیں تعارف کرانے کے ضمن میں بھی تقدیم و تاخیر کی نزاکتوں سے بے خبر ہے۔

جون کے فلیٹ پر مشاعرہ گاہ میں پاکستانی احباب سے گپ شپ کے بعد ایک اسی طرح کا "سیشن " صفی حسن کے گھر پر ہوا۔ اس کے بعد برمنگھم کے ایک ریستوران میں شعراء اور دیگر معززین شہر کے اعزاز میں ایک ڈنر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مگر اس سے پہلے شعراء کو ان کے ٹھکانوں پر پہنچانا ضروری تھا بلکہ ٹھکانے لگانا ضروری تھا۔ برمنگھم یونیورسٹی ہی کے ایک خوبصورت ترین گوشے میں ایک امریکی مسٹر جون جو مکرم سید کا دوست ہے کا زندگی کی تمام سہولتوں بلکہ آسائشوں سے مزین نہایت نفیس فلیٹ ہمارا منتظر تھا۔ جان شہر سے باہر تھا۔ اور خالد، حسن، طارق اور میں فلیٹ کے اندر تھے۔ اس فلیٹ میں ہم نے جو پانچ روز بسر کئے وہ شاید ہماری زندگی کے ناقابل فراموش دن ہیں۔ امجد چھڑوں کی اس منڈلی سے محروم رہا کیونکہ ہماری فردوس بھابی اس کے ساتھ تھیں۔ چنانچہ یہ میاں بیوی ڈاکٹر صفی حسن کے گھر خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کرتے رہے۔ صفی حسن پانچ روز کے لئے "اناج " کا ذخیرہ چھوڑ گیا تھا۔ کیونکہ چھٹے دن ہمیں یہاں سے بریڈ فورڈ کے مشاعرے میں شرکت کے لئے روانہ ہونا تھا۔ لندن سے ساتھ آئے ہوئے دوستوں کو ہم نے صفی حسن کے گھر سے ہی الوداع کہہ دیا تھا انہیں وہاں سے ڈنر میں جانا تھا۔ اور ہمارا ارادہ ڈنر میں نہ جانے کا تھا۔ چار کا ٹولہ اپنے اپنے کمروں پر "قبضہ" مکمل کرنے کے بعد یہ "چار کا ٹولہ" ٹی وی لاؤنج میں جمع ہوا۔ اب کیا کیا جائے ؟ طارق طور نے سوال کیا۔ صبر کیا جائے میں نے جواب دیا۔ ویسے فی الحال آپ میں سے چائے کون بنائے گا؟ آپ طارق نے مسرت سے اچھل کر یوں کہا جیسے مجھے کوئی اعزاز دیا جا رہا ہو۔ منظور ہے۔ میں نے کہا مگر اسے پی کر کون دکھائے گا؟ ایک لمحہ "محاذ" پر خاموشی رہی۔ تم بناؤں تو سہی۔ کچھ دیر بعد حسن کی آواز آئی۔

کوڑا گھٹ کر لیں گے۔ میں نے باورچی خانے میں چائے تیار کرتے ہوئے آواز لگائی۔ بھوک لگ رہی ہے کھانا پکانے کی تیاری بھی شروع کر دینا چاہئے۔ بالکل ٹھیک ہے پنچوں نے میری رائے پر صاد کیا۔ تھوڑی دیر بعد حسن رضوی پیاز چھیل رہا تھا۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ طارق طور مسٹر جان کے برتنوں کو دھو کر مشرف بہ اسلام کرنے میں مشغول تھا۔ کچھ دیر بعد چائے تیار ہو گئی۔ میں نے ٹی وی لاؤنج میں برتن میز پر سجائے اور آواز دی۔ چائے تیار ہے نوش فرمائیے۔ ابھی طارق طور نے ایک گھونٹ لیا تھا کہ اسے اچھو آگیا۔ قاسمی صاحب یہ آپ نے کیا چیز بنائی ہے ؟ طارق نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ کیو کیا ہوا؟ آپ پی کر تو دیکھیں۔ میں نے کپ منہ کو لگایا تو یوں لگا جیسے کونین کی دو گولیاں منہ میں آ گئی ہوں۔ لگتا ہے تم نے چائے کی پتی کی بجائے کوئی اور چیز ڈال دی ہے ایک گھونٹ حسن نے بھی چکھ لیا تھا اور اب وہ خیال آرائی کر رہا تھا۔ میں باورچی خانے میں گیا اور چائے کی پتی کا ڈبہ اٹھا لایا۔ طارق نے ڈھکنا کھولا اور پریشان سا ہو گیا۔ آپ نے یہی چیز ڈالی تھی؟ ہاں۔ یہ چائے نہیں ہے۔ طارق نے کہا۔ سونگھ کر دیکھیں۔ میں سونگھا تو ہرمل جیسی کوئی چیز تھی۔ یہ اگر چائے نہیں تو پھر کیا ہے ؟ میں نے طارق سے پوچھا۔ یہ تو مجھے بھی پتا نہیں۔ اتنے میں کمرے میں کچھ دھواں سا پھیل گیا۔ ڈبہ بند کریں حسن نے چیخ کر کہا ڈبے میں سے جن نکل رہا ہے۔ حسن کے اس "مخول" پر کسی نے توجہ نہ دی مگر تھوڑی دیر بعد کسی چیز کے جلنے کی بو اور دھواں کمرے میں پوری طرح پھیل گیا۔ طارق طور نے باورچی خانے میں چھلانگ لگا دی اور پھر "شوں " کی آواز آئی جیسے کسی گرم برتن میں ٹھنڈا پانی پھینکا گیا ہو۔ خیریت تو تھی۔ طارق سے اس کی باورچی خانے سے بحفاظت واپسی پر میں نے پوچھا۔ بس یہی سمجھیں۔ طارق نے کہا۔ آپ نے چائے کیتلی میں ڈال دی تھی۔ اور چائے والا خالی برتن چولھے پر چھوڑ آئے تھے۔ بس اس برتن کا پیندہ جل گیا ہے۔ اب چائے بنانے کے لئے کل کوئی برتن خریدنا پڑے گا۔ بلکہ چائے بھی خریدنا ہو گی۔ جو چیز ہمارے سامنے دھری ہے،اسے چائے تو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ حسن نے کہا۔

جون کے فلیٹ پر قہقہے لگاتا ہوا جن یہ خالد کہاں چلا گیا ہے ؟ اچانک مجھے یاد آیا کہ وہ تو گذشتہ ڈیڑھ گھنٹے سے غائب ہے۔ لاحول ولا قوۃ طارق نے کہا، تھکن سے اتنا برا حال کیا ہوا ہے کہ ہمیں اپنے ایک ساتھی کی عدم موجودگی کا احساس ہی نہیں ہوا۔ حسن نے آواز دی خالد، خالد کوئی جواب نہیں آیا۔ یار یہ شخص کہا چلا گیا میں نے اٹھ کر اسے کمروں میں تلاش کیا مگر وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ اس کی من پسند ایک ہی جگہ رہ گئی ہے۔ میں اسے وہاں دیکھتا ہوں حسن نے کہا اور اٹھ کر باتھ روم کا دروازہ "ناک" کیا

خالد

خالد نے پہلی دستک پر ہی دروازہ کھول دیا اور اس کے ساتھ ہی سگریٹ کے دھوئیں کے ایک گہرے بادل کی معیت میں قہقہے لگاتا ہوا جن بر آمد ہوا۔ موصوف کے چہرے پر شانتی ہی شانتی تھی۔ یہ تم ڈیڑھ گھنٹے سے باتھ روم میں کیا کر رہے تھے۔ سگریٹ

پی رہے تھے ؟ حسن نے پوچھا۔ سگریٹ ہی پی رہا تھا۔ خالد نے جواب دیا۔ تمہاری طرح باتھ روم میں بیٹھ کر شاعری تو نہیں کرتا۔ حسن خاموش ہو گیا۔ یہ خاموش مجھے نیم رضامندی لگی۔ میں اندر بیٹھا تمہاری باتیں سن رہا تھا۔ خالد نے اپنا بھر پور مسلسل قسم کا قہقہہ لگایا۔ عطا نے چائے بنا کر دی ہے۔ برتن جلا دیا ہے۔ طارق نے کھانا پکایا ہے۔ کہاں ہے کھانا سخت بھوک لگی ہے۔ اور پھر خالد دونوں ہاتھوں سے پتلون تھامے باورچی خانے میں داخل ہو گیا۔ طارق نے کھانا اچھا بنایا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم اپنے کمروں میں جا کر سو گئے۔ چاروں طرف سے گھنے درختوں اور خوش رنگ پھولوں والے باغات میں گھرے اس فلیٹ کی کھڑکی میں سے میں نے صبح طلوع ہوتے دیکھی۔ برمنگھم کی یہ صبح صبح بنارس سے کم خوبصورت نہ تھی۔ برمنگھم یونیورسٹی میں جون کا فلیٹ پانچ روز تک متنوع قسم کی سرگرمیوں کا مرکز رہا۔ جے ایس چوہان جتنا کھردرا انسان لگتا تھا۔ اندر سے اتنا ہی ملائم نکلا تاہم میرے اس کے خیالات میں کہیں بھی ہم آہنگی پیدا نہ ہو سکی لیکن انسانی تعلقات میں یہ چیز اس وقت رکاوٹ نہیں بنتی جب ایک دوسرے کے نظریات کا احترام کیا جائے اور دلا آزاری کی کوشش نہ کی جائے چنانچہ چوہان سے دوستی ہو گئی۔ وہ دن میں ایک دو دفعہ ضرور ہماری طرف آتا کبھی کبھی اکیلا اور اکثر اپنے کسی ''دوست'' کے ساتھ۔ یہ دوست کا لفظ میں نے انورٹڈ کا ماز میں اس لئے لکھا ہے کہ چوہان اگرچہ بہت اچھا شاعر اور دانشور ہے مگر علاقے میں اس کی دہشت بطور صحافی ہے چنانچہ جنھیں وہ دوست قرار دیتا تھا وہ دراصل اس کے مفتوحہ علاقے ہوتے تھے۔ اس کے ان دوستوں میں بھگوان داس، بدہم اور مسٹر گابھا بطور خاص شامل تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن بیچاروں کا ادب سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ پکے کاروباری قسم کے لوگ تھے مگر چوہان کے تابع تھے۔ چوہان کے دوستوں میں زیادہ تر ہندو تھے اور ایک دو سکھ بھی تھے۔ چوہان آبادی طور پر سکھ ہونے کے باوجود جب اپنے ان ہندو او سکھ "دوستوں " کو ان کے عقائد اور دوسرے معاملات کے ضمن میں لتاڑنے پر آتا تو وہ بہت چیں بہ جبیں ہوتے مگر نجانے ان کی کونسی دکھتی رگ اس کے ہاتھ میں تھی کہ تھوڑی دیر میں وہ بھیگی بلی بن جاتے۔ بہر حال چوہان اور اس کے دوستوں کی وجہ سے ہمارا فلیٹ بہت آباد رہا۔ خصوصاً ننھی منی داڑھی والا بھگوان داس اور بدھمن بہت دلچسپ کریکٹر تھا۔ شراب نوشی کا بے حد رسیا اور دھیمے دھیمے لہجے میں بات کرنے والا۔ اپنے لہجے سے بظاہر لگتا تھا کہ چوہان کی گالیاں اور جھڑکیاں بہت تحمل سے برداشت کر رہا ہے اور یہ درست بھی تھا مگر اپنے دھیمے دھیمے لہجے کے ساتھ وہ سب کچھ کر کے اٹھتا جو وہ کرنا چاہتا۔ چوہان اگر کسی سے زچ ہوتا تو وہ یہی بھگوان داس بدھن تھا۔ چنانچہ وہ روزانہ اپنے گھر پر "جلسہ" کرتا جس میں اس کے کاروباری دوست شریک ہوتے۔ جام کو وہ "گلاسی" کہتا پہلے روز اس نے ہمیں بھی اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ اس کے الفاظ کچھ یوں تھے۔ آج میرے گھر میں جلسہ ہے آپ بھی تشریف لائیے۔ ہم نے سوچا کہ پاکستان میں جلسے بہت سنے ہیں کیوں نہ دیکھا جائے کہ یورپ کے جلسے کیسے ہوتے ہیں۔ مگر بیشتر اس کے کہ ہم حامی بھرتے اس نے اپنا فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا بیٹھ کر ایک گلاسی پیئیں گے اور رانجھا راضی کریں گے۔ ہم سب صابن کی جھاگ کی طرح بیٹھ گئے کہ رانجھا راضی کرنے کا یہ نسخہ ہم

میں سے کسی کو بھی پسند نہیں تھا۔ برمنگھم میں چوہان کے بعد دوسرا شخص جس کے ساتھ دوستی ہوئی وہ آدم چغتائی تھا۔ خوش گلو، خوش کلام اور خوش مزاج، اس نے پانچ روز تک اپنی کار ہمارے لئے وقف رکھی اور ہمارے مشاہدے کے لئے ہمیں برمنگھم کے وہ گوشے بھی دکھائے جو دیکھنے میں بکوگوشے سے کم خوش منظر نہ تھے مگر ذائقے میں نیم سے زیادہ کڑوے تھے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ برمنگھم میں اپنے قیام کو بیانیہ انداز میں تحریر کرنے کی بجائے اس کی کچھ جھلکیوں کی ڈرامائی تشکیل آپ کے لئے کروں۔ سو چند جھلکیاں ملاحظہ فرمائیں۔

شیکسپیئر اور لگڑ دادا حضور

برمنگھم سے تقریباً ۳۵ میل کے فاصلے پر شیکسپیئر کا گاؤں ہے۔ شیکسپیئر یہاں سے تلاش روزگار میں کسی دوسرے شہر ہجرت کر گیا تھا۔ اب شیکسپیئر کی وجہ سے پورے گاؤں کو سیاحو ں کی بدولت روزگار ملا ہوا ہے۔ گاؤں کے بیچ میں ایک نہر ہے جو ایک جھیل گرتی ہے۔ شیکسپئیر میوزیم جہاں شیکپیئر کے زمانے کے ملبوسات، تصاویر ہتھیار اور دیگر نوادرات رکھے ہیں۔ میں، حسن، طارق طور، آدم چغتائی اور چوہان اس عظیم ڈرامہ نگار اور شاعر کی ذات سے وابستہ چیزوں اور گاؤں کے در و دیوار کو محبت اور عقیدت سے دیکھ رہے ہیں۔ دنیا بھر سے آئے ہوئے سینکڑوں سیاح بھی زیارت میں مشغول ہیں۔ پارک میں شیکسپیئر کا بہت بڑا مجسمہ ہے لوگ یہاں تصویریں اتروا رہے ہیں۔ اس مجسمے کے ساتھ ہی لیڈی میکبتھ کا مجسمہ بھی ہے۔ حسن لیڈی میکتھ کے ساتھ تصویریں اترواتا ہے۔ میں نے تمہاری تصویر تو اتار دی ہے لیکن اس کی کاپی تمہیں نہیں ملے گی۔ حسن کیوں ؟ میں مجھے ڈر ہے کہ تم اس تصویر کے ذریعے لیڈی میکبتھ کے ساتھ اپنا سکینڈل مشہور کرنے کی کوشش کرو گے۔ پارک سے نکلتے ہوئے ایک بوڑھا انگریز ہمارا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے کہتا ہے تم لوگ کہاں سے آئے ہو؟ پاکستان سے۔ کیوں آئے ہو؟ اس وقت تو شیکسپیئر کو خراج عقیدت پیش کرنے آئے ہیں۔ پوپلے منہ سے بھر پور قہقہہ لگاتے ہوئے تمہیں پتہ ہے یہ شخص خود کچھ بھی نہیں تھا؟ واقعی بزرگو؟ ہاں اس کے پیچھے سرسٹفین لیور تھے لیکن وہ کون تھے قبلہ گاہی؟ انگریز وہ میرے آباء و اجداد میں سے تھے اور خود بہت بڑے ادیب ہونے کے علاوہ ادیبوں کے سر پرست تھے۔ شیکسپیئر ان کا خاص مصاحب تھا۔ لگڑ دادا حضور یعنی سر سٹیفن لیور اس پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ ایک روز وہ اس اعتماد کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کا سارا تخلیقی کام چرا کر لے گیا اور گاؤں سے بھاگ گیا۔ تم لوگ سمجھتے ہو کہ اس نے روزگار کی تلاش میں گاؤں چھوڑا تھا؟ زندگی بھر کے لئے روزگار تو وہ ساتھ لے کر گیا تھا وہ چور شاعر تھا۔ میں نے کہا مگر بابا جی تاریخ میں تو اس واقعے کا کیں ذکر نہیں ؟ انگریز اسی لئے تو تاریخ پر لوگوں کا اعتماد اٹھ گیا ہے۔ مگر اب تاریخ میں اس کا ذکر ضرور آئے گا۔ میں گزشتہ نصف صدی سے اسی جگہ بیٹھا ہوں اور یہاں آنے والے سیاحوں کو

حقیقت حال بتا تا ہوں شاید میرے لگڑ دادا حضور کے ساتھ نا انصافی کا ازالہ ہو سکے۔ اچھا اب تم جاؤ میں تو اس ولیم شیکسپیئر کے بچے سے نپٹ کر ہی یہاں سے جاؤں گا۔

جون کے فلیٹ پر ٹنا خوان تقدیس مغرب رات کے تقریباً نو بجے کا وقت ہم گاڑی پر برمنگھم کی ایک سڑک کے کنارے پارک کرتے ہیں۔ رات کے وقت یہ سڑک نیم آباد ہے۔ ہم رنگ برنگے سوکھے پتوں سے آتے ہوئے فٹ پاتھ پر چل رہے ہیں۔ خالد ابھی تک تو کچھ نظر نہیں آیا۔ آدم ابھی نظر آئے گا حوصلہ رکھیں۔ اتنے میں پولیس کی ایک گاڑی پاس سے گزری ہے۔ حسن چھاپہ مگر گاڑی آگے نکل جاتی ہے۔ آدم جیب پاکٹ سے ہوشیار دشمن سامنے کھڑا ہے۔ طارق نے کہا کہا؟ آدم وہ درختوں کے جھرمٹ میں۔ درختوں کے جھرمٹ میں چار خوبصورت میمیں کھڑی ہیں تیرو تفنگ کمانیں کھینچی ہوئی ہم ان کے برابر سے گزرتے ہیں۔ بزنس لو "کاروباری محبت" ایک مترنم آواز آتی ہے۔ بزنس لو دوسری لو۔ بزنس لو تیسری آواز،۔ بزنس لو چوتھی آواز بزنس لو پانچویں آواز حسن کی ہے۔ خالد بھر پور نظروں سے حسن کا جائزہ لیتا ہے۔ ہم ایک لمحے کے لئے رک جاتے ہیں۔ وہ چاروں دوشیزائیں دوڑتی ہوئی ہماری طرف آتی ہیں۔ صرف بیس پاؤنڈ پر ہیڈ، پیکج ڈیل میں خصوصی رعایت۔ ایسے لگتا ہے جیسے عورت کی عصمت نہیں کار خانے میں تیار ہونے والی پلاسٹک کی مصنوعات بیچی جا رہی ہیں۔ میں۔ ۔ بازار سے گزرے ہیں خریدار نہیں ہیں۔ اور پھر ہم تیز تیز چلتے ہوئے واپس اپنی کار کی طرف بڑھتے ہیں۔ میموں کی فحش گالیا ہمارا پیچھا کر رہی ہیں۔ ہم نے ان کی "عزت نفس" کو جو ٹھیس پہنچائی ہے اتنے میں پولیس کی ایک وین ہم سے ذرا فاصلے پر رکتی ہے۔ حسن کا رنگ زرد ہو جاتا ہے وہ دوڑ کر کار میں بیٹھنے کے لئے کار کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا ہے مگر دروازہ اندر سے لاک ہے۔ وین میں سے پولیس والے تین چار لڑکیوں کو دھکا دے کر باہر سڑک پر پھینک دیتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان بھی ہے جس کی شکل پر لعنت برس رہی ہے۔ یہ ان لڑکیوں کو دلال ہے۔ پولیس کی وین آگے نکل جاتی ہے اور یہ لڑکیاں ور ان کا دلال خوشی سے چیختے ہوئے درختوں کے جھرمٹ کی طرف بڑھتے ہیں جہاں پہلے سے کھڑی لڑکیاں پولیس کی وین دیکھ کر ادھر ادھر ہو گئی تھیں اور اب دوبارہ ایک جگہ کھڑی تھیں۔ میں نے کہا یہ کیا تماشا ہے ؟ آدم نورا کشتی ہے۔ طارق وہ کیسے ؟ آدم طوائفوں پر قانونی طور پر پابندی ہے مگر پولیس کو پتی ملتی ہے وہ لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے کبھی کبھار پکڑ کر لے جاتے ہیں اور پھر ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے اسی طرح سڑک پر اتار جاتے ہیں جس طرح ابھی اتار کر گئے ہیں یہاں انہی چند شعبو ں سے پولیس مال بناتی ہے۔ میزبان اور مہمان برمنگھم سے تقریباً پچیس کلو میٹر دور وولر د ہمپتن کے قصبے سے اصغر نسیم چوہدری کا محل نما گھر یہاں ہم مہمانوں کے اعزاز میں شعری نشست ہے جس کی صدارت کے لئے عاشور کاظمی کو لندن سے مدعو کیا گیا ہے۔ باقر نقوی بھی اس مشاعرے میں شرکت کے لئے آئے ہیں۔ شعری نشست کے بعد کوٹھی کے سوئمنگ پول پر عشائیے کا اہتمام ہے۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے امجد سے کئی دنوں بعد ملاقات ہوتی ہے کیونکہ وہ بھابی کی ہماہمی کی وجہ سے ہمارے فلیٹ سے کافی دور کسی فیملی کے ساتھ رہ رہا

ہے۔ خالد احمد پلیٹ ہاتھ میں پکڑے میزبان کو ڈھونڈ رہا ہے بلآخر میزبان نسیم چوہدری اس کے ہاتھ لگ جاتے ہیں۔

خالد :آپ نے ابھی جو غزل پڑھی وہ بہت اچھی تھی۔

نسیم: بہت بہت شکریہ۔

خالد : میں نے آپ سے یہ غزل بیس برس قبل حلقہ ارباب ذوق لاہور کے اجلاس میں بھی سنی تھی۔

نسیم :حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس میں ؟

خالد: جی جی حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس میں۔

نسیم :لیکن میں تو کبھی حلقے کے اجلاس میں گیا ہی نہیں۔

خالد :آپ بھول رہے ہیں آپ نے یہ غزل وہاں پڑھی تھی۔

نسیم: نہیں برادر میں نے کبھی حلقے کی شکل نہیں دیکھی اور ویسے بھی میری یہ غزل بیس برس پرانی نہیں ہے۔

خالد: تو صاحب میں جھوٹ بول رہا ہوں۔

نسیم: توبہ توبہ جناب آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ کو صرف غلط فہمی ہوئی ہے۔

خالد : تو گویا آپ نے یہ غزل حلقے میں نہیں پڑھی ہے۔

نسیم :نہیں۔

خالد : مگر میں نے یہ غزل بیس برس قبل حلقے میں سنی ہے آپ نے نہیں تو کسی اور نے پڑھی ہو گی۔

یہ ستم ظریف مہمان پانی سے بھرے ہوئے تالاب کے بالکل کنارے پر کھڑا ہے۔ امجد اس کا ہاتھ پکڑ کر کنارے سے دور اور احتیاطاً میزبان کی رینج سے پرے کر دیتا ہے۔

ففٹی ففٹی

برمنگھم کی جامع مسجد میں، میں اور صفی حسن جوتے اتار کر داخل ہوتے ہیں۔ نماز کی ادائیگی کے بعد نمازیوں کے علاوہ اور بہت سے پاکستانی مرد، خواتین اور بچے میں جمع ہیں۔ خواتین کے لئے علیحدہ گوشہ مخصوص ہے۔ ایک پاکستانی کی اہلیہ

انتقال کر گئی ہیں۔ ان کے لئے قرآن خوانی کی جا رہی ہے۔ فضا میں ایک گہری اداسی ہے۔ قرآن خوانی کے بعد میں اور صفی حسن اس پاکستانی دوست سے تعزیت کرتے ہیں۔ اس وقت میں برمنگھم کی جامع مسجد میں نہیں ایک چھوٹے سے پاکستان میں ہوں۔ شلوار کرتے میں ملبوس بچے، سروں پر دوپٹہ اوڑھے ہوئے خواتین رومال سے سروں کو ڈھانپے ہوئے مرد، درود و سلام، قرآنی آیات کی تلاوت میں اس وقت مغربی تہذیب کے سمندر میں واقع ایک جزیرے میں ہوں مگر تھوڑی دیر بعد جب یہ محفل ختم ہو گی اس کے شرکاء کو دوبارہ اس سمندر کے تھپڑوں سے بچاؤ کی تدابیر سوچتا ہوں گی۔ مسجد سے ملحق ایک اسلامک سنٹر بھی ہے جس میں بچوں کے لئے دینی تعلیم کے اہتمام کے علاوہ تفریحی سرگرمیوں کا انتظام بھی موجود ہے اور یوں سنٹر کی ایک حیثیت مسلم کلب کی بھی ہے۔ سنٹر کے نوٹس بورڈ پر اردو عربی انگریزی اور فرانسیسی زبان میں مختلف اعلانات بھی درج ہیں۔ میں نے پوچھا برمنگھم کے مسلمانوں کا اس سنٹر سے رابطہ کس نوعیت کا ہے ؟ صفی حسن نے کہا بہت مضبوط رابطہ ہے۔ یہ سنٹر صرف پاکستانی مسلمانوں کے لئے نہیں دنیا کے تمام ملکوں کے مسلمان یہاں جمع ہوتے ہیں۔ میں نے پوچھا فرقہ واریت کا کیا حال ہے ؟ صفی نے کہا پاکستان اور بھارت سے مختلف فرقوں کے فسادی قسم کے مولوی برطانیہ آ کر تبلیغ کے نام پر مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن الحمد للہ وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ میں نے پوچھا برطانیہ میں پیدا ہونے اور پرورش پانے والی نئی نسل کن لائنوں پر سوچتی ہے ؟ صفی ان میں سے بیشتر کی جڑیں اپنی ثقافت اور مذہب میں خاصی گہری ہیں مگر صرف اس صورت میں اگر ان کے والدین کو اس معاملے سے دلچسپی ہے۔ تمہارے لئے یہ بات باعث حیرت ہو گی کہ یہاں جو مسلمان بچہ مذہب کی طرف راغب ہوتا ہے وہ پاکستانیوں کے بر عکس اپنے کردار میں انتہائی مضبوط ہوتا ہے۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا۔ دھوکا نہیں کرتا۔ دوغلے پن سے نفرت کرتا ہے اور ارد گرد کے ماحول کے شدید دباؤ کے باوجود ایک سچے مسلمان کی تصویر نظر آتا ہے۔

میں : کیا یہ صورت ہال مکمل تصویر ہے ؟

صفی : بالکل نہیں، اس معاشرے میں نئی مسلمان نسل کے لئے شدید خطرات پوشیدہ ہیں۔ ممکن ہے مسلمانوں کی اجتماعی کوششوں سے آگے چل کر حالات بہتر ہو جائیں۔

میں: حالات بہتر کی بجائے بد تر بھی تو ہو سکتے ہیں ؟

صفی: تم ٹھیک کہتے ہو۔ بس یہ سمجھ لو کہ ففٹی ففٹی چانسز ہیں۔

لہو گرم رکھنے کا اک بہانہ

برمنگھم یونیورسٹی سے ملحقہ ایک پارک میں طارق اور حسن چہل قدمی کر رہے ہیں۔ آج دھوپ کھ کر نکلی ہے۔ یونیورسٹی کے طلبہ طالبات اپنے قریبی ہاسٹل اور کیمپس سے نکل کر یہاں خاصی تعداد میں جمع ہیں اور ایک بلند پتلے ک ڈھلان کے مختلف حصوں کا مطالعے میں مشغول ہیں یا ایک دوسرے سے چہلیں کر رہے ہیں۔ ہم ڈھلوان کے آخری کنارے پر کھڑے ہیں اور او پی کے طور پر دشمن کی سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ بہت دیر سے ایک لڑکا اور لڑکی دھینگا مشتی میں مشغول ہیں۔ ان کی حرکتیں خاصی افسوسناک ہیں۔ ڈھلان کے برابر والی سڑک پر کچھ لڑکے لڑکیاں جوکنگ میں مشغول ہیں۔ ایک شادی شدہ جوڑا اپنے بہت خوبصورت بچے کو بچہ گاڑی میں بٹھائے ہمارے پاس سے گزرتا ہے۔ ہمیں دیکھ کر اس گول مٹول اور سرخ سفید بچے کے چہرے پر اچانک وہ مسکراہٹ ابھرتی ہے جو دنیا کی سب سے زیادہ خوبصورت چیز ہے اور جو خدا کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ دھینگا مشتی کرنے والا جوڑا بدستور لڑھکتا لڑھکتا کبھی ایک جانب چلا جاتا ہے اور کبھی دوسری طرف لڑھکتا جاتا ہے۔

طارق : قاسمی صاحب یہ کیا کر رہے ہیں ؟

میں: کچھ بھی تو نہیں کر رہے ہیں۔

طارق : یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ بات یہ ہے کہ مغرب میں بارہ تیرہ سال کے بچے بلوغت کی سرحدوں تک پہنچنے لگتے ہیں اور باقاعدہ بالغ ہونے تک وہ ایسے مراحل سے گزر چکے ہوتے ہیں جو ہمارے ہاں بسا اوقات عمر کے حصے میں طے ہوتے ہیں۔ ہم لوگ تفریح کی وجہ سے گھٹن کا شکار رہتے ہیں یہ لوگ افراط کی وجہ سے مختلف قسم کے مسائل سے دو چار ہوتے ہیں۔ یہ خلوت کو جلوت میں تبدیل کرنے کا رویہ بھی میرے نزدیک ایک ذہنی مسئلہ ہے۔

طارق: آپ تو پتہ نہیں کس طرف نکل گئے میں پوچھ رہا ہوں یہ جوڑا کیا کر رہا ہے ؟

میں نے کہا آؤ ان سے پوچھتے ہیں۔

ان سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے میں بتاتا ہوں۔

طارق : تو پھر بتائیں تا کہ حافظ جی گھر کا راستہ لیں۔

میں نے کہا پلٹنا جھپٹنا جھپٹ کر پلٹنا لہو گرم رکھنے کا ہے ایک بہانہ،وقت سے بہت پہلے "بالغانہ " سرگرمیاں شروع کر دینے کی وجہ سے آہستہ آہستہ لہو اسی طرح گرم کرنا پڑتا ہے۔

طارق : چھوڑیں جی آپ نے تو "گل" ویران کر دی ہے۔ اب گھر چلتے ہیں۔ خالد احمد باتھ روم سے فارغ ہو گیا ہو گا۔

بریڈ فورڈ اپنا اپنا ایک شہر برمنگھم میں جون کا فلیٹ خالی کرتے ہوئے ہم نے اس کے کچن ی الماریاں اشیائے خورد نوش سے بھر دیں کہ تھوڑی بہت چیزیں ہم نے اس کی بھی استعمال کی تھیں۔ وہ جب واپس آ کر اپنے فلیٹ کا جائزہ لے گا اور بعض پرانی چیزیں غائب اور ان کی جگہ ڈھیر ساری نئی چیزیں دیکھے گا تو ہم سے غائبانہ طور پر سوال ضرور کرے گا کہ چور بھائی پھر کب آئیے گا۔ برمنگھم سے بریڈ فورد تک منہ کا مزا بدلنے کے لئے ہم ے بس میں سفر کیا۔ بس ہمارے ہاں کی بس نہیں تھی۔ جس میں انسان بے بس ہو جاتا ہے بلکہ اسے چیزے دیگر کہا جا سکتا ہے۔ حتی کہ اس بس میں اٹیچڈ باتھ روم بھی تھا گو اس باتھ روم میں اپنے رسک ہی پر داخل ہوا جا سکتا تھا کہ اس کے "تنگی داماں " کی وجہ سے ممکن ہے آپ باہر ہی نہ نکل سکیں۔ خالد احمد کو جب میں نے بتایا کہ بس میں باتھ روم موجود ہے تو اس کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر نمودار ہوئی اور وہ فوراً باتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا بلکہ اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ تاہم تھوڑی ہی دیر میں وہ واپس اپنی سیٹ پر تھا۔ میں نے کہا نصیب دشمنان طبیعت تو ٹھیک ہے۔ پندرہ بیس منٹ ہی میں واپس آ گئے ہو۔ بولا ابھی تین سگریٹ ہی پئے تھے کہ باتھ روم دھوئیں سے اس قدر بھر گیا کہ در دیوار کی شکل نظر نہیں آتی تھی۔ دفعہ کرو یار بہ بھی کوئی بس ہے۔ رستے میں بس دو تین شہروں کے لاری اڈہ پر رکنے کے ان شہروں کے گلی کوچوں میں سے ہو کر گزری جن میں لیڈز کا شہر بھی تھا۔ مجھے قصبے بہت اچھے لگتے ہیں خصوصاً یورپ کے قصبے اور دیہات تو بے ہد خوبصورت ہیں۔ جمالیاتی حس کو تسکین پہنچتی ہے اور طبعیت پر بے حد خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ خدا جانے ہمارے گلی کوچوں قصبوں اور دیہاتوں میں سے گندگی کے ڈھیر کب اٹھیں گے ؟ ہمارے ہاں کیپٹل ازم ادھوری صورت میں نافذ ہے چنانچہ اس نظام کی تمام گندگیاں ہمارے حصے آئی ہیں اس نظام کی تمام خوبصورتیوں سے ہم لوگ یکسر محروم ہیں۔ اور اب ہم بریڈ فورڈ میں ہیں یہاں انجن فکر ودن کے جاوید اقبال ستار نے کل برطانیہ مشاعرے کا اہتمام کیا ہے۔ مہمانوں کی رہائش کے لئے ایک دو منزلہ خالی مکان کا انتظام کیا گیا ہے۔ چنانچہ خانہ خالی رادیوی گیرند کے مصداق ہم لوگ فوراً اس میں داخل ہو جاتے ہیں۔ امجد اسلام امجد اور فردوس بھائی، ڈاکٹر صفی حسن اور طاہرہ بھابی گراؤنڈ فلور پر ہیں۔ ساقی فاروقی اور غلام قادر آزاد پہلے فلور پر اور میں طارق طور، خالد احمد اور حسن رضوی نے اپنے لئے دوسرا فلور منتخب کیا ہے۔ لندن میں اتنے دن گزارنے کے باوجود ساقی فاروقی سے ملاقات بریڈ فورڈ میں ہو رہی ہے۔ اس طرح یار عزیز غلام قادر آزاد نیو کاسل سے طویل سفر کے بعد یہاں غلام قادر آزاد ہی کی طرح علمی گفتگو کے بہت شوقین ہیں۔ ساقی فاروقی شاعری اور تنقید کا ایک معتبر نام ہے۔ اس کے قد کے شاعر اور بھی موجود ہیں مگر ان جیسے نقاد کم کم ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے ان کی تنقیدی نظریات سے اتفاق ہے۔ شاید بہت زیادہ اختلاف ہے لیکن مجھے وہ اپنے تنقیدی روئیے میں ایماندار لگتے ہیں، ان کا انداز فدویانہ نہیں جارحانہ ہے۔ نہ بخشنے پر آئیں تو اپنے مدو حین کو بھی نہیں بخشتے تیز اور نوکیلے فقرے لکھنے والے نقاد اردو میں تین چار اور بھی ہیں مگر ساقی فاروقی، انیس ناگی اور اس طرح کے دو ایک نقادوں کو چھوڑ کر وہ کسی نہ کسی گروپ کی نمائندگی کرتے ہیں

اور اس کے جھوٹ سچ میں برابر کے شریک ہوتے ہیں جب کہ ساقی فاروقی کا حلقہ احباب تو ہے مگر بلڈ گروپ کے علاوہ ان کا کوئی گروپ نہیں ان کی گفتگو اور شعر پڑھنے کا انداز بہت ڈرامائی ہے۔ لگتا ہے جن نکال رہے ہیں۔ طارق طور نے پہلی دفعہ انہیں بریڈ فورڈ میں گفتگو کرتے دیکھا تو گھبرا گئے۔ اس سراسیمگی کے عالم میں میرے پاس آئے اور کہا "قاسمی صاحب ڈاکٹر لے کر آؤں "؟۔

بریڈ فورڈ اپنا اپنا ایک شہر

خالد احمد بنام ساقی فاروقی

جاوید اقبال ستار کے گھر عشائیے کے بعد بریڈ فورڈ کے اس "خانہ خالی" میں دوستوں کی محفل جمتی ہے مگر تھوڑی ہی دیر بعد یہ محفل ساقی فاروقی اور خالد احمد کے ساتھ مکالمے میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ میں ساقی فاروقی کو پہلی دفعہ کسی سے زچ ہوتے دیکھ رہا ہوں۔ دراصل خالد احمد اللہ تعالی کی بنائی ہوئی ایک عجیب و غریب چیز ہے۔ دیکھنے میں لا ابالی پنن کا شکار بظاہر صرف فقرے باز، ہر بات کو قہقہوں میں اڑا دینے والا مگر یہ بات اس کے قریبی دوست ہی جانتے ہیں کہ وہ جب اپنی آئی پر آ جائے تو اس وقت وہ بالکل کسی اور روپ میں نظر آتا ہے۔ وہ بلا کا ذہین، خلاق اور اوریجنل آدمی ہے۔ اور اس وقت وہ اسی روپ میں نظر آ رہا ہے۔ ساقی فاروقی کی زبان سے کوئی ایسی بات نکل گئی ہے جس نے خالد احمد کو رواں کر دیا ہے اور ساقی کو سمجھ نہیں آ رہی کہ وہ اس جن کو واپس بوتل میں کس طرح بند کریں۔ خالد کی گفتگو میں سے کچھ جملے جستہ جستہ مجھے یاد رہ گئے ہیں ملاحظہ فرمائیں۔ باقی بھائی راشد ایک ایسا بنک ہے جہاں آپ اپنی صلاحیتیں ایک عرصے سے جمع کرا رہے ہیں۔ مگر اس بنک سے چیک کبھی آنر نہیں ہو گا۔ اگر میں کہوں کہ آپ مائنر شاعر ہیں تو میری بات کا برا نہ مانیں کیونکہ ہر شاعر میجر شاعر نہیں ہوتا۔ اکثر مائنر ہوتے ہیں۔ حالی اور داغ بھی مائنر شاعر ہیں مگر دس شاعر مل بھی ایک حالی یا ایک داغ نہیں بنتا۔ ہم نے کلیشے کے لفظ کو بہت محدود کر دیا ہے۔ مثلاً اگر میں "سرور ستار" کہوں تو یہ کلیشے ہے کیونکہ یہ بہت دفعہ استعمال ہو چکا ہے حالانکہ کلیشے پرانی باتوں کو پرانے طریقے سے بیان کرتے چلے جانے کا نام ہے۔ چنانچہ آج کل نیا ادب بھی کلیشے ہے۔ کہ اس میں کہی جانے والی باتیں بار بار ایک ہی پیرائے میں بیان ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ آپ دو سال پہلے تک جو نظم اور غزل کہتے تھے۔ میرے نزدیک وہ کلیشے کے زمرے میں آتی تھی لیکن اب ایسا نہیں کیونکہ آپ نے ایک ایسا ایڈیم ایوالو کیا ہے۔ جو نام نہاد کلیشے ہے کیونکہ اس نے اپنی شاعری کی بندیار مشرق ہی سے یعنی چینی شاعری سے اٹھائی ہے۔ چنانچہ وہ ہمیں اپنے قریب لگتا ہے۔ مغرب کے لے وہ مختلف آواز تھی۔ اس نے مغرب سے خود کو اپنی ماسٹری سے منوایا۔ ایک پرانی کہاوت ہے۔ آئیں سفید بالوں کا احترام کریں۔ خصوصاً اپنے سفید بالوں کا۔ اور میں اس کہاوت پر کوئی تبصرہ نہیں کرونگا۔ زنباق تریہالگاز نباق تریہا غلام قادر آزاد بار بار گفتگو میں شریک ہونے کی کوشش کرتے ہیں مگر خالد احمد کسی کو موقع نہیں دے رہا۔ محفل میں جاوید اقبال ستار کے علاوہ میزبانوں میں سے

النصر جاوید اور طلعت ریاض بھٹی بھی موجود ہیں۔ النصر ایک بہت "ببیا" آدمی اور اچھا افسانہ نگار ہے۔ طلعت یہاں لیڈز یونیورسٹی میں سیاسیات کا طالب علم ہے۔ جب اس نے اگلے روز مشاعرے کی نظامت سنبھالی تو پتہ چلا کہ وہ بہت اچھا اسٹیج سیکریٹری بھی ہے۔ محفل میں چھوٹے سے قد کے چھوٹی چھوٹی داڑھی والے ایک صاحب بھی موجود ہیں۔ ان کی ہیئت کذائی ایسی ہے کہ خواہ مخواہ چھیڑ خانی کرنے کو جی چاہتا ہے۔ چنانچہ طارق طور ضد کر رہے ہیں کہ میں نے یہ "چیز خریدنی ہے " پتہ کریں کتنے کی ملتی ہے ؟ میں نے غلام قادر آزاد کو گزشتہ برس بریڈ فورڈ ہی میں نواب ناطق مرحوم کا ایک "شعر" ناطق کہ سخن تیرا ہے تریاق تریہ زنباق تریہالکا زنباق تریہ سنایا تھا۔ جب ہم نے اس شعر کی "معنویت" پر غور کیا تو پتہ چلا کہ اس کے دوسرے مصرعے کو محض لہجہ بدل کر ادا کرنے سے مختلف کیفیات کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہم تین روز تک یہ مصرعہ مختلف مواقع پر استعمال کرتے رہے۔ غلام قادر آزاد اس محفل میں بھی خالد اور ساقی کے مکالمے کے دوران کبھی خالد اور کبھی ساقی کی کسی بات پر مجھے مخاطب کر کے ہولے سے۔ زنباق تریہالکا زنباق تریہ کہتے ہیں جس سے کبھی حیرت اور کبھی پسندیدگی کا اظہار ہوتا ہے اس دفعہ انہوں نے میرے بجائے خالد کو مخاطب کر کے قدرے زور سے۔ زنباق تریہانکا زنباق تریہ کہا ہے اور خالد احمد اس مصرعے کے پس منظر اور تسلسل سے واقف نہ ہونے کے باجود محض طرز ادائیگی سے سمجھ گیا ہے کہ اب بس کرو، چنانچہ وہ گفتگو کا رخ موڑ دیتا ہے اور پھر صبح کے تین بجے تک ساقی، خالد، آزاد اور محفل میں موجود دوسرے دوست ہلکی پھلکی گفتگو اور اپنی پھلجھڑیو ں سے اس محفل کو ایک یاد گار اور ناقابل فراموش محفل میں بدل دیتے ہیں۔

گوریوں کی استادی

بریڈ فورڈ میں پاکستانی خاصی تعداد میں آباد ہیں، ان کی تعداد تقریباً ساٹھ ہزار اور ان کی اکثریت اپنے مذہب اور ثقافت سے پوری طرح وابستہ ہے یہاں ہماری ملاقات صوفی اسماعیل سے ہوئی۔ صوفی صاحب کا تعلق گجرات سے ہے اور پوری طرح سیلف میڈ انسان ہیں۔ مہمانوں کی خدمت کر کے خوش ہوتے ہیں۔ اور مہمانوں کو یہ بات بار بار بتاتے بھی ہیں کہ انہیں مہمانوں کی خدمت کر کے خوشی ہوتی ہے تا کہ مہمان خود کو ان پر بار محسوس نہ کریں۔ صوفی صاحب نے بتایا کہ بریڈ فورڈ میں ۲۵ مسجدیں ہیں اور اب ہم ان کی تعداد میں اضافے کی بجائے ان کی افادیت کو مستحکم کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ صوفی صاحب نے ایک دلچسپ بات یہ بتائی کہ انہیں ابتدا میں جب میر پور سے لوگ یہاں آئے تو انہوں نے انگریزی سیکھنے کے لیئے گوریوں سے دوستی کی۔ صوفی صاحب کی اب خاصی اچھی ہے۔ ایک بات صوفی صاحب نے نہیں بتائی۔ وہ میں بتائے دیتا ہوں اور وہ یہ کہ اب پاکستانیوں کی یہ نئی نسل بھی گوریوں سے دوستی کر رہی ہے کیونکہ یہ نسل انہیں اردو سکھانا چاہتی

ہے۔ بریڈ فورڈ میں ہم نے ایک ایسی دکان دیکھی کہ بس دل خوش ہو گیا۔ اس دکان کا نام بک سنٹر ہے اور اس کے مالک افتخار قریشی ہیں۔ بک سنٹر یورپ کا سب سے بڑا اردو کتابوں کا مرکز ہے۔ یہاں ہر موضوع پر کتابیں دستیاب ہیں۔ اور یوں ایک لاکھ سے زیادہ اردو کتابیں یہاں موجود ہیں اور یورپ بلکہ امریکہ تک سپلائی ہوتی ہیں۔ یہاں کتابوں کے علاوہ پاکستانی گانوں کے کیسٹ اور پاکستانی ثقافت سے متعلق دوسری اشیاء بھی دستیاب ہیں اور یوں افتخار قریشی رزق حلال کمانے کے ساتھ ساتھ ملک و قوم کی گراں قدر خدمت بھی انجام دے رہے ہیں۔ جب افتخار قریشی نے ہمیں اپنے بک سنٹر میں مدعو کیا تو مہمان بک شیلفوں میں کافی آنکھ سے اپنی تصنیفات بھی تلاش کرتے رہے اور انہیں یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ان کی سب کتابیں یہاں موجود ہیں بلکہ بقول افتخار قریشی کی ان کی خاصی مانگ بھی ہے۔ چنانچہ وہ سنگ میل والے نیاز احمد سے یہ کتابیں بار بار منگوا کر بار بار بیچ چکے ہیں۔ میری طرح افتخار قریشی بھی نیاز احمد کی پبلشنگ، دیانت اور دوستی کے بہت مداح تھے۔
حضرت شاہ بریڈ فورڈ میں موجود نہیں تھا۔ وہ ان دنوں پاکستان گیا ہوا تھا اور حضرت شاہ کے بغیر یوں لگا جیسے کہیں نہ کہیں کوئی کمی موجود ہے۔ البتہ اس کے دست راست جاوید اختر بیدی سے ملاقات ہوئی جس کے بہت اچھا شاعر ہونے میں کوئی کلام نہیں مگر بیدی انجمن فکر و فن کے مشاعرے میں موجود نہیں تھا۔ غالباً معاصرانہ چشمک کا معاملہ ہے کہ یہاں جاوید اقبال ستار اور حفیظ جوہر جیسے شاعر موجود ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ دونوں گروپ ایک دوسرے کے مشاعروں میں شامل نہیں ہوتے حالانکہ شاعر لوگ محبوب چھوڑ دیتے ہیں، مشاعرہ نہیں چھوڑتے۔ مشاعرے میں شرکت کے لئے لندن سے اعجاز احمد اعجاز اتوار کی چھٹی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اطہر راز، ابرار ترمذی اور بلبل کاشمیری سمیٹ بریڈ فورڈ پہنچ چکے تھے۔ عاشور کاظمی اور باقر نقوی علیحدہ کار میں آئے تھے۔ مشاعرے میں پاکستان میں آئے ہوئے شعراء کے علاوہ مختار آور کربلائی، راجہ تبسم عظیمی، بوٹا خان، راجہ سید اختر زیدی، محمد فاروق، مولانا محمد ارشد، عابد ودود، مصطفے انور اعظمی، اعجاز احمد اعجاز، عمر رضا، بشیر جاوید، حفیظ جوہر، اطہر روز، ڈاکٹر مختار الدین احمد، ڈاکٹر صفی حسن، باقر نقوی، عاشور کاظمی، غلام قادر آزاد او ساقی فاروقی نے اپنا کلام سنایا، غلام قادر آزاد ایک عالم فاضل آدمی ہیں مگر ستم ظریف بھی بہت ہیں انہوں نے یہاں جو نظم سنائی وہ۔

زنباق تریہا لکا زنباق تریہا کی تفمین تھی، یہ نظم سنتے ہوئے مجھ سے ہنسی کنٹرول نہیں ہو رہی تھی اور ایک وقت آیا کہ میرے لئے اسٹیج پر بیٹھنا ممکن نہ رہا چنانچہ میں اٹھ کر باتھ روم چلا گیا۔ واپس آیا تو خالد احمد نے پوچھا کہاں گئے تھے۔ میں نے کہا باتھ روم اس نے وفود مسرت سے کہا کہاں ہے باتھ روم میں نے کہا خبردار اگر یہاں سے ہلے بھی ورنہ باتھ روم میں لاک کر دوں گا۔ یہ سن کر خالد احمد کے چہرے پر کچھ بے یقینی کے سے آثار نمایاں ہوئے، جیسے اسے میرے اس دھمکی نما خوش خبری پر یقین نہ آیا ہو۔ صوفی صاحب کا مشورہ مشاعرے کے آغاز میں صوفی اسماعیل نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں شعراء حضرات پر روز دیا کہ وہ مذہب اور وطن کے تصور کو اپنی شاعری کا محور بنائیں۔ صوفی صاحب نیک آدمی ہیں اور وہ

شاعروں کو بھی اپنی طرح نیک دیکھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ شاعروں کو ناک سے پکڑ کر ناک کی سیدھ میں نہیں چلایا جا سکتا۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ صوفی صاحب ایک نہ ایک دن اپنے مشن میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ مگر ان کی کامیابی کی باری مولانا حالی کے بعد آئے گی۔ کیونکہ مولانا حالی نے صوفی اسماعیل کی بات شاعروں کو بہت پہلے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ امجد اپنی بیگم کے ساتھ صوفی اسماعیل کے گھر شفٹ ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ ایک بار پھر محفل دوستاں سے محفوظ ہو گیا اور محفل دوستاں بھی اس کے شر سے محفوظ رہی۔ اگلے روز صوفی صاحب نے مہمانوں کے اعزاز میں ظہرانہ دیا تھا۔ صوفی صاحب کا ڈرائنگ روم مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ موصوف اگر چہ برطانیہ میں دینی اور تبلیغی سرگرمیوں میں فعال کردار انجام دیتے ہیں اور صوفی صرف ان کے نام ہی کا حصہ نہیں ان کی وضع قطع بھی صوفیانہ ہے اور ارکان اسلام پر بھی پابندی سے عمل پیرا ہوتے ہیں۔ لیکن زاہد ان خشک کے ماتھے پر جو تیوریاں چڑھی ہوئی ہیں اور بعض پارساؤں میں پارسائی کا جو تکبر ہوتا ہے صوفی اسماعیل اس سے مکمل طور ر محروم ہیں چنانچہ اگر ان کے اپنے چہرے پر مسکراہٹ آ جائے یا کسی اور کو مسکراتا دیکھ لیں تو اس حرکت کو خلاف شرع نہیں سمجھتے بلکہ دل لگی کی باتوں میں شریک بھی ہوتے ہیں۔ اور دل لگی کی باتیں کرتے بھی ہیں برطانیہ میں امجد اسلام امجد سے دوسری یا تیسری ملاقات صوفی صاحب کے ظہرانے ہی میں ہوئی۔ امجد نے اپنی گفتگو کا آغاز شریفانہ لطیفوں سے کیا اور مجبوراً اختتام بھی کہ یہاں اس کی زیادہ گنجائش نہیں تھی۔ یہی حال ساقی فاروقی کا بھی تھا۔ ساقی کی گفتگو میں ممنوعہ الفاظ غیر ممنوعہ الفاظ سے زیادہ ہوتے ہیں بلکہ یہ تناسب ان کی نظم اور نثر میں بھی موجود ہے۔

میں آپ کا "کتوارا" ہوں

اپنے خالد احمد کا بھی یہی معاملہ تھا۔ چنانچہ میں نے پہلی دفعہ دیکھا کہ اسے بولنے سے پہلے سوچنا پڑ رہا ہے۔ یہ وہی خالد احمد ہے جو پاکستان میں ایک سینئر شاعر سے کسی بات پر الجھ پڑا اور کوئی ایسی بات کہہ دی جو اسے نہیں کہنا چاہئے تھا۔ میں نے بعد میں اسے سمجھایا کہ بزرگوں کی زیادتی بھی معاف کر دینا چاہئے اور کوئی ایسی بات نہیں کہنا چاہئے جو حد ادب کے منافی ہو لہذا تم فوراً اس بزرگ شاعر کے پاس جاؤ اور اپنے کہے ہوئے الفاظ پر ان سے معذرت کرو۔ چنانچہ خالد احمد اس سینئر شاعر کے گھر پہنچا اور جاتے ہی ان کے گھٹنے پکر لئے اور کہا "کل دوران گفتگو مجھ سے کچھ زیادتی ہو گئی، آپ براہ کرم مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ کا "کتوارا" " ہوں۔ صوفی اسماعیل کی اس محفل میں مجھے ایک شخص بہت اچھا لگا اس شخص کا نام عبدالطیف تھا، ان صاحب کی شخصیت کا نمایا وصف ان کا ہنس مکھ ہونا تھا۔ میں نے ان چہرے پر مسلسل ایک خوبصورت مسکراہٹ دیکھی، خدا جانے ہم لوگ اس بات کو کیوں نہیں سمجھتے کہ رعونت یا یبوست سے کھینچے ہوئے چہرے

اپنے ا ور دوسروں کے اعصاب میں کھنچاؤ پیدا کرتے ہیں جبکہ خالص اور بے لوث مسکراہٹ پوری فضا کو خوشگوار بنادیتی ہے۔ انسانیت کی یہ وہ خدمت ہے جو کنجوس سے کنجوس شخص بھی انجام دے سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں کوئی پیسہ دھیلا خرچ نہیں ہوتا مگر بڑے بڑے "امراء" کو بھی میں نے اس میں بھی بخل کرتے دیکھا ہے۔ یہاں ہمیں جناب خمینی کے انتقال کی خبر موصول ہوئی اور صرف اس وقت میں نے عبدالطیف کے چہرے کی دائمی مسکراہٹ کی جگہ افسردگی کے سائے دیکھے۔ عبدالطیف عقیدے کے لحاظ سے اہلسنت والجماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن وہ جناب خمینی کو اتحاد بین المسلمین کا عمل بردار ہونے کی وجہ سے بہت عقیدت اور احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔

شرار بو لہبی

جاوید اقبال ستار ہمیں بریڈ فورڈ، میں قائم نیشنل میوزیم آف فوٹو گرافی فلم اینڈ ٹیلی ویژن دکھانے کے خواہاں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جس طرح کسی نے لاہور نہیں دیکھا تو اس نے کچھ نہیں دیکھا، اسی طرح جو بریڈ فورڈ میں آجر بھی یہ میوزیم دیکھنے سے محروم رہا۔ اسے اپنا تخلص ہی "محروم" رکھ لینا چاہئے۔ انصر جاوید ہم پاکستانی مہمانوں کے لئے ٹکٹس خرید لائے تھے چنانچہ جاوید اقبال ستار اور انصر جاوید کی ہمراہی میں ہم لوگ یہ میوزیم دیکھنے کے لئے گئے۔ جاوید اقبال ستار ٹھیک کہتے تھے۔ اس میوزیم میں منفرد نوعیت کا سنیما ہال بھی ہے جس کی سکرین ٥٦ فٹ لمبی اور ٦٤ فٹ چوڑی ہے اس پر فلم دیکھنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ دو گھنٹے کے شو میں ڈوکو منٹری نوعیت کی مختلف فلمیں دکھائی گیں۔ ایک فلم انسان کے ابتدائی دور کے حوالے سے تھی اور دوسری فلموں میں بتدریج انسانی ترقی کے مختلف مراحل دکھائے گئے تھے۔ اتنی بڑی سکرین پر یہ فلمیں دیکھتے ہوئے یوں لگتا تھا جیسے ہم خود اس فلم کا کوئی کردار ہیں۔ بسا اوقات کسی کلوز اپ میں یہ احساس ہوتا تھا کہ جو گاڑی سامنے سے دوڑتی چلی آ رہی ہے ہم کہیں اس کے نیچے آجر کچلے نہ جائیں چنانچہ اک دو دفعہ خود میں نے اپنے بچاؤ کے لئے اپنے کندھے ایک طرف کو جھکا دئے۔ اس میوزیم میں ہوائی جہازوں کے انجن، کیمرے، اور دورا سائنسی سامان بھی نمائش کے لئے رکھا گیا ہے۔ تا ہم یہ میوزیم دیکھتے ہوئے ایک بار پھر میں اس سوچ میں گم ہو گیا کہ ابتدائی دور کا انسان جو خود کو جنگلی جانوروں سے محفوظ رکھنے کے لئے مارا مارا پھرا کرتا تھا، کیا اتنی زبردست سائنسی ترقی کے بعد وہ ان "جنگلی جانوروں " سے محفوظ ہو گیا ہے۔ جو اب سپر پاور ز بن کر انسان کو مکمل طور پر تباہ کرنے کے درپے ہیں۔ نیز خود انسان کے ہاتھوں انسان کی تباہی کے لئے جو سائنسی ایجادات ہوئی ہیں اور انسانی قدروں کو ملیا میٹ کرنے کے جو خوشنما نظام وجود میں آئے ہیں، کیا انسان اور انسانیت کو ان کی دسترس سے بچانے کے لئے تدبیر کی جا سکتی ہے ؟ میں اس ضمن میں مایوس نہیں ہوں مجھے یقین ہے کہ اگرچہ انسان

کے اندر موجود خیر اور شر کی قوتوں کے مابین جنگ جاری رہے گی کہ ستیزہ کار رہا ازل سے تا امروز چراغ مصطفوی سے شرار بو لہبی

لیکن چراغ مصطفوی شرار بو لہبی کی فتنہ سامانیوں کو ایک نہ ایک دن محدود کرنے میں کامیاب ضرور ہو گا اگر چہ ازل سے تا امروز جو جنگ جاری ہے اس میں خیر کو اپنی فتح برقرار رکھنے کے لئے ابد تک بیدار اور چوکس رہنا ہو گا۔

وطن کی بو باس

بریڈ فورڈ میں مختصر قیام کے دوران ہم اپنے کچھ دوستوں کی خواہش میزبانی کی تکمیل سے محروم رہے چنانچہ صرف خالد سعید کی دعوت میں شریک ہو سکے جو پیپلز پارٹی بریڈ فورڈ کے روح رواں ہیں۔ خالد سعید برطانیہ سے نکلنے والے اردو اخبار ملت" کے ڈائریکٹر بھی ہیں، ان کے ہاں ہماری ملاقات محترمہ شمیم اقبال صاحب سے بھی ہوئی جو سیاست دان ہیں اور اپنے بھائی خالد سعید سے ملاقات کے لئے بریڈ فورڈ آئی ہوئی تھیں۔ اس محفل میں دوسرے دوستوں کے علاوہ جاوید اختر بیدی بھی موجود تھے، جن سے ایک مسئلے پر گرم گرم بحث کا "سودا" بھی آیا۔ ہم خالد سعید کے گھر سے سیدھے واپس لندن کے لئے روانہ ہو گئے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بریڈ فورڈ کی باقی باتیں گول کر جائیں۔ وہ تو مجھے بہر حال سنانا ہیں۔ جو باتیں مجھے آپ کو سنانا ہیں، ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ اگرچہ برطانیہ میں پاکستانیوں اور بھارتیوں کی بڑی تعداد موجود ہونے کی وجہ سے کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ ہم "ولایت" آئے ہوئے ہیں، لیکن بریڈ فورڈ میں پاکستانی زیادہ کثیر تعداد میں موجود ہونے کی وجہ سے اپنے وطن کی بو باس زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ یہاں تو کئی جگہ اردو کے سائن بورڈ بھی نظر آ جاتے ہیں اور کچھ اس طرح کے اشتہار بھی پڑھنے کو ملتے ہیں۔

ممتاز پان ہاؤس ایک بار آزمائیے بار بار آئے

ہمارے ہاں گلاس، چینی، اسٹین لیس اسٹیل، ایلومونیم کے برتنوں کے علاوہ اعلی نسوار، تمباکو، حقے اور چلمیں بھی دستیاب ہیں۔ دکاندار حضرات کے لئے خصوصی رعایت۔ بریڈ فورڈ میں پاکستان کا احساس صرف انہی مظاہر سے نہیں، بلکہ پاکستانیوں کی بے پناہ گرم جوشی اور ان پاکستانی قدروں سے بھی ہوتا ہے۔ جو مغرب کے مادہ پرست ماحول میں بھی انہوں نے بچا بچا کر رکھی ہوئی ہیں۔ مجھے یہاں بال کٹوانے کے لئے حجام کے پاس جانا پڑا۔ انصر جاوید مجھے ایک پاکستانی ہیئر ڈریسر کی دکان پر لے گئے۔ انصر نے ہیئر ڈریسر سے کہا یہ ہمارے پاکستانی مہمان ہیں۔ ان کا خصوصی خیال رکھنا، اس کے بعد وہ ایک کام کے لئے اٹھ کر چلے گئے۔ ہیئر ڈریسر نے خالص پاکستانی مہمان نوازی کے انداز میں پوچھا۔ آپ ٹھنڈا پیئیں گے کہ گرم؟۔ اور پھر میرے انکار کے باوجود چھوٹے سے کہا کہ وہ دوڑ کر جوس لے آئے۔ بعد ازاں اس نے خصوصی اہتمام کے ساتھ میرے بال کاٹے اور جب میں نے اجرت دینا چاہی تو اس نے کہا۔ بادشاہو تسی چار جتیاں انج مار لو جے ذلی ہی کرنا جے /،بادشاہ ہو اگر آپ نئے مجھے ذلیل ہی کرنا ہے تو چار جوتیاں ویسے ہی مار لیں۔ اتنے میں انصر جاوید واپس آ گئے اور انہوں نے آتے ہی مجھ سے پوچھا کہ آپ نے کہیں پیسے تو ادا نہیں کر دیئے۔ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں ان کی مہمان نوازی پر آنچ نہ آ گئی ہو۔ میں نے

انہیں بتایا کہ یہ برادر اپنی محنت کی اجرت قبول کرنے سے انکاری ہے۔ اس پر انصر جاوید نے پورے اصرار کے ساتھ ہئیر ڈریسر کو اجرت ادا کرنے کی کوشش اس وقت تک جاری رکھی جب تک وہ ناراض نہیں ہو گیا۔ یہ ہئیر ڈریسر اتنا مہمان نواز تھا کہ اس نے تو بال کاٹتے ہوئے مجھ سے سیاست حاضرہ پر گفتگو بھی نہیں کی۔

ایک انگریز "مصلی" سے ملاقات

اس پاکستانی ہئیر ڈریسر کی دکان پر ایک انگریز اپنے پانچ چھ سال کے بیٹے کے بال کٹوانے آیا ہوا تھا۔ انگریزوں کے بچے انتہائی پیارے ہوتے ہیں۔ یہ بچہ پیارا بھی تھا اور بہت ہنس مکھ بھی جب میں نے اس سے چھیڑ چھاڑ کے لئے اپنے قیام امریکہ کے زمانے کے دو چار "ٹوٹکے " استعمال کئے تو اس کے بے پناہ معصوم کھلکھلاہٹ سے دکان مور ہو گئی۔ انگریز اپنے بچوں سے بہت پیار کرتے ہیں اور جب کوئی دوسرا بھی ان کے بچوں سے محبت کا اظہار کرے تو انہیں بے حد مسرت ہوتی ہے۔ دراصل پوری دنیا کے انسان اپنے ظاہری رویوں میں ایک اور نیک ہیں۔ صرف معاشرتی دباؤ ان کے رویوں میں تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ انگریز بھی بچے سے محبت دیکھ کر پگھل گیا اور اس کے لہجے میں بے تکلفی اور خلوص کی حلاوت محسوس ہوئی۔ اس کا تعلق معاشی اور معاشرتی لحاظ سے یہاں کے نچلے طبقے سے تھا۔ ہمارے ہاں سے جو لوگ چند دنوں کے لئے یورپ یا امریکہ جاتے ہیں۔ انہیں ہر گورا شہزادہ اور ہر گوری شہزادی لگتی ہے۔ حالانکہ ان میں بھی مصلی اور مصلتیں ہوتی ہیں۔ بلکہ ولایت سے جو انگریز بیویاں پاکستان لائی جاتی ہیں ان میں اکثر مصلتیں ہی ہوتی ہیں۔ بادی النظر میں یہ معاشرہ غیر طبقاتی نظر آتا ہے۔ حالانکہ ہاں بھی تمیز بندہ و آقا بہت زیادہ ہے۔ صرف اس کے اظہار کا طریقہ مختلف ہے۔ جس انگریز سے مجھے گپ شپ کا موقع مل رہا تھا وہ بھی "مصلی" تھا ورنہ "خاندانی " انگریز تو میر تقی میر کی طرح محض اپنی زبان خراب ہونے کے اندیشے سے "چپ شاہ" کا روزہ رکھ لیتے ہیں۔

اگر فردوس بر روئے زمین است بریڈ فورڈ اردو زبان و ثقافت کا اتنا زور ہے کہ شہر کے ٹاؤن ہال کے باہر والے فرش پر انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی عبارتیں لکھی گئی ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں یہاں غالباً اقبال کی کوئی مختصر سی نظم کھود کر لکھی گئی تھی۔ گزشتہ برس یہاں کے پاکستانی کونسلر نے مجھے بریڈ فورڈ کے پاکستانیوں کا یہ کارنامہ دکھایا۔ دراصل گزشتہ برس بریڈ فورڈ کے علاوہ اس کے گرد و نواح کے علاقے میں تفصیل سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ غلام قادر آزاد نیو کاسل سے لندن تک کا طویل سفر طے کر کے آئے اور مجھے مختلف شہروں میں گھماتے پھراتے بریڈ فورڈ لے آئے جہاں میرے کراچی کے دوست ڈاکٹر طارق بھی گھماتے پھراتے بریڈ فورڈ لے آئے جہاں میرے کراچی کے دوست ڈاکٹر طارق بھی موجود

تھے۔ ڈاکٹر طارق برس با برس بریڈ فورڈ میں رہے ہیں۔ بلکہ ان کے والدین اب بھی یہاں ہیں۔ نیو یارک کی بی بی یہاں میری ملاقات ایک میم سے ہوئی جو چہرے کو فروغ مے سے فراواں کئے ہوئے تھی۔ میں اپنے جوس کاٹن ہاتھ میں پکڑے اس کے پاس گیا۔ ہائے ایک تو یہاں ہر کسی کو دیکھ کر ہائے کہنا پڑتا ہے۔ ہائے اس نے مجھ سے زیادہ گرم جوشی سے میرے ہائے کا جواب دیا۔ معافی چاہتا ہوں میں تمہارے اور حسن فطرت کے درمیان حال ہوا۔ لعنت بھیجو حسن فطرت پر۔ میں تو کسی انسان سے بات کرنے کو ترس گئی تھی۔ بیٹھو۔ میں اس بد ذوق خاتون کے پاس بنچ پر بیٹھ گیا۔ لوگ تو اتنی دور سے یہ خوبصورت جگہ دیکھنے آتے ہیں مگر تم تو مجھے بہت بور ہوئی لگی ہو۔ میں بھی بہت دور سے یہ جگہ دیکھنے آئی تھی۔ میرا ارادہ یہاں اک ہفتہ قیام کا تھا۔ مگر میں تین دن قیام کے بعد آج ہی واپس جا رہی ہوں۔ تم کہاں ہو؟ میں نیو یارک سے آئی ہوں۔ اوگاڈ وٹ اے سٹی ہر طرف انسان ہی انسان نظر آتے ہیں وہاں کی شامیں کتنی خوبصورت ہیں نائٹ کلب، فرینڈز، میوزک، ڈانس، یہاں ان چیزوں کے صرف منی ایچرز ہیں۔ میں درختوں پہاڑوں اور جھیل کو دیکھ کر تنگ آ گئی ہوں۔ انسان کی شکل ہی نظر نہیں آتی۔ تم نے ورڈ زور تھ کا مکان دیکھا ہے ؟ ہاں مگر جب ہم لوگ وہاں گئے۔ اس وقت مقفل تھا۔ اگر مقفل نہ بھی ہوتا تو کیا فرق پڑتا تھا۔ ایسے مقامات صرف ڈائری میں درج کرنے کے لئے ہوتے ہیں کہ ہم نے یہ مقامات دیکھے وہ تم بھی درج کر لینا۔ نیو یارک کی یہ بی بی واقعی نیو یارک کی جائز اولا د تھی۔ اللہ لوک ڈسٹرکٹ لیک میں گھومتے ہوئے میں نے اپنا کیمرہ ایک نوجوان کو دیا کہ ہم لوگوں کی ایک تصویر بنا دو۔ اس نوجوان کے ساتھ اس کے ماں باپ بھی تھے۔ اس نے تصویر کھینچنے کی بجائے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ میں نے اسے دوبارہ تصویر بنانے کے لئے کہا اس نے دوبارہ ہنسنا شروع کر دیا۔ پھر میں نے غور سے دیکھا تو اس کے منہ سے رالیں بہہ رہی تھیں اور اس کی آنکھوں میں دیوانگی کی مجصوص وحشت بھی تھی۔ یہ بچارا اللہ لوک تھا۔ شکر ہے اس نے کیمرہ جھیل میں نہیں پھینک دیا۔ مجھے یہ بات بے حد اچھی لگی کہ اس کے والدین نے اسے معذوروں کے کسی ادارے کے سپرد کرنے کی بجائے اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ اور خود سیر پر آتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لے کر آئے تھے اور اس کی پوری طرح دیکھ بھال کر رہے تھے۔ اسی طرح دو تین مناظر میں نے ایسے بھی دیکھے کہ معذور بیوی کو اس کے خاوند نے وہیل چیئر میں بٹھایا ہوا ہے اور اسے سیر کرا رہا ہے۔ براؤنٹی سسٹرز بریڈ فورڈ سے ڈسٹرکٹ لیک روانہ ہوتے ہوئے شہر سے چار پانچ میل کے فاصلے پر براؤنٹی سسٹرز کا قصبہ ہے۔ بریڈ فورڈ سے اس قصبے تک پہنچنے کے لئے اتنی اترائی ہے کہ انسان چکرا جاتا ہے۔ گھاٹیاں دیکھ کر مجھے استنبول کے گلی کوچے یاد آ گئے۔ کیونکہ استنبول بھی پہاڑیوں پر واقع ہے۔ چنانچہ کوئی سڑک بانس کی طرح سیدھی نظر آتی ہے اور اس کے بعد یکایک اتنا نیچے جانا پڑتا ہے کہ لگتا ہے کہ پاتال میں اتر رہے ہیں۔ براؤنٹی سسٹرز کا گھر دیکھنے کے لئے ہمیں بھی پاتال میں اترنا پڑا لیکن ان کے گھر کو جانے والی شرک ایک دفعہ پھر بانس کی طرح ہمارے سامنے کھڑی ہو گئی۔ براؤنٹی سسٹرز کئی صدی پہلے ایک پادری کے ہاں پیدا ہوئیں اور اس وقت کے گھٹے گھٹے ماحول میں ناول نگاری کا آغاز کیا اور اس میں بہت مقام حاصل

کیا۔ ان کی وفات ٹی بی کی وجہ سے ہوئی۔ براؤنٹی سسٹرز کے گھر کو میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا۔ سب کچھ اس مکان میں محفوظ ہیں اور انسان ایک دم خود کوئی سو برس پرانے انگلینڈ میں محسوس کرتا ہے۔ یہاں وہ چرچ بھی موجود ہے جہاں ان کا باپ پادری تھا اور ان کا آبائی قبرستان بھی جہاں وہ دفن ہیں۔ یہ چھوٹا سا بے حد خوبصورت قصبہ ہے۔ میں غلام قادر آزاد، حضرت شاہ اور ڈاکٹر طارق بہت دیر تک بلا مقصد یہاں گھومتے رہے۔

ایک ضروری بات

جب بریڈ فورڈ سے اعجاز کے ساتھ میں حسن رضوی، طارق طور اور خالد احمد واپس لندن کے لئے ورانہ ہونے لگے تو طارق طور نے کار میں بیٹھنے سے پہلے مجھے کہا "آپ سے ایک ضروری بات کرنا ہے " میں یہ بات گزشتہ دو دنوں سے کرنا چاہ رہا تھا مگر موقع نہیں مل سکا۔

ذرا ادھر گوشے میں آ جائیں۔ بات یہ ہے "طارق نے راز داری سے کہا " انگلینڈ میں گرد بالکل نہیں ہے "۔

پھر وہی لندن بریڈ فورڈ سے لندن واپس پہنچنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ سفر تمام ہو گیا چلنا تھا۔ اب پھر وہی ساؤتھ ہال کا علاقہ تھا۔ اعجاز احمد اعجاز کا گھر تھا، میں خالد احمد اور طارق طور تھے اور دوستوں کی ٹولیاں تھیں جو لندن شہر کی مصروف زندگی کے بارے میں سب حکایتیں جھوٹ قرار دینے پر تلی ہوئی تھیں کہ ان دوستوں نے لندن میں ہمیں پردیسی ہونے کا احساس ہونے ہی نہیں دیا۔ ورنہ جب میں ۸۷ء میں یو ایس آئی ایس کی دعوت پر مختلف سیمیناروں میں شرکت کی خاطر چھ ہفتے کے لئے امریکہ گیا تو جن شہروں میں پاکستانی دوست نہیں تھے وہاں امریکیوں کی پے درپے سرکاری نوعیت کی ضیافتوں اور شدید قسم کی مصروفیات کے باوجود پردیسی ہونے کا احساس اتنا غالب رہا کہ میں اگر کچھ اور عرصہ اور وہاں رہتا تو اپنا تخلص "پردیسی" رکھ لیتا اور خاصے رقت آمیز قسم کے شعر کہتا۔ کچھ اس سے ملتا جلتا تجربہ مجھے چین میں بیس روزہ قیام کے دوران بھی ہوا تھا مگر وہاں پریشان خشک، پروین شاکر اور مہتاب چنا ساتھ تھیں اور ایک فائدہ یہ تھا کہ ہمارے چینی میزبان ہماری زبان نہیں سمجھتے تھے چنانچہ ہم ان کی موجودگی میں بھی دل پشوری کر لیتے تھے جبکہ امریکہ میں یہ سہولت حاصل نہ تھی۔ کیونکہ ہم پندرہ ملکوں کے مندوبین ایک دوسرے سکے ساتھ گفتگو بہ زبان انگلیسی کرنے پر مجبور تھے۔ لندن کا معاملہ ان دونوں مقامات سے مختلف تھا کیونکہ یہاں انگریزی تو کیا اردو میں بھی بات کرنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ براہ راست پنجابی چلتی تھی۔ اردو سے مجھے بے پناہ محبت ہے لیکن اگر کسی پنجابی سے اردو بولنا پڑے تو مجھے چھینکیں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔

شاعری اور بجلی کا کھمبا

برطانیہ کے دورے کے دوران خالد احمد کی معیت کا مجھے ایک فائدہ یہ ہوا کہ موصوف کے ادبی نظریات و تعصبات اور ذاتی دوستیوں دشمنیوں کے صحیح پس منظر سے پہلی دفعہ آگاہی ہوئی۔ میں اور خالد احمد کئی کئی راتیں جاگ کر مختلف مسائل پر لمبی لمبی بحثیں کرتے رہے جس کے نتیجے میں خالد احمد اپنی اخفاء کی پالیسی پر عمل پیرا نہ ہو سکا اور اس کی نظریاتی قبض دور ہو گئی۔ دراصل خالد احمد بنیادی طور پر ہیو مینٹرین انسانی دوست ہے۔ وہ جن افراد اور نظریات کو پسند کرتا ہے اس کے پس منظر میں عموماً انسان بنیادی حوالہ ہوتا ہے بلکہ وہ بسا اوقات اچھے انسان کو اچھا تخلیق کار اور برے انسان کو برا تخلیق کار بھی سمجھنے لگتا ہے مگر وہ اپنی گفتگوؤں اور تحریروں میں اصل وجہ چھپا جاتا ہے اور اپنی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے اجر یا انتقام کے لئے کسی اور چیز کو بنیاد بناتا ہے چنانچہ اس کی محبت یا نفرت کے ہدف کو سمجھ نہیں آتی کہ وہ خالد احمد کی محبت کے منبع تک کس طرح رسائی حاصل کرے یا سکے تابڑ توڑ حملوں سے بچنے کے لئے کسی مورچے میں پناہ لے یا خود کشی کر لے ؟ خالد احمد اخفاء کی پالیسی پر اتنی دیانت داری سے عمل کرتا ہے کہ اگر اپنا لکھا ہوا کالم اس کی سمجھ میں آ جائے تو اسے ضائع کر دیتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا کالم لکھتا ہے۔ قارئین اگر اس کی کچھ بے پناہ خوبصورت نثری تحریریں پڑھنا چاہیں تو وہ میرے پاس موجود ہیں، یہ وہی تحریریں ہیں جنہیں دوسری دفعہ پڑھنے کا موقع اسے نہیں ملا تھا۔ شاعر تو خیر بے پناہ ہے ہی، مگر مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ اپنی شاعری پر بھی نظر ثانی کا سلسلہ نہ شروع کر دے۔ ویسے چلتے چلتے خالد احمد کی شاعری میں موجود موسیقیت کا ایک راز آپ کو بتاتا چلوں خالد احمد اور نجیب احمد آدھی رات کو گھروں سے باہر نکل آتے ہیں اور نسبت روڈ کی گلیوں میں پھرتے رہتے ہیں، خالد احمد پر جب غزل کا نزول ہوتا ہے تو نجیب احمد قرب و جوار سے کوئی اینٹ ڈھونڈ کر لاتا ہے اور بجلی کے کھمبے پر تال دیتا ہے۔ خالد احمد کی شاعری کے نکھار میں واپڈا کے کھمبوں کا اتنا کنڑی بیوشن ہے کہ اس نے اظہار تشکر کے طور پر باقاعدہ واپڈا میں ملازمت کر لی ہے۔ لندن اور برطانیہ کے دوسرے شہروں میں خالد احمد میرا بہترین رفیق ثابت ہوا۔ اگر آپ اسے سمجھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو وہ بہترین شاعر تو ہے ہی، بہترین انسان بھی ہے۔ اس میں ایثار اور قربانی کا جذبہ حد سے زیادہ ہے۔ وہ ایک خوبصورت آدمی ہے اور سب کو خوبصورت دیکھنا چاہتا ہے،جو اسے خوبصورت نظر نہیں آتا، اسے "نوندریں " مار مار کر اور بد صورت بنا دیتا ہے اور جسے یہ خوبصورت سمجھتا ہے۔ اسکے چہرے کے گرد نور کا اتنا بڑا ہالہ بنا دیتا ہے کہ اس کا اصل انسانی چہرہ کسی کو نظر ہی نہیں آنے دیتا مگر بیشتر اس کے کہ میرا سفر نامہ خالد کے شخصی خاکے میں تبدیل ہو جائے، مجھے اعجاز کے گھر سے نکل کر فوراً لندن کی سڑکوں پر آ جانا چاہئے۔ حسن رضوی رات کو عاشور کاظمی سے

اجازت لے کر ہماری طرف آگیا تھا اور اب اس کا ارادہ ہمارے ساتھ رہنے کا تھا کیونکہ اسے وہاں رات کو اکیلے میں ڈر لگتا تھا۔ اس وقت خالد، طارق، حسن اور میں نے ڈرائنگ روم میں ڈیرہ جمایا ہوا ہے۔ خالد خوفناک قسم کے خراٹے لے رہا ہے جبکہ لوگ بیٹھے چائے پی رہے ہیں۔ اس وقت صبح کے آٹھ بج رہے ہیں، اعجاز آج ہمارے اصرار پر کام پر گیا ہے۔ میں خالد احمد کو جگانے کی کوشش کرتا ہوں تا کہ تیار ہو کر نکلا جائے۔ وہ نیم خوابی کے عالم میں بڑ بڑاتا ہے۔ "تم تیار ہو جاؤ میں تم سے پہلے تیار ہو جاؤ گا" میں نے کرنا ہی کیا ہے شیو کرنا ہے، نہانا ہے، باتھ روم جانا ہے۔ مارے گئے، آخری مصروفیت سن کر طارق طور ماتھے پر باتھ مار کر کہتے ہیں۔ میرے خیال میں آج باہر جانے کا پروگرام ملتوی کر دیں۔ مگر مجھے خالد احمد کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے کچھ گر آتے ہیں جو میں فوری طور پر استعمال میں لاتا ہوں جس کے نتیجے میں خالد احمد ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے اور پھر ہم دس بجے کے قریب گھر سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن سڑک پر قدم رکھتے ہی سامنے ایک جانا پہچانا چہرہ نظر آتا ہے جو سیدھا ہماری طرف آ رہا ہے۔

پھر وہی لندن

محفل دوستاں عاشور کاظمی کی ضیافت میں پہنچنے کا وقت تھا چنانچہ ہم نے قریبی ٹیوب اسٹیشن سے ونڈر میئر کا ٹکٹ لیا اور تھوڑی دیر بعد ہم عاشور کے ڈرائنگ روم میں تھے جہاں، رشید منظر، بخش لائل پوری، امجد اسلام امجد، ابرار ترمذی، اعجاز احمد اعجاز، باقر نقوی، جاوید حکیم قریشی، انور خالد، قیصر امام اور تنویر پہلے سے موجود تھے۔ جاوید حکیم قریشی پاکستان میں ایم پی اے رہے ہیں اور ایک فعال سیاست دان کے طور پر معروف ہیں۔ مگر اب طویل عرصے سے لندن میں ہیں۔ پیپلز پارٹی سے ان کے اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ چنانچہ پی پی پی حکومت کے باوجود پاکستان واپس آنے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اب غلام مصطفی کھر پیپلز پارٹی میں واپس آ گئے ہیں تو جاوید حکیم قریشی بھی کچھ عرصے کے حالات کا جائزہ لینے ہی کے لئے شاید پاکستان آئیں مگر میری ان سے محبت ان کی سیاسی وابستگیوں سے ہٹ کر ہے۔ وہ ڈاکٹر صفدر محمود کے عزیز دوست ہیں اور مجھے دوست کا بھی دوست عزیز ہوتا ہے۔ گزشتہ برس ان کے ساتھ ایک پورا دن لندن سے سو کلو میٹر دور ایک بیچ پر گزارا تھا۔ ہم پندرہ بیس خاندانی ایشیائی سمیت پوری بس ہائر کر کے وہاں پہنچے تھے مگر اس روز سورج نہ نکلنے کی وجہ سے سارا دن وہاں ٹھٹھرتے رہے اور پھر شام کو خیر سے گھر کو لوٹ آئے سب دوست عاشور کاظمی کی اس پارٹی میں پہنچ چکے تھے صرف عالمی اردو کانفرنس والے علی صدیقی کا انتظار تھا جو ان دنوں لندن آئے ہوئے تھے اور ایک روز بیشتر ہماری ان سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔

انہوں نے ہمارے سامنے بھی آنے کا وعدہ کیا تھا مگر وہ ابھی تک نہیں پہنچے تھے جس کی وجہ سے عاشور کاظمی خاصے مضطرب تھے۔ جب یہ طے پا گیا کہ علی صدیقی نہیں آئیں گے تو میز پر کھانا چن دیا گیا اور پھر اس کے بعد دیار غیر میں رات گئے تک دوستوں کی یہ محفل جمی رہی۔ یہاں مقیم پاکستانی، پاکستان کے بارے میں بہت متشوش رہتے ہیں ان کے کان کوئی اچھی خبر سننے کے لئے ترسے ہوئے ہیں مگر انہیں بہت عرصے سے کوئی نوید موصول نہیں ہوئی۔ اس محفل میں بھی پاکستان کے حالات زیر بحث آئے مگر حال کے حوالے سے مستقبل میں کسی بڑی انقلابی تبدیلی کے امکان کا کسی کو یقین نہیں تھا۔ مجھے بھی بظاہر یہی لگتا ہے لیکن میرا وجدان مجھ سے متفق نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں زندگی کا ہر شعبہ جس بری طرح زوال کی زد میں آیا ہے اور نچلے طبقے سے لے کر اوپر والے طبقے تک کو کسی نہ کسی صورت میں اس کا جو خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے اس کے نتیجے میں صورت ہال جوں کی توں ہیں رہ سکتی اب تو صورت ہال یہ شہر وہ ہے جس میں کوئی گھر بھی خوش نہیں داد ستم نہ دے کہ ستم گر بھی خوش نہیں

والی ہو چکی ہے اور اس صورت ہال میں ایک بڑا آپریشن ہمیشہ ناگزیر ہو جایا کرتا ہے اور میرا وجدان کہتا ہے کہ یہ آپریشن جلد یا بدیر ہونے والا ہے ظلمت شب کو کافور ہونا ہی ہونا ہے۔ اور اس صبح نے طلوع ہو کر رہنا ہے جس کے لئے ہم نے لاکھوں جانوں اور عصمتوں کی قربانی دی تھی۔

ہم جنسو ں کے کلب میں

لندن میں افتخار سے ابھی تک صرف فون پر ہی ملاقات ہوئی تھی اور جی چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ وقت گزار ا جائے۔ افتخار قیصر خوبصورت نوجوان شاعر ہے۔ اس کا تعلق پنجاب کے قصبے چشتیاں سے ہے۔ افتخار کے "طور اطوار" یورپ میں مقیم پاکستانیوں سے قدرے مختلف ہیں۔ دراصل مغرب میں پاکستانی فیملز کا آپس میں گہرا میل جول ہے۔ یہ بے حد اچھی بات ہے لیکن مقامی آبادی سے مکمل طور پر الگ تھلک رہنے سے باہمی افہام و تفہیم میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ افتخار احمد اس نکتے کو سمجھتا ہے بلکہ زیادہ ہی سمجھتا ہے چنانچہ اس نے انگریز خاندانوں سے اپنے روابط خاصی "مضبوط بنیادوں " پر استوار کئے ہیں، ان کے گھروں میں آتا جاتا ہے بلکہ ایک دفعہ چلا جائے تو "ضعف دماغ" کی وجہ سے واپس نہیں آتا۔ بقول ظفر اقبال۔

ظفر ضعف دماغ اب اس سے زیادہ اور کیا ہو گا

وہاں جاتا ہوں اور پھر واپس آنا بھول جاتا ہوں

جب اعجاز کے گھر اس کا فون آیا، اس وقت "چار کے ٹولے " میں سے صرف میں گھر پر تھا چنانچہ وہ مجھے اپنی کار میں بٹھا کر لے گیا۔ لندن کی شام بلکہ رات میں نے افتخار قیصر کے ساتھ پکاڈلی اور لندن کے با رونق علاقوں کی
سڑکوں،ریستورانوں اور تفریحی مقامات کا "جائزہ" لیتے لیتے گزاری۔ ایک نائٹ کلب کے باہر بہت سے مرد زن جمع تھے، سیاہ کوٹ، سیاہ رنگ کی بو، سیاہ پتلون اور سفید قمیض میں بہت سے مرد و زن جمع تھے، سیاہ کوٹ، سیاہ رنگ کی بو، سیاہ پتلون اور سفید قمیض میں ملبوس کلب کا ملازم اندر جانے کے خواہش مند گاہکوں کی "حوصلہ افزائی" کرنے کی بجائے ان کے راستے میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ مجھے اور افتخار دونوں کو حیرت ہوئی کہ یہ عجیب دکاندار ہے جسے گاہک پسند نہیں ہیں۔ اس پر ہم دونوں کا فطری تجسس بیدار ہوا اور ہم نے اندر جانے کی ٹھان لی مگر اس سیاہ پوش نے ہمیں اندر دروازے تک بھی نہ پہنچنے دیا اور "ظالم سماج" کی طرح راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ تم لوگ اندر نہیں جا سکتے۔ کیوں ؟ آج کی شام صرف ہم جنس پرستوں کے لئے مخصوص ہے واقعی ؟ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ہاں مگر اس میں حیرت کی کون سی بات ہے ؟ اس نے خفگی کے عالم میں کہا۔ نہیں نہیں حیرت کی تو واقعی کوئی بات نہیں میں نے اپنے لہجے پر قابو پاتے ہوئے کہا لیکن کیا ہم لوگ مبصر کے طور پر بھی اندر نہیں جا سکتے ؟ نہیں تماش بینوں سے کلب کا "تقدس" مجروح ہوتا ہے۔ میں نے بمشکل اپنی ہنسی کنٹرول کی۔ یورپ والوں نے اپنے فلسفوں کے دفاع میں لفظوں کا تقدس بہت بری طرح مجروح کیا ہے۔ اب ہم پھر سڑک پر تھے۔ یار یہ تماشا دیکھنا ضرور چاہئے میں نے افتخار سے کہا میرا بھی جی چاہتا ہے۔ پھر کیا کیا جائے ؟ ایک دفعہ پھر کوشش کرتے ہیں۔ مگر وہ سیاہ پوش تو ہمیں پہچان لے گا۔ میرے پاس ڈبل جیکٹ ہے میں اسے الٹا کر کے پہن لیتا ہوں آپ ٹائی اتار لیں کوٹ کے کالر اوپر کر لیں۔ اور آنکھوں میں کچھ بے حیائی بھی پیدا کی جائے ؟ یاں یہ بھی ضروری ہے۔ افتخار نے ہنستے ہوئے کہا۔ تھوڑی دیر بعد ہم دوبارہ اس سیاہ پوش کے حضور میں کھڑے تھے۔ تم لوگ اندر نہیں جا سکتے۔ اس نے ہاتھ کی دیوار بناتے ہوئے کہا۔ کیوں ؟ تم لوگ ہم جنس پرست نہیں ہو۔ "تم ہمارے کردار پر شک کر رہے ہو" مصنوعی غصے کے ساتھ یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں میرا اپنا برا حال ہو گیا۔ ہم اس کلب میں داخلے کے پوری طرح مستحق ہیں۔ راستہ چھوڑ دو۔ تم لوگ اگر اپنی ضد سے باز نہ آئے تو میں پولیس کو فون کر دوں گا۔ اس نے دھمکی دی۔ اس فیلڈ میں میرا عمر بھر کا تجربہ ہے میں شکل دیکھ کر پہچان جاتا ہوں تمہارے چہرے پر وہ روشنی ہی نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم بد کردار تھے اور ہمارے چہروں پر پھٹکار برس رہی تھی۔ اب کیا کیا جائے۔ ایک دفعہ پھر واپس سڑک پر آنے کے بعد میں نے افتخار سے کہا۔ اب تو کچھ بھی ہو جائے اندر ضرور جانا ہے۔ مگر کیسے ؟ وہ ایسے کہ آپ کوٹ اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیں، میں جیکٹ اتار دیتا ہوں کنگلی لیں اور بالوں کا اسٹائل ینچ کر یں نیز وقفہ ڈالنے کے لئے ہم سامنے والے ریستوران میں آدھ پون گھنٹہ گزارتے ہیں۔ اس کے بعد سیاہ پوش کے ساتھ ہاتھ ملائے بغیر پورے اعتماد کے ساتھ اس کے برابر سے گزر جائیں۔ رام بھلی کرے گا۔ کوئی اور ہدایت؟ ہاں ایک ہدایت اورہے۔ افتخار نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ کیا ہے ؟ اس

سیاہ پوش کے برابر سے گزرتے ہوئے ہم نے اس بے تکلفی کا مظاہرہ کرنا ہے، جس بے تکلفی کا مظاہرہ پاکستان میں گہرے دوست ایک دوسرے کے ساتھ سڑکوں پر گھومتے ہوئے کرتے ہیں۔ کیا مطلب ؟ مطلب یہ کہ ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اس سیاہ پوش کے برابر سے گزرنا ہے تا کہ اسے یقین ہو جائے کہ ہم اس کے "ہم مشرب" ہیں اور ہاں اگر میں اس کے قریب سے گزرتے ہوئے آپ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دوں تو پلیز مائینڈ نہ کیجئے گا۔ اس بد بخت کی مزید تسلی ہو جائے گی۔ قبول ہے۔

بس ایک دفعہ ہی ٹھیک ہے خدا کے لئے یہ جملہ کہیں تین دفعہ نہ کہہ دیں، یہاں تو یہ لوگ آپس میں شادیاں بھی کرتے ہیں کہیں لینے کے دینے نہ پر جائیں۔ افتخار کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ہمارا یہ تیسرا حملہ کامیاب ثابت ہوا اور ہم آٹھ آٹھ پاؤنڈ کا ٹکٹ خرید کر اس سومنات میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے جہاں ایک جسمانی اور ذہنی کجی یا معذوری کو فلسفے کو روپ دیا گیا تھا اور اب اس فلسفے کا بت بنا کر یہاں اس کی پوچا کی جا رہی تھی۔ اندر سائیکا ڈ یلک لائٹس تھیں، کانوں کے پردے پھاڑ نے والا میوزک تھا۔ اور اس میوزک پر مرد وزن پاگلوں کی طرح ناچ رہے تھے۔ یہاں وہ مرد تھے جو عورت کی شکل دیکھنے کے روادار نہ تھے اور ڈانسنگ فلور پر وہ عورتیں تھیں جنہیں مردوں کا نام سننا بھی گوارا نہ تھا چنانچہ مرد مردوں کے ساتھ ناچ رہے تھے اور عورتیں، عورتوں کی کمر میں ہاتھ ڈالے رقص میں مشغول تھیں۔ اس تقسیم میں محرم یا نا محرم والا "شرعی عذر" نہیں تھا بلکہ یہ تقسیم سراسر غیر شرعی عذر کی وجہ سے تھی ہال کے چاروں کونوں میں تقریباً دس فٹ بلند میزیں دھری تھیں جن پر سیکسی لباس میں ملبوس ہیجڑے "ہیجان" انگیز ناچ سے تماشائیوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے میں مشغول تھے سامنے ایک بالکونی ٹائپ چیز تھی جس میں ایک موٹی سی عورت کھڑی منہ سے آگ نکال رہی تھی۔ یہاں ویٹرسز کی بجائے کم عمر ویٹر تھے جو اپنے ہونٹوں کو سرخی سے مسکائے ہوئے تھے۔ ہال کی راہداریوں میں میزیں بچھی تھیں۔ خواتین علیحدہ میزوں پر اور مرد علیحدہ میزوں پر بیٹھے ناؤ نوش میں مشغول تھے۔ ڈانس کا راؤنڈ مکمل ہونے پر چند لمحوں کے لئے ہال کی بتیاں آف ہو جاتی تھیں جس پر مکمل خاموشی چھا جاتی تھی اور بتیاں آن ہونے پر آواز کسنے کے انداز میں شور مچایا جاتا تھا۔ یہ ذہنی مریضوں کا اجتماع تھا جسے اب مغرب میں قانونی طور پر جائز قرار دے دیا گیا ہے اور اندیشہ ہے کہ کل کلاں یہاں کے قانون ساز ادارے اسے کہیں لازمی قرار نہ دے ڈالیں۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہمارا دم گھٹ جائے گا۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد ہم ہال سے باہر تھے۔ سیاہ پوش چوکیدار کے برابر سے گزرتے ہوئے میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا "ہم تمہارے کلب کا تقدس مجروح کر کے جا رہے ہیں " اس بے حرمتی پر ہم تہ دل سے معافی کے خواست گار ہیں۔ اس رات بستر پر دراز ہوتے ہوئے میں نے معروضی طور پر ان لوگوں کا مسئلہ سمجھنے کی کوشش کی جن کے "معبد" میں ہم نے کچھ وقت گزارا تھا اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مغرب کی تہذیب واقعی اپنے ہاتھوں سے آپ خودکشی کرنے پر تلی ہوئی ہے کیونکہ ان کے بیشتر فلسفوں کا آشیانہ شاخ نازک پر بنا ہے۔ "ہم جنس" پرستی اطباء اور ماہرین نفسیات کے نزدیک ایک جسمانی اور ذہنی معذوری ہے اور اس کا وجود آج سے نہیں صدیوں سے ہے۔ بہت سے معروف یونانی فلاسفہ اور

دنیا کی کئی دوسری نامور شخصیتیں قدرت کی اس ستم ظریفی کا نشانہ بنی ہیں۔ یہ طبقہ ہمارے یہاں بھی قابل ذکر تعداد میں موجود ہے مگر مغرب میں گھپلا یہ ہوا ہے کہ وہاں برائی کو پہلے فلسفے کی شکل دی جاتی ہے۔ اسے خوش نما رنگوں میں پیش کیا جاتا ہے اور جب اس برائی کے لئے مارکیٹ پیدا ہو جاتی ہے تو صنعتکار میدان میں کود پڑتا ہے اور اپنی مصنوعات کے ڈھیر لگا دتا ہے۔ مثال کے طور پر جنسی بے راہروی ہی کو لیں پہلے فری سیکس کا نظریہ پیش کیا گیا، اس کے نفسیاتی، جسمانی بلکہ، روحانی فائدے تک گنوائے گئے اور اس کے ساتھ ہی اسے اتنی بڑی انڈسٹری بنا دیا کہ سویڈن ایسے مثالی نظام کے حامل ملک کی سری آمدنی اسلحہ سازی کے بعد بلیو فلموں کی رہین منت ہے۔ بلیو فلموں کے علاوہ سینکڑوں عریاں اخبارات اور جرائد کی انڈسٹری ہے جو دھڑا دھڑ اپنی مصنوعات مارکیٹ میں پھینک رہے ہیں۔ قحبہ خانوں کی انڈسٹری ہے جہاں عورتوں کی تذلیل کے لئے انسانیت سوز روئیے اپنائے گئے ہیں۔ مصنوعی جنسی اعضاء کی انڈسٹری ہے۔ فیکٹریوں میں ربڑ کی عورتیں تیار کی جا رہی ہیں یہ ایک علیحدہ انڈسٹری ہے۔ عریانی کے لئے راہ ہموار کرنے کے بعد صنعتکار عریان ملبوسات میں نئے نئے ڈیزائن تیار کر کے مارکیٹ میں پھینکتے ہیں۔

ہم جنسو ں کے کلب میں ہیمبرک، ایمسٹرڈیم، نیو یارک اور دوسرے مہذب شہروں میں عورت اور مرد کی تذلیل کے مظہر بد ترین اسٹیج شوز کے ذریعے سرمایہ اندوزی کی جاتی ہے اور برہنہ ساحل بطور انڈسٹری وجود میں آئے ہیں۔ جس سے وابستہ ادویات کی انڈسٹری اس کے علاوہ ہے۔ پہلے معاشرے کو ایڈز میں مبتلا کیا گیا ہے اور اب اس کی ادویات سے کھربو ڈالر کمائے جا رہے ہیں۔ جنسی بے راوہری کا فلسفیانہ جواز پیش کیا گیا تھا۔ جنس اور اس سے وابستہ ہر اسرار سے پردہ اٹھانے سے جنس کے ضمن میں لوگوں کا رویہ نارمل ہو جائے گا۔ نہ صرف کہ کہ یہ نظریہ درست ثابت نہیں ہوا بلکہ اس نے مغرب کے انسان کو پہلے سے زیادہ مریض بنا دیا ہے اور اب شام کے بعد کسی عورت کا کسی تنہا سڑک پر نظر آنا اس کے لئے خطرے سے خالی نہیں۔ چند برس پہلے نیو یارک میں ایک گھنٹے کے لئے بتی چلی گئی تھی جس کے دوران سینکڑوں عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ مغرب کے دانشور اسے ذہنی مرض قرار دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی صنعتکار ان "ذہنی مریضوں " کے لئے فوری طور پر جنسی تشدد، جبر اور اذیت رسانی پر مشتمل فلمیں اور دیگر مصنوعات تیار کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے تا کہ اس مرض کے صارفین کی تعداد میں اضافہ کیا جا سکے۔ مغرب کے صنعتکاروں نے ہم جنس پرستی کو بھی ایک بہت بڑی صنعت بنا دیا ہے۔ دراصل کیپٹلزم دنیا کا ساک ترین نظام ہے۔ یہ انسان کو انسان نہیں "کومو ڈیٹی" سمجھتا ہے چنانچہ ان کے لئے ہم جنسی کے مریض بھی ایک "کوموڈیٹی" ہیں۔ یہ لوگ عموماً چمڑے کے لباس پہنتے ہیں جو ایک لحاظ سے ان کا یونیفارم ہوتا ہے۔ چنانچہ چمڑے کے ملبوسات کی انڈسٹری وجود میں آئی۔ فلمیں، رسالے، کلب، ہم جنسی کے فوائد پر مبنی لٹریچر اور اسی طرح کی بے شمار چیزوں کے ذریعے مغرب کا سرمایہ دار اپنی تجوریاں پھرنے میں مشغول ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب ہم جنس پرستوں کے بڑے بڑے کنونشن منعقد ہوتے ہیں جن میں بعض بڑی اہم شخصیتیں بھی شرکت کرتی ہیں۔ گزشتہ دنوں ایک اسی طرح کے کنونشن میں اس امر کی شدید مذمت

کی گئی کہ ایک طبقہ ہم جنس پرستی کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈے میں مشغول ہے کہ اس کی وجہ سے ایڈز کا مرض پیدا ہوا ہے۔ حالانکہ یہ بات ابھی تک محض مفروضہ ہے۔ اس کنونشن میں کچھ مطالبات بھی کئے گئے جن میں ایک یہ بھی تھا کہ ملازمتوں میں ہم جنس پرستوں کے خلاف امتیازی سلوک نہ کیا جائے۔ اس دورے کے دوران میں نے بی بی سی ٹیلی ویژن سے ایک دستاویزی فلم بھی دیکھی جس میں ان لوگوں کو "میاں بیوی" کے طور پر "خوشگوار ازدواجی زندگی" بسر کرتے دکھایا گیا تھا۔ ان میں ایک "انڈین جوڑا" بھی تھا۔ امریکہ میں ایک امرو پرست سے اس مسئلے پر میری بات ہوئی تو اس نے بہت جوشیلے انداز میں کہا کہ ہم جنس پرستی غیر فطری فعل نہیں غیر معمولی فعل ہے۔ تاریج بتاتی ہے کہ عورت کی وجہ سے ہزاروں لوگ قتل ہوئے ہیں۔ لہذا دنیا میں محبت اور اخوت کی فضا پیدا کرنے کے لئے ہم جنسی کا فروغ ضروری ہے۔ مغرب کے نظام زد کی بنیاد ہی ہوس زد پر ہے۔ وہ انسان کی فطری اور غیر فطری کمزوریوں کو مہمیز بنا دیتا ہے اور پھر اسے اپنے شکنجے میں اس طرح کس لیتا ہے کہ اس کے لئے اپنا آپ چھڑانا مشکل ہو جائے۔ لندن کے کلب میں، میں نے جن ہم جنسوں کو کانوں کے پردے پھاڑنے والے میوزک پر پاگلوں کی طرح رقص کرتے دیکھا، مغرب کا نظام زر اس بیمار اقلیت کا علاج کرنے کی بجائے، اسے اکثریت میں تبدیل کرنے میں کوشاں ہے۔ تا کہ زیادہ سے زیادہ صنعتوں کا متقاضی اس کا معاشی دھانچہ برقرار رہ سکے۔ لندن کے امرد پرستوں کے کلب کے باہر جو سیاہ پوش ہمارا راستہ روکے کھڑا تھا، وہ یہ نظام خود تھا۔ وہ ہم دو مصنوعی گاہکوں کو اندر جانے سے اس لئے روک رہا تھا تاکہ وہ ہماری وجہ سے اپنے دس حقیقی گاہکوں سے محروم نہ ہو جائے۔

ملاقاتیں

میرے خیال میں انسان جس گھر میں رہتا ہو، خواہ وہ ایک کمرے ہی پر مشتمل کیوں نہ ہو، انسان کو بے حد عزیز ہوتا ہے اور ہزار آسائشوں میں گھرے ہوئے انسان کو بھی ضرور یاد آتا ہے۔ چنانچہ اب ہم "ہوم سک" محسوس کر رہے تھے اور ہمارا دھیان بھی گھر کی طرف لگا رہتا تھا۔ ہم لوگ تقریباً ہر روز پاکستان فون کرتے اور یہ سلسلہ پہلے دن سے جاری تھا لیکن فون پر بچوں سے گفتگو کے بعد اداسی میں کچھ اضافہ ہو جاتا اس میں کمی نہ آتی۔ ایک دن میں نے نازی کو فون کیا تو پتہ چلا کہ یاسر عمر اور علی باری باری فلو بھگتا نے کے بعد اب ٹھیک ہیں مگر میں اس وہم میں مبتلا ہو گیا کہ شاید نازی مجھ سے کچھ چھپا رہی ہے۔ میں نے نازی سے کہا کہ بچوں سے میری بات کرو۔ اس نے بتایا کہ وہ باہر کھیل رہے ہیں اس روز میں نے تین دفعہ گھر فون کیا اور جب تک بچوں سے بات نہیں ہو گئی میری تسلی نہیں ہوئی اس روز میر انیس بہت یاد آئے۔

ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں

راحت نہیں ملتی کوئی دم آٹھ پہر میں

سو شغل ہو، پر دھیان لگا رہتا ہے گھر میں

پھرتی ہے سدا شکل عزیزوں کی نظر میں

سنگ غم فرقت دل نازک پہ گراں ہے

اندوہ غریب الوطنی کاہش جاں ہے

الطاف گوہر

آج دوپہر کا کھانا الطاف گوہر کی طرف تھا۔ الطاف گوہر مختلف حکومتوں میں بہت اہم عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ ایوب جان کے زمانے میں تو وہ سیکریٹری اطلاعات تھے۔ اقتدار کے ایوانوں میں جو کھیل کھیلے جاتے رہے ہیں، الطاف گوہر اس کے چشم دی گواہ بلکہ کہیں کہیں تو "وعدہ معاف گواہ" بھی رے ہیں۔ بھٹو کے زمانے میں جیل بھی کاتی جسے ہم کفارہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ الطاف گوہر حلقہ ارباب ذوق کے بہت فعال

اور پرانے اراکین میں سے ہیں۔ بھلے وقتوں میں خوبصورت شعر کہتے تھے۔ افسانے لکھتے تھے اور مختلف تحریروں میں گہرے تنقیدی شعور کا ثبوت دیتے تھے۔ اس زمانے کی تحریریں "حرفے چند" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں مگر یہ ان کی رزاقی نہیں بخیلی ہے کہ ہن تو ان سے توقع زیادہ رکھتے تھے۔ لندن کے ایک انڈین ریستوران میں الطاف گوہر صاحب سے کھانے کی میز پر مختلف ادبی موضوعات پر گپ شب کے دوران مجھے اعجاز بٹالوی مسلسل یاد آتے رہے۔ میں نے آواز اور انداز گفتگو میں اتنی گہری مماثلت کہیں اور نہیں دیکھی۔ گفتگو کا خوبصورت انداز، داستان گوئی اور بے ساختہ شگفتگی کی صفات الطاف گوہر کو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی ہیں۔ انہی صفات کی بنا پر اعجاز بٹالوی کی صحبت میں بھی وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوتا اور اب الطاف گوہر صاحب سے گپ شپ کے دوران ہمیں اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ ہم گزشتہ اڑھائی گھنٹے سے یہاں بیٹھے ہیں۔ امجد اسلام امجد، خالد احمد، حسن رضوی، افتخار عارف اور یمن کے ایک شاعر عبداللہ بھی اس محفل میں موجود تھے۔ عبداللہ کو میں نے دہلی میں اپنا کلام سناتے دیکھا تھا۔ یہاں "دیکھا " کا لفظ اس لئے زیادہ مناسب ہے کہ اپنا انگریزی کلام سناتے ہوئے وہ اسے "پرفارم" بھی کرتے تھے اور لگتا تھا جیسے کوئی ڈرامہ اسٹیج ہو رہا ہے اور عبداللہ اس میں "سولو پرفارمنس" دے رہے ہیں۔ افتخار عارف نے بتایا کہ ان کا شمار عربی کے بہت اہم شعراء میں ہوتا ہے اور وہ آزادی فلسطین کے لئے سرگرم شعراء میں سر فہرست ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی

لندن میں ایک ضیافت مشتاق احمد یوسفی کی طرف سے تھی۔ یوسفی صاحب میرے پسندیدہ مزاح نگار ہیں۔ بلکہ جن مزاح نگاروں نے کتنے ہی مزاح نگاروں کو قلم پکڑنا سکھایا ہے۔ یوسفی صاحب کا شمار ان اہل قلم میں ہوتا ہے۔ دراصل لکھنا میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے یوسفی صاحب نے قلم پکڑنا سکھایا ہے لیکن یہ لکھا اس لئے نہیں کہ ابھی قلم پکڑنا مجھے آیا نہیں۔ گزشتہ برس یوسفی صاحب نے لندن کے ایک ریستوران میں مجھے کھانے پر مدعو کیا اور یہ ان سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اس دفعہ انہوں نے ایک بڑی ضیافت کا اہتمام اپنے گھر پر کیا تھا، جس میں انتظار حسین، امجد اسلام امجد، خالد، حسن اور میں اور طارق طور شریک ہوئے۔ اعجاز احمد بھی ہمارے ساتھ تھے۔ یہاں انتظار حسین سے ملاقات ہوئی، جن کا رستہ ہم کئی دنوں سے دیکھ رہے تھے۔ دراصل انتظار صاحب لندن میں کچھ دن گزارنے کے بعد اوسلو چلے گئے تھے اور اب اوسلو سے واپس لندن پہنچے تھے۔ اس محفل میں دوسرے بہت سے دوستوں کے علاوہ قاضی اشرف اور رضا علی عابدی سے بھی ملاقات ہو گئی۔ باقی دوستوں کا تفصیلی ذکر کسی دوسرے موقع پر ہو گا۔ پہلے یوسفی صاحب کے بارے میں بتا لوں کہ زیادہ لوگوں میں وہ زیادہ کھلتے نہیں چنانچہ کھانے کی اس قہقہہ بار محفل میں وہ صرف سامع کے طور پر امجد اسلام امجد اور خالد احمد کے لطیفوں سے محفوظ ہوتے

رہے۔ یوسفی صاحب کے بارے میں بتانے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ وہ محفلوں کی صدارت بہت کم کرتے ہیں اور کتابوں کی فلیپ نگاری سے حتی المقدور بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حتی المقدور میں نے اس لئے کہا ہے کہ ابھی پچھلے دنوں بیگم زہرہ منظور الہی کے افسانوی مجموعے پر میں نے ان کا فلیپ دیکھا ہے۔ اس طرح یوسفی صاحب نے جس تقریب میں شمولیت نہ کرنا ہو یا کسی کتاب کا فلیپ نہ لکھنا ہو، وہاں ان کی کمر کا درد ان کے کام آتا ہے۔ احسان دانش کا "شیخو پورہ"۔ یوسفی صاحب کیطرح احسان دانش مرحوم بھی تقریبات وغیرہ کے ضمن میں بہت "چوزی" تھے چنانچہ انہوں نے جس مشاعرے میں نہ جانا ہوتا وہاں ان کا "شیخوپورہ" ان کے کام آتا یعنی وہ کہتے ہیں کہ معذرت چاہتا ہوں اس روز تو مجھے شیخو پورے جانا ہے۔ ان کا یہ "شیخو پورہ" اتنا مشہور ہو گیا کہ ایک روز ایک تقریب کے منتظمین ان کے پاس آئے، احسان صاحب نے اپنے روایتی تپاک کے ساتھ ان کا استقبال کیا ور کہا آپ فرمائیں اور میں حاضر نہ ہوں یہ کس طرح ممکن ہے۔ بس آپ یہ فرما دیں کہ مشاعرہ کس روز ہے ؟ منتظمین نے تاریخ بتائی تو احسان صاحب نے کف افسوس ملتے ہوئے کہا میں ضرور حاضر ہوتا مگر اس روز تو مجھے شیخو پورے جانا ہے۔ اس پر منتظمین نے گرم جوشی سے احسان صاحب سے ہاتھ ملایا اور کہا یہ تو بہت اچھا ہو گیا کیوں کہ مشاعرہ بھی شیخو پورے ہی میں ہے۔ ان دنوں عالمی اردو کانفرنس کے کنوینر جناب علی صدیقی دہلی سے لندن آئے ہوئے تھے چنانچہ ایک ضیافت کا اہتمام ہم پاکستانی مہمانوں اور جناب علی صدیقی کے اعزاز میں بخش لائل پوری نے اپنے گھر پر کیا۔ جس میں امجد اسلام امجد، خالد احمد، حسن رضوی، میرے اور علی صدیقی کے علاوہ افتخار عارف، باقر نقوی، عاشور کاظمی، جاوید حکیم قریشی، تنویر یونس، ابرار ترمذی، سلیم چودھری، جاوید احمد، قمر اور مکرم سید نے شرکت کی۔ یہاں پاکستان ٹیلی ویژن کے ممتاز اداکار بدیع الزماں سے بھی ملاقات ہوئی جن کا شمار اب برطانیہ کے جانے پہچانے اداکاروں میں ہوتا ہے۔ یونس تنویر سے کئی دنوں سے فون پر ملاقات ہو رہی تھی اور ہم دونوں اپنی اپنی مصروفیات کی بنا پر ایک دوسرے سے مل نہیں پا رہے تھے۔ یونس تنویر گوجرانوالہ کے ہیں اور انجمن ترقی پسند مصنفین برطانیہ کے عہدیداروں میں سے ہیں اور اب برطانوی نیشنل ہیں۔ وہ بتا رہے تھے کہ لندن میں اردو ادیب ایک دوسرے سے بہت زیادہ لڑتے جھگڑتے ہیں اور اہ ان میں صلح صفائی کی کوشش کرتے رہتے ہیں ابھی وہ یہ بات کہہ رہے تھے کہ جاوید حکیم قریشی اور علی صدیقی ایک دوسرے سے لڑ پڑے اور سچی بات یہ ہے کہ اس وقت مجھے جاوید حکیم قریشی بہت اچھے لگے اور مجھے یقین ہے کہ خود علی صدیقی کو بھی اندر سے اچھے لگے ہوں گے کیونکہ علی صدیقی نے تھوڑی ہی دیر بعد اپنے لہجے پر قابو پا لیا۔ جاوید حکیم قریشی بھی ٹھنڈے پڑ گئے اور یوں یہ محفل مکمل طور پر تباہ ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اس موقع پر شعر و شاعری کی محفل بھی جمی او ریہاں زاہدان خشک قسم کے شعراء نے بھی رند قسم کے سامعین سے ڈھیروں داد وصول کی۔

اردو مرکز

اردو مرکز کی تقریب اب اگر تقریباً تکو ذکر چھیڑا ہے تو پھر اردو مرکز کی تقریب کا ذکر بھی انہیں سطور میں ہونا چاہئے جو پاکستانی مہمان شعراء کے اعزاز میں لندن یونیورسٹی کے خوبصورت آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی۔ بھارت کے خوبصورت نوجوان شاعر مجید صدیقی نے ہال ہی میں بی بی سی کی اردو سروس جائن کی تھی۔ چنانچہ مہمانان خصوصی میں وہ بھی شامل تھے۔ اور روز یونیورسٹی ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بلکہ شمار لوگ کھڑے تھے۔ اور بہت سے لوگ سیڑھیوں کے درمیان والی خالی جگہوں میں فرش پر بیٹھے تھے اور یوں صحیح معنوں میں تل دھرنے کو جگہ باقی نہیں تھی۔ برطانیہ میں مقیم بزرگ شاعر اکبر حیدر آبادی کرسی صدارت پر فائز تھے اور مشتاق احمد یوسفی سامعین کی صفوں میں بیٹھے تھے۔ انتظار حسین کے اعزاز میں ایک تقریب ہماری برطانیہ آمد سے پہلے منعقد ہو چکی تھی چنانچہ اس محفل میں وہ بھی بطور سامع موجود تھے اور اب اپنے دوستوں کی پذیرائی پر خوش ہو رہے تھے۔ افتخار عارف نے یہاں نظامت کے فرائض انجام دیئے، افتخار عارف کے بارے میں بتانے کی ایک بات یہ ہے کہ وہ سینئیرز کے علاوہ اپنے ہم عصروں کی لکھی ہوئی ایک ایک سطر اور ان کے درجہ بہ درجہ مقام اور مرتبے سے پوری طرح با خبر ہے۔ یہ صفت میں نے آل انڈیا ریڈیو کے محمود ہاشمی میں بھی دیکھی ہے۔ اس محفل میں افتخار عارف نے امجد، خالد، حسن مجید اور میرے بارے میں تفصیلی استقبالیہ کلمات کہے۔ بعد ازاں سب دوستوں نے یہاں اپنا اپنا کلام سنایا، افتخار عارف کے اصرار پر میں نے اپنا ایک کالم " الہ دین کے جن کا ذوال" بھی یہاں سنایا۔ اور بطور رائٹر مجھے اس امر پر بے حد خوشی ہوئی کہ اس کالم میں جو بات میں کہنا چاہتا تھا وہ سامعین تک پوری تاثیر کے ساتھ پہنچی۔ دوسرا کالم میں نے حاضرین کے اصرار پر سنایا اور یوں شاعری کی یہ پہلی محفل تھی جسے نثر کا تڑکا بھی لگایا گیا۔ محفل کے اختتام پر کتنے ہی دوست والہانہ طور پر ملے، ان میں سے بہت سوں کو میں جانتا بھی نہیں تھا۔ یہاں میری ملاقات عبدالرحمان بزمی سے ہوئی۔ بزمی صاحب کی ساری عمر افریقہ اور اب برطانیہ میں گزری ہے۔ پاکستان کے ساتھ قومیت کے حوالے سے بظاہر ان کا کوئی رشتہ نہیں مگر ان ایسے پاکستانی میں بہت کم کم دیکھے ہیں۔ بزمی صاحب اردو ماحول سے تمام عمر کٹے رہنے کے باوجود حیرت انگیز طور پر بہت قادر الکلام شاعر بھی ہیں۔ لندن میں قیام کے دوران میری ان سے فون پر بات ہوتی رہی۔ انہوں نے بہت محبت سے مجھے کھانے پر مدعو کیا مگر میں اپنی مصروفیات کی وجہ سے اس دعوت سے محروم رہا۔ اب اس محفل میں ان سے پہلی دو بدو ملاقات ہو رہی تھی۔ پروفیسر محمد شریف بقا سے یہاں "قند مکر" کے طور پر ملاقات ہوئی۔ ان احباب کے علاوہ افسانہ نگار حمیدہ معین رضوی اور شاعر دوستوں میں سے خالد یوسف، اختر ضیائی اور افتخار قیصر بھی یہاں موجود تھے۔ یہاں ایک شاعر محترمہ سیما جبا سے بھی ملاقات ہوئی جو بہت نستعلیق قسم کی خاتون ہیں۔ میں سامعین میں بیٹھی ایک صاحبہ کی داد سے بھی بہت محفوظ ہوتا رہا۔ یہ صاحبہ بہت

خوش شکل تھیں مگر خاصے بد صورت شعر پر داد دیتی تھیں اور داد دینے کا انداز بھی بہت منفرد تھا یعنی سبحان اللہ یا واہ واہ کہنے کی بجائے ایک زور دار قہقہہ لگاتی تھیں اور ان کے چہرے پر بیزاری کے شدید آثار تھے کیونکہ مشاعروں میں وہ ہمارا کلام سن سن کر تنگ آ چکی تھیں اور اس کلام کا کچھ حصہ تو انہیں زبانی یاد ہو چکا تھا۔ میں نے انہیں دیکھا تو کہا بھابی اب دس جون کو مانچسٹر میں مشاعرہ ہے۔ آپ تو بے چینی سے دس جون کا انتظار کر رہی ہوں گی۔ بولیں ہاں انتظار کر رہی ہوں کیونکہ اس دفعہ آپ لوگوں سے پہلے میرا ارادہ اسٹیج پر آنے کا ہے۔ آپ لوگوں کی شاعری کے بارے میں اس دفعہ میں کچھ اظہار خیال کروں گی۔ رات کو افتخار عارف کی طرف کھانا تھا یہاں دوستوں کی کثیر تعداد جمع تھی۔ افتخار کا فلیٹ بہت کشادہ ہے۔ خالد احمد کو یہ زیادہ اچھا لگا کیونکہ یہاں دو باتھ روم تھے اور خاصے کھلے ڈلے تھے۔ ریحانہ بھابی نے یوں تو سارے ہی کھانے بہت لذیذ بنائے تھے مگر حلیم تو جواب ہی نہ تھا۔ چنانچہ اس نے یہاں حلیم خوری کے اگلے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ اور اب ہماری منزل مانچسٹر تھی، طارق طور نے یہاں ہم سے وداع ہونا تھا۔ اس کی پہلی منزل جرمنی تھی۔ وہاں سے ایک دن کے لئے لندن واپسی اور پھر لندن سے امریکہ روانگی تھی۔ سو اس رات ہم نے اعجاز احمد اعجاز کے گھر طارق طور کو الوداعی دعوت دی اور اگلے روز ہم لوگ مانچسٹر کے لئے روانہ ہو گئے۔

اپنے لوگوں کے درمیان

اور اب ہم "شعرائے کرام" کا گشتی تھیٹر مانچسٹر کے لئے رواں دواں تھا۔ اعجاز احمد اعجاز اسٹیرنگ پر تھا اور خالد، میں اور حسن اس کی ڈرائیونگ کو "مورل سپورٹ" دینے کے لئے گا ہے بگاہے۔ اس کی ڈرائیونگ کے بارے میں "کلمہ خیر" کہہ دیتے۔ جس کے مثبت نتیجے کے طور پر اعجاز مزید محتاط ہو کر گاڑی چلانے لگتا۔ ویسے مغرب کی بائی ویز پر گاڑی چلانا آسان بھی بہت ہے اور مشکل بھی خاصا ہے۔ آسان اس صورت میں ہے اگر آپ ٹریفک کے قواعد کی پابندی کریں اور آپ کے آگے پیچھے چار چار لین میں فراٹے بھرتی ہوئی گاڑیاں بھی ٹریفک کے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کریں اور یہ کام مشکل اس وقت ہو جاتا ہے جب آپ یا کوئی دوسرا انڈیکیٹر دیئے بغیر اچانک دوسری لین میں آ جائے، اس صورت میں پندرہ بیس تیز رفتار گاڑیاں جس طرح یکے بعد دیگرے ایک دوسرے کے ساتھ آ کر ٹکراتی ہیں، بے تحاشا جانی نقصان کا باعث بنتی ہیں۔ ویسے مجھے پاکستان کی "نام نہاد" بائی ویز پر گاڑی چلاتے ہوئے بھی وحشت ہوتی ہے کہ یہاں قانون یا ضابطہ نام کی کوئی چیز ہی نہیں، سڑک کے درمیان میں کھدے ہوئے گڑھے کا پتہ اس گڑھ میں گرنے کے بعد چلتا ہے اور وہ بھی اسی صورت میں اگر آپ زندہ بچ جاتے ہیں جبکہ مغرب میں بھی بے شمار حفاظتی تدابیر کے باوجود مجھے کسی اور وجہ سے بائی ویز پر وحشت ہوتی ہے اور یہ وحشت ارد گرد، دائیں بائیں کی آبادی کے نہ ہونے، کسی انسان کے نظر نہ آنے اور انسانوں کی جگہ ہزاروں کی تعداد میں لوہے کے ان "صندوقوں " کی وجہ سے ہوتی ہے جن میں نسان پیٹیاں باندھ کر بیٹھے ہوتے ہیں اور جو ہر سیکنڈ کے بعد ایک زناٹے کے ساتھ برابر سے گزرتے ہوئے ایک عجیب مشینی زندگی کا احساس دلاتے ہیں۔ آپ نے اگر اس غیر انسانی فضا کا اندازہ لگانا ہو تو صرف چند منٹ کے لئے کسی بائی وے کے کنارے کھڑے ہو کر دیکھئے میرے خیال میں دو تین منٹ کے بعد آپ چکرا کر گر جائیں گے۔

انسان اور بھیڑیا

۷۰ء میں قیام امریکہ کے دوران ایک منظر مجھے بہت دہشت زدہ کرتا تھا میں کام پر جانے کے لئے صبح پانچ بجے اٹھتا تھا۔ جلدی جلدی "ادھا بھدا" منہ دھوتا۔ کافی کا کپ حلق میں انڈیلتا اور ایک سینڈوچ ہاتھ میں پکڑ کر فلیٹ کا دروازہ کھول کر باہر آتا جہاں گاڑی کے ٹائر رات بھر پڑنے والی برف میں دھنسے ہوتے اور شدید برفانی ہوائیں

خنجر کی طرح جسم میں اتر رہی ہوتیں، میں ونڈ اسکرین پر جمی ہوئی برف کھرچتا اور کپکپاتے جسم کے ساتھ اسٹئیرنگ پر بیٹھ جاتا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے بتیاں آن کر دیتا کہ چاروں طرف تاریکی کا راج ہوتا۔ ہائی وے پر آنے کے بعد ہزاروں کاروں کی اس قطار میں، میں بھی لگ جاتا ہوں۔ جو ایک پاگل پن کی کیفیت میں اپنے اپنے مالک کے رزق کے لئے سڑکوں پر ایک زناٹے کے ساتھ رواں ہوتیں، ان کاروں کی پچھلی سرخ بتیاں دیکھ کر مجھے بھیڑ یوں کے بارے میں وہ روایت یاد آ جاتی جس کے مطابق موسم سرما میں جب بھیڑیوں کو شکار کی کامیابی کا مسئلہ در پیش ہو جاتا ہے اور وہ بھوکوں مرنے لگتے ہیں تو وہ جنگل میں رات کے وقت ایک دائرے کی صورت میں بیٹھ کر اندھیرے میں ان بتیوں کی طرح چمکتی ہوئی اپنی سرخ آنکھیں ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈال دیتے ہیں اور پھر اس دائرے میں بیٹھے ہوئے بھیڑیوں میں سے جو ایک لمحے کے لئے اپنی آنکھ جھپکتا ہے، دوسرے بھیڑیے اس پر پل پڑے ہیں اور سے کھا جاتے ہیں،مجھے قیام امریکہ کے دوران بالکل یہی محسوس ہوتا تھا کہ یہاں کوئی آنکھ چھپکنا افورڈ نہیں کر سکتا۔ جوں جوں سائنس ترقی کرتی جاتی ہے توں توں انسان کی مجبوری اور بے بسی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اور انسان ریورس گیئر لگاتا لگاتا جنگل کی زندگی میں داخل ہو رہا ہے۔ شکار کے حصول کی خاطر ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس دائرے میں بیٹھ جاتا ہے جس میں آنکھ جھپکنے والے نے اگلے ہی لمحے دوسروں کی خوراک بن جانا ہے۔ انسان کی اکثریت حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتی ہے۔ چنانچہ یہ احساس انسانوں کے لئے اذیت کا باعث نہیں بنتا۔

صرف اس اقلیت کے لئے باعث عذاب ہے جو انسان کی حیوانی سطح کی بجائے انسانی سطح پر زندگی بسر کرتے دیکھنا چاہتی ہے اور سوچنے سمجھنے اور محسوس کرنے والی یہ اقلیت ابھی تک کسی ایسے نظام کا خاکہ تیار نہیں کر سکی جس میں سائنس انسان کے دشمن کے بجائے اس کے دوست کی صورت میں سامنے آئے۔
مانچسٹر کی طرف جاتے ہوئے راستے میں ہر تھوڑی دیر بعد مختلف سائن نظر آتے جو مغرب کی ہائی ویز کا خاصا ہیں مثلاً اگر کوئی ایگزٹ ایک میل بعد آنے والی ہے تو پہلے سے اس کے بارے میں نشانات بہت واضح صورت میں دکھائی دیتے۔ اگر آگے سڑک مرمت ہو رہی ہے یا سڑک تھوڑی بہت نا ہموار ہے تو بہت پہلے سے اس کے بارے میں جلی حروف میں لکھی ہوئی اطلاع مل جاتی، اب ریستوران کا سائن آ رہا تھا، یہاں ہائی ویز پر چند میلوں کے فاصلے پر ریستوران بنے ہوئے ہیں، جن کے ساتھ پٹرول پمپ ہیں، جنرل اسٹور ہیں، باتھ رومز ہیں قیام کے لئے "ہوٹل " ہیں اور انٹر نیشنل ٹیلیفون بوتھ ہیں،،یعنی دنیا کے کسی کونے میں چاہیں سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر بات کریں اعجاز نے گاڑی اس لین میں موڑ لی جو ریستوران کی طرح جانے والی تھی۔ یہاں ہم نے چائے پی، ہاتھ منہ دھویا، گاڑی میں پٹرول ڈلوایا، پاکستان میں فون پر بچوں سے گپ شپ کی اور دوبارہ مانچسٹر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم گھر سے قدرے تاخیر سے نکلے تھے اور مشاعرے کا وقت قریب تھا چنانچہ اعجاز نے

گاڑی کی رفتار تیز کر دی تھی تقریباً چار گھنٹے میں ہم برطانیہ کے صنعتی شہر مانچسٹر کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ مشاعرہ یونیورسٹی میں تھا، ہمیں کچھ دیر یونیورسٹی تلاش کرنے میں لگی اور جوئندہ یا بندہ کے مصداق تھوڑی دیر بعد ہم یونیورسٹی کے سامنے کھڑے تھے۔ منتظمین نے دروازے پر ہمارا استقبال کیا یہاں میری نظر ایک نوجوان پر پڑی یہ تو اظہر ہے،اپنے لاہور کا پرندہ۔ اس نے لندن میں مجھے کتنے ہی فون کئے تھے وہ میرے سامنے کھڑا تھا،اس نے آگے بڑھ کر پر جوش معانقہ کیا اور میرے انکار کے باوجود میرا بریف کیس اپنی تحویل میں لے لیا۔

خوبصورتی مشرق کا خاصا ہے

جب ہم لوگ ہال میں داخل ہوئے تو ہال پاکستانیوں سے خاصا بھرا ہوا تھا۔ بے شمار اپنے لوگ اپنے لباس، اپنے کلچر، اپنے مذہب، اپنے خد و خال اور اپنے خلوص کی خوشبو کے ساتھ ہمارے منتظر تھے۔ یہاں خواتین بھی خاصی تعداد میں موجود تھیں۔ خوبصورتی ایک معروضی چیز ہے، اگر مختلف ملکوں کی خواتین ایک صف میں کھڑی ہوں تو شاید ان میں سے ظاہری طور پر سب سے زیادہ خوبصورت خاتون کے بارے میں اتفاق رائے ہو جائے لیکن باطنی حسن جب انسان کی خوبصورتی میں شامل ہوتا ہے۔ تو اس کے نمبر الگ سے لگانا پڑتے ہیں اور میرے نزدیک اس میں ثقافتی ہم آہنگی ایک اہم جزو کے طور پر شامل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملٹی نیشنل معاشروں میں بھی پائدار جوڑے اپنے لوگوں ہی میں ترتیب پاتے ہیں اور پھر باقی سب کچھ بے معنی ہو جاتا ہے۔ مجھے مشرقیت سے عشق ہے۔ اظہار اخفاء کی ایک درمیانی کیفیت، مسرت اور گھبراہٹ کا امتزاج، پلکوں کی اوٹ سے باتیں کرنا،، یہ مغرب کا نہیں مشرق کا خاصا ہے اور اس وقت ہم مغرب میں ہوتے ہوئے بھی مشرق معاشرے میں تھے اور یہ سب کچھ مجھے کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ مانچسٹر کے اس مشاعرے کا اہتمام پاکستان اسٹوڈنٹس سوسائٹی نے کیا تھا اور منتظمین میں زبیر ہارون، مبشر احمد، شکیل قمر، آئی اور انصاری اور ڈاکٹر ظاہر شاہ شامل تھے۔ اس مشاعرے میں شرکت کے لئے بریڈ فورڈ سے ہمارے دوست جاوید اقبال ستار اور برمنگھم سے ڈاکٹر صفی حسن بیگم طاہرہ۔ صفی لندن سے عاشور کاظمی، باقر نقوی، ڈاکٹر محمود دیوان، بریڈ فورڈ سے موج فرازی، حفیظ جوہر، گلاسگو سے ڈاکٹر شفیع کوثر، آکسفورڈ سے اکبر حیدر آبادی اور مانچسٹر میں مقیم ہمارے فیصل آبادی عزیز صابر رعنا اور عامر رعنا بھی موجود تھے۔ یہ دونوں بھائی بہت خوبصورت شاعر ہیں صدارت کے فرائض بزرگ شاعر ولی جالندھری نے انجام دیئے جو برطانیہ میں مقیم بہت سے نوجوان شعراء کے استاد ہیں، یہاں اسٹیج سیکریٹری معصوم عابدی اور ڈاکٹر صفی حسن تھے۔

کج مینوں مرن دا شوق وی سی

سچی بات یہ ہے کہ مجھے یہاں مشاعرہ پڑھنے کا لطف بہت آیا کیونکہ یہاں سامعین اور شعراء کے درمیان اور پھر خود شعراء کے درمیان ایک دوستانہ اور بے تکلفی کی فضا موجود تھی۔ اور اس بے تکلفی کا نمائندہ مظاہر ڈاکٹر محمود دیوان کے مشاعرہ پڑھنے کے دوران ہوا۔ دراصل ڈاکٹر محمود دیوان منیر نیازی کے بقول

کج شہر دے لوک وی ظالم سن کج مینوں مرن دا شوق وی سی والی کیفیت کے رسیا ہیں یعنی وہ خود بھی زندہ دل ہیں اور سامعین کی زندہ دلی بھی پسند کرتے ہیں چنانچہ جب تک وہ کلام پڑھتے رہے، طرفین کی طرف سے پھر پور زندہ دلی کا مظاہرہ ہوتا رہا، اس مشاعرے میں ڈاکٹر محمود دیوان کے علاوہ جن شعراء نے اپنا کلام سنایا ان میں عطا جالندھری، امجد اسلام امجد، خالد احمد، حسن رضوی، راقم الحروف، اکبر حیدرآبادی، عاشور کاظمی، ڈاکٹر شفیع کوثر، موج فرازی، سرمد بخاری، باقر نقوی، بیگم طاہرہ صفی، عباس ملک، اعجاز احمد اعجاز، صابر رضا، معصوم رضا عابدی، محترمہ اختر عالم، اختر زیدی، جاوید اقبال ستار، حفیظ جوہر، نور محمد نور، شکیل قمر، ڈاکٹر قیصر عباس زیدی اور عامر رضا شامل تھے۔ برطانیہ میں نئی نسل کے شعراء میں سے میرے نزدیک جن کا شعری مستقبل بہت روشن ہے ان میں حفیظ جوہر بھی ہیں۔ ویسے اس نوجوانوں کی پوری کھیپ یشب تمنا، ارشد لطیف، اعجاز احمد اعجاز، صابر رضا، جاوید اختری بیدی، عامر رضا اور جاوید اقبال ستار کی صورت میں موجود ہے جو شاعری میں نئے رجحانات کی حامل ہے اور بہت خوبصورت شعر کہہ رہی ہے۔ گذشتہ دنوں مجھے حضرت شاہ کا زیر ترتیب شعری مجموعہ دیکھنے کا اتفاق ہوا اس مجموعے میں موجود غزلیں بھی ایک نئے شاعر کے ظہور کا اعلان کرتے نظر آتی ہیں۔ مشاعرے کے اختتام پر دوستوں کے ایک ہجوم نے ملاقات کے لئے اپنی محبت کے گھیرے میں لیا۔ ان میں سے کتنے ہی ایسے تھے جن کے بارے میں مجھے علم ہی نہیں تھا کہ وہ ان دنوں مانچسٹر میں ہیں، چنانچہ انہیں اچانک اپنے سامنے پاکر ایک عجیب طرح کی مسرت ہوئی اور ان ملاقاتوں میں بعض دوست ایسے تھے جن سے پہلی دفعہ ملاقات ہو رہی تھی مگر ان کا کہنا تھا کہ "نوائے وقت" کے ذریعے میری ان سے ملاقات برسوں پرانی ہے۔ کچھ سے تعارف "فنون" کے ذریعے تھا۔

ایک اجنبی میزبان

منتظمین کی طرف سے ایک عشائیے کا پروگرام ایک ریستوران میں کیا گیا تھا۔ عشائیہ کیا تھا پورا ولیمہ تھا۔ پورے ڈیڑھ سو مہمانوں کے کھانے کا اہتمام تھا۔ یہاں ایک دفعہ

پھر یہی محسوس ہوا کہ اپنے گھر میں ہیں۔ عشائیے کے اختتام پر ایک دراز قد اور وجیہ شخص میرے پاس آئے اور ہاتھ ملاتے ہوئے کہا میرا نام حامد حسن ہے، میری خواہش ہے کہ آپ آج کی شب میرے مہمان ہوں میں نے عرض کیا منتظمین سے پوچھ لیں، بولے ٹھیک ہے۔ مگر آپ میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھیں، گھر پہنچ کر انھیں بھی وہیں بلا لیں گے۔ ویسے میں آپ سے محبت کرنے والوں میں سے ہوں لہذا انکار نہ کریں۔ انکار انہوں نے کرنے بھی نہ دیا اور گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بولے "آئیے تشریف رکھیں " میں نے حسن اور خالد کو ابھی لندن واپس جانا تھا ور پھر تھوڑی دیر بعد ہم حامد صاحب کے خوبصورت کشادہ گھر کے لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ یار ہمیں اس طرح آنا نہیں چاہئے تھا، حسن کا رنگ خوف کے مارے زرد ہو رہا تھا پتہ نہیں یہ کون صاحب ہیں اتنے میں ہمارے اجنبی میزبان دوسرے کمرے سے لاؤنج میں داخل ہوئے اور انہوں نے اپنا ایک ہاتھ فضا میں بلد کرتے ہوئے کہا اب تو جناب آپ لوگ آ گئے ہیں یہ تو کچھ دیر بعد ہی پتہ چلے گا کہ میں کون ہوں ؟ بیشتر اس کے کہ حسن کا رنگ مزید متبر ہوتا حامد صاحب نے ہنستے ہوئے کہا مہمان آتا اپنی مرضی سے ہے اور جاتا میزبان کی مرضی سے یہاں صورت ہال یہ ہے کہ آپ آئے میزبان کی مرضی سے اور جائیں گے بھی میزبان کی مرضی سے مگر گھبرائیں نہیں ابھی تھوڑی دیر میں بہت سے مہمان دوست آپ سے ملنے کے لئے آ رہے ہیں۔ اور واقعی تھوڑی دیر بعد ایک ایک کر کے مہمان آنا شروع ہو گئے اور کچھ دیر بعد حامد صاحب کے سٹنگ روم میں سٹنگ کی گنجائش نہ رہی۔ بیگم حامد حسن اور ان کی ایک ہمشیرہ مہمانوں کے لئے مزید نشستوں کا انتظام کرنے میں مشغول تھیں ان مہمانوں میں سے بیشتر طلبہ تھے جو پاکستان سے حصول تعلیم کے لئے برطانیہ ائے ہوتے تھے۔ یہ سب دوست کسی پروگرام کے تحت یہاں جمع نہیں تھے بلکہ حامد صاحب کے گھر میں ہماری موجودگی کی اطلاع پا کر ایک ایک کر کے جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ حالانکہ ہم لوگ ایک طویل سفر کے بعد تھکا دینے والے مشاعرے اور مشاعرے کے بعد خواب آور عشائیے کی وجہ سے اس وقت جاگنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ مگر پاکستان کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والے ان دوستوں کی بے پایا محبت نے ہماری نیندیں اڑا دیں بلکہ ہمیں یوں محسوس ہوا کہ ہم تازہ دم ہو گئے ہیں چنانچہ اس کے بعد رات گئے تک گپ شپ کے علاوہ شعر و شاعری کی محفل جمی رہی۔

داستانوی کردار

یہاں قارئین کو چلتے چلتے یہ بتانا ضروری ہے کہ حامد صاحب اور بیگم حامد کی صورت میں ہماری ملاقات یوں سمجھئے کہ داستانوی کرداروں سے ہوئی۔ سنا تھا کہ کچھ مشنری لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے نصب العین کے ساتھ اس قدر مخلص ہوتے ہیں کہ ان کے لئے لذت، راحت، خوشی غم، دکھ اور سکھ وغیرہ کا مفہوم بھی بدل جاتا ہے چنانچہ دوسروں کی خدمت کر کے انہیں دکھاوے کی خوشی نہیں بلکہ ایسی خوشی

حاصل ہوتی ہے جو ہم میں سے بیشتر لوگوں کو اپنی خدمات کرا کے ملتی ہے۔ جناب حامد اور بیگم حامد کچھ اسی قسم کے لوگ تھے ہماری موجودگی میں جو مہمان ان کے ہاں آئے ان کے لئے مہمان کا لفظ ہم نے استعمال کیا ورنہ ان کی آمد کا انداز بتاتا تھا کہ وہ گھر والے ہیں اور اس مکان کے درد دیوار ان سے نامانوس نہیں کیونکہ ان کی باتوں سے بھی پتہ چلا کہ جب انہیں اپنے گھر کی یاد ستاتی ہے وہ بلا دھرک اس گھر میں چلے آتے ہیں جس کے دروازے ہر پرسیدی کے لئے کھلے ہیں۔ انہیں بھوکہوتی ہے تو فریج کھول کر اپنے لئے کھانا نکال لیتے ہیں اور نیند آتی ہے تو یتیں سو جاتے ہیں۔ حامد صاحب اور بیگم ہامد دونوں اعلی تعلیم یافتہ ہیں اور برطانوی معیار سے بھی ان کا شمار خوشحال خاندانوں میں ہوتا ہے مگر اپنی تعلیم اور اپنی خوشحالی کا استعمال انہوں نے یہ نکالا ہے کہ برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کا رشتہ ان کے مذہب اور ثقافت سے نہ صرف بہال رکھا جائے بلکہ اسے زیادہ مستحکم بھی کیا جائے اور اس کے لئے وہ رف زبان سے تبلیغ نہیں کرتے بلکہ اپنے عمل سے تبعلیغ کرتے ہیں۔ اگر شخص دوانہ ملنے کی وجہ سے مر رہا ہو تو اسے کملہ سنانے کے لئے نہیں کہنا چاہئے بلکہ اس کے لئے دوا لانا چاہئے اور میرے خیال میین اس سے بہتر تبلیغ ممکن نہیں۔ ہامد صاحب اور بیگم حامد کی تبلیغ کا انداز کچھ ایسے ہی ہے مجھے یہ میاں بیوی مذہبی لحاظ سے رجذ بھی نظر نہیں آئے۔ بلکہ ہدود میں رہتے ہوئے وہ دونوں بیحد زندہ دل تھے اور اس وقت رات گئے بغیر میوزک اور پارٹی کے دیگر لوازمات کے وہ اپنی شگفتہ باتوں اور متحرک قسم کی شخصیتوں کے حامل ہونے کی وجہ سے ایک زبردست ہلے گلے والی پارٹی کا تاثر دینے میں کامیاب ہو رہے تھے۔ حامد صاحب نے ہماری آنکھوں میں نیند تیرتی دیکھی تو گھر میں جمع دوستوں سے کہا کہ مہمان اب غالباً سونا چاہتے ہیں آپ میں سے جس نے یہیں سونا ہے وہ ہاتھ کھڑا کر ے باقی حضرات چھٹی کرین۔ اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا اور اکثر دوست ہم پاکستانی مہمانوں سے پر جوش معانقہ کر کے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ ہمارے لئے سونے کا انتظام فرسٹ فلور پر تھا جو تین بیڈ رومز پر مشتمل تھا بیگم حامد نے ہمارے لئے تینوں بیڈ روم کھول دیئے ایک میرے لئے ایک حسن کے لئے اور ایک خالد کے لئے اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ وہ خود ان کی ایک بہن اور ان کا ایک صاحبزادہ کہاں سائیں گے۔ میں نے کہا کہ ہم تینوں کے لئے ایک بیڈ روم کافی ہے مگر حامد صاحب اور بیگم حامد میری اس بات پر کچھ ناراض سے ہو گئے کہ انہیں اس میں تکلف کی بو آئی تھی۔ جس پر میں نے گھبرا کر کہا کہ چلیں ہمارے لئے دو کمرے وقف کر دیں مگر وہ بضد تھے کہ آپ سب علیحدہ علیحدہ کمروں میں سوئیں گے اور ایسا کہتے ہوئے ان کے ذہن میں کسی قربانی کا تصور نہیں تھا بلکہ یوں لگتا تھا جیسے انہیں در حقیقت خود کو تکلف میں ڈال کر راحت ملے گی کہ ان کی لغات میں لفظوں کے معنی ادل بدل کر رہ گئے تھے۔ بالا آخر میں نے انہیں ایک مجبوری بتائی کہ حسن اکیلے کمرے میں ہیں سو سکتا اسے ڈر لگتا ہے چنانچہ مجھے "آیا" کے طور پر اس کے کمرے میں سونا ہے میر اس بات پر حامد صاحب اور بیگم حامد کے چہرے پر بے یقینی کے آثار ابھرے لیکن جب میں نے انہیں پوری طرح یقین دلایا کہ میں جو کچھ کہ رہا ہوں وہ سچ کہہ رہا ہوں تو وہ "راضی بہ رضا" ہو گئے۔ ممکن ہے

قارئین سوچ رہے ہوں کہ میں نے ایک گھرانے کے ذکر میں اتنی ساری جگہ گھیر لی ہے اور اس امر کا بھی امکان ہے کہ میرے دوستوں کی طرح وہ بھی مجھے جذباتی سمجھیں۔ اگر وہ ایسا سمجھیں گے تو درست سمجھیں گے۔ میں خود غرض انسانوں کے سمندر میں جب کسی اچھے انسان کو جزیرے کی صورت میں دیکھتا ہوں تو واقعی جذباتی ہو جاتا ہوں بلکہ اپنے دوستوں کے بقول کسی انسان میں انسانی خوبیاں دیکھ کر اتنا مہر بان ہو جاتا ہون کہ ممدوح پریشان ہو کر مجھے نارمل کرنے کے لئے غیر انسانی حرکتیں کرنے کی سونے لگتا ہے۔ حامد صاحب کے ذکر میں اصولا مجھے صرف اتنا لکھنا چاہئے تھا کہ ہم لوگ ایک رات ان کے ہاں ٹھہرے ایک وقت ناشتہ کیا اور پھر گلاسگو کے لئے روانہ ہو گئے میاں بیوی دونوں بڑے اچھے لوگ ہیں۔ اللہ اللہ خیر سلا مگر جب تک اچھے انسان معاشرے میں غالب مقدار میں پیدا نہیں ہو جاتے میں ان کے ذکر میں جذباتی اور ابنارمل ہی رہنا چاہتا ہوں۔

ایک تصویر کے دو رخ

صبح ناشتہ کی میز پر بیگم حامد اور حامد ایک دفعہ پھر ہمیں اپنی بے لوث اور بے ساختہ محبت کے دائرے میں لئے ہوئے تھے وہ ہمیں اس طرح ناشتہ کرا رہے تھے جیسے بچوں کو یہ سوچ کر کرایا جاتا ہے کہ کہیں اسکول میں انہیں بھوک نہ لگے حامد صاحب اور ان کی بیگم بھی برطانیہ میں اسلام کے لئے کام کرنے والے دوسرے مسلمانوں کی طرح بہت پر امید تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مایوسی کی کوئی بات نہیں اگر ہم لوگ اپنا فرض ادا کرتے رہیں تو برطانیہ میں پیدا ہونے والی نئی نسل کو ہم اپنے سے بہتر مسلمان بنا سکتے ہیں کیونکہ یہاں جو بچہ مذہب کی طرف راغب ہوتا ہے وہ مذہب کی صحیح اسپرٹ کے مطابق اپنی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے چنانچہ اس میں منافقت اور دو عملی نہیں پائی جاتی یعنی ایسا نہیں کہ وہ نماز بھی پرتا ہو اور جھوٹ بھی بولے بلکہ اس کی دنیا اس کے دین کے عین مطابق ہو جاتی ہے۔ اس ضمن میں مجھے ان سے جزوی ا اتفاق بھی تھا مگر میرا کہنا تھا کہ مغرب میں پیدا ہونے اور یہیں نشو و نما پانے والی مسلمان نسل کے ضمن میں شدید بحران کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور شاید ہم ان کی ایک تعداد کو اپنی اصل کی طرف لے جانے میں کامیاب ہو سکیں مگر اس کے بعد ان کی جو اولاد ہو گی اس کے بارے امید اور مایوسی میں سے مایوسی کی شرح زیادہ ہے۔ حامد صاحب نے مجھے ایک انگریزی جریدے "ڈیلی میل" کا ایک شمارہ دکھایا جس میں گراہم ٹرنر کا مضمون ان کے خیال کی تصدیق کرتا تھا۔ گراہم ٹرنر نے لکھا تھا کہ برطانیہ میں پیدا ہونے والے مسلمان بچوں سے گفتگو کرتے ہوئے میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ کاش ہمارے بچے بھی ایسے خیالات کے حامل ہوتے۔ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کا تعلق اگرچہ ان ملکوں سے ہے جنہیں ہم پسماندہ ممالک کہتے ہیں۔ مگر ان میں اور ان کے بچوں میں عقیدے کی اہمیت کا ادراک کہیں زیادہ بلند سطح کا ہے۔ ممکن ہے اس بات میں ابھی کچھ وقت لگے کے

یہاں خود کو اپنے گھر کی طرح محسوس کریں اور اس ملک میں اپنا کردار مکمل طور پر ادا کریں لیکن ہم لوگ خوش قسمت ہیں کہ ایسے نوجوان ہمارے درمیان موجود ہیں جو پانچ وقت نماز ادا کرتے ہیں، ایک ماہ کے روزے رکھتے ہیں اور ہم خوش قسمت ہیں کہ ایسی لڑکیاں بھی کافی تعداد میں ہمارے درمیان موجود ہیں جو اپنی عصمت کی حفاظت کرتی ہیں۔ ڈیلی میل کے اس شمارے میں دو تصویریں بھی ایک ساتھ دی گئی تھیں جن میں سے ایک مسلمان ماڈل گرل سفیرہ افضل کی تصویر تھی جو ڈانس کے پوز میں تھی جب کہ اس کی برابر والی تصویر میں ایک مسلمان لڑکی اپنے سر اور پورے جسم کو چادر میں لپیٹے مولوی صاحب سے قرآن پڑھ رہی تھی۔ ان میں سے ایک تصویر حامد صاحب کے خیالات کی تصدیق کرتی تھی اور دوسری تصویر سے میرے خدشات کو تقویت ملتی تھی۔

اسکاٹ لینڈ خواب یا حقیقت

اب ہم مسافروں کی اگلی منزل گلاسگو تھی۔ گلاسگو اسکاٹ لینڈ کا ایک اہم شہر خوبصورتی کے لحاظ سے یہ خطہ ایبٹ آباد کی طرح اور "احساس محرومی" کے حوالے سے ہمارے صوبہ سندھ سے مماثل ہے۔ سکاٹش لوگ شکل و شباہت میں ہمارے پٹھانوں جیسے ہیں۔ اسکاٹ لینڈ برطانیہ کا حصہ ہوتے ہوئے بھی برطانیہ سے اپنے تعلق کو زیادہ پسند نہیں کرتا، انگریزوں اور اسکاٹش لوگوں کے درمیان اجنبیت، مغائرت اور ناپسندیدگی کی ایک گہری خلیج حائل ہے اور ایک طویل پس منظر رکھتی ہے۔ ڈاکٹر شفیع کوثر ہمیں اپنے ساتھ لے جانے کے بطور خاص مانچسٹر آئے تھے اور ان کے ساتھ جو ویگن تھی وہ اسکاٹ لینڈ کے "احساس محرومی" کا ایک دستاویزی ثبوت تھی۔ آ پ اسے نو نمبر ویگن سمجھ لیں جو اسٹیشن سے شاہ نور اسٹوڈیو کے درمیان چلتی ہے۔ امجد اسلام امجد، خالد احمد، حسن رضوی اور عاشور کاظمی کے علاوہ ہماری بھابی بیگم فردوس امجد بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ اس کے علاوہ میرا لاہوری عزیز اظہر بھی ہمارا ساتھ دینے کے لئے ویگن میں ہمارے ساتھ تھا کہ گلاسگو اظہر کا "اسرائیل" ہے ان کے علاوہ ڈاکٹر شفیع کوثر کے ایک دوست بھی ویگن سواروں میں شامل تھے۔ مانچسٹر سے گلاسگو تک کا راستہ خوبصورت ہے بلکہ سچ پوچھیں تو پورے برطانیہ کا لینڈ اسکیپ انتہائی نظر نوا ہے اور اگر مزید سچ پوچھیں تو کار میں یورپ کے بیشتر ممالک کی سیاحت کے بعد اندازہ ہوا کہ سارا یورپ قدرت کی صناعی کا بہترین نمونہ ہے۔ برطانیہ کا لینڈ اسکیپ بہت مخصوص قسم کا ہے۔ ائی وے پر سفر کرتے ہوئے دونوں طرف مسلسل چھوٹے چھوٹے ٹیلے نظر آتے ہیں جو ہرے بھرے پھولوں، درختوں،لہلہاتے کھیتوں سے آنکھوں کو ایسے منظر کی خوبصورتی دیتے ہیں۔ جو خوبصورتی خواب اور حقیقت کو مشکل بنا دیتی ہے۔ اس لینڈ اسکیپ کی ایک اضافی خوبصورتی یہ ہے کہ کھیت درخت پودے ایک

خاص ترتیب میں نظر آتے ہیں۔ یورپ والوں نے حسن فطرت کو اپنے حسن انتظام سے مزید دلکش بنا دیا ہے۔ مگر ایک خرابی یہ ہے کہ تقریباً پورے یورپ کا لینڈ اسکیپ کم و بیش ایک جیسا ہے چنانچہ آنکھیں اس ایک جیسی خوبصورتی کو دیکھ دیکھ کر اکتا جاتی ہیں۔ آپ کار میں سفر کرتے ہوئے ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں داخل ہو جاتے ہیں بلکہ اپ بارڈر بھی کراس کرتے چلیں،آپ کو نئے ماحول، نئی فضا نئے لوگوں اور نئے ملک کا احساس بہت کم ہو گا۔

اے خدا قبضہ دلا

اس کے بر عکس ہمارے ملک میں تھوڑے سے سفر کے بعد لینڈاسکیپ بدل جاتا ہے۔ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ، خوبصورت وادیاں، ہرے بھرے کھیتوں سے مزین وسیع و عریض میدان اور سینکڑوں میل میں پھیلے ہوئے ریگستان اور صحرا۔

یہ قدرت کی وہ فیاضیاں ہیں جو اس نے ہم پر نچھاور کی ہیں۔ پھر یورپ کے بر عکس قدرت نے ہمیں موسموں کی ورائٹی بھی دی ہے۔ گرمی، سردی، بہار، خزاں، برسات اسی طرح ہماری کھیت سونا اگلتے ہیں اور میدان اور پہاڑ قدرت کے خزانوں سے بھرے ہوئے ہیں جبکہ برطانیہ خوراک میں خود کفیل نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ہم بد قسمت لوگ ہیں۔ ہمارا خوبصورت ملک بد صورت لوگوں کے قبضے میں چلا آ رہا ہے۔

ایک مکروہ ترین نظام ہے۔ جس نے دنیا کی ہر نعمت کی موجودگی کے با وصف چہروں کو زرد اور آنکھوں کر ویران کیا ہوا ہے۔ ایک زور آور اقلیت ہے جو اکثریت کے سہانے خوابوں پر پہرہ دیتی چلی آ رہی ہے۔ اے خدا اے مالک ارض و سما اپنے کمزور بندوں کو اتنی قوت اور ہمت عطا کر کہ وہ ظالموں اور غاصبوں سے اس خوبصورت سر زمین کا قبضہ واپس لے سکیں۔

گلاسگو کی حدود میں داخل ہوتے ہوئے منظر نامے میں تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ پہاڑی علاقہ ہے، پہاڑوں پر برف پگھل چکی ہے اور اب یہ پہاڑ رنگ برنگے درختوں اور پھولوں سے لدے ہوئے ہیں مگر اس علاقے میں سکاٹش قوم کے "احساس محرومی" کی جھلکیاں بھی نظر آنا شروع ہو جاتی ہیں،خصوصاً جب ہماری کار گلاسگو شہر میں داخل ہوئی تو سڑکوں اور مکانوں کی خستہ حالی کا احساس کچھ زیادہ ہی ہوا۔

یہ خوبصورت پہاڑی شہر اپنی تمام رعنائیوں اور نسبتاً غربت کی جھلکیوں کے ساتھ ہمارے سامنے تھا۔ ہماری ویگن ایک عظیم الشان مسجد کے سامنے رکی۔ یہ مسجد اس شہر میں آباد مسلمانوں کی کثیر تعداد کی غیرت ایمانی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ اظہر نے یہاں اترنا تھا کہ اس کے ایک عزیز یہاں تھے اور پھر تھوڑی دیر بعد ہم پہاڑی پر واقع ڈاکٹر شفیع کوثر کے گھر میں بیٹھے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ تقریب تقسیم مہماناں یہ گھر گلاسگو کے مہنگے اور خوبصورت علاقے میں تھا۔ یہاں میزبانوں میں مہمانوں کی تقسیم کی "تقریب" بھی منعقد ہوئی۔ میں اور خالد احمد، ایک بہت سنجیدہ اور با وقار سے پاکستانی محمد اکرم صاحب کے حصے آئے۔ عاشور کاظمی اور حسن رضوی کو ڈاکٹر شفیع کوثر نے اپنے دامن میزبانی میں لے لیا اور امجد اسلام امجد اور

بیگم فردوس امجد، فیصل آباد کے احمد ریاض کے مہمان ٹھرے۔ گلاسگو میں مانچسٹر اور لندن کے مقابلے میں موسم خاصا خشک تھا۔

خالد احمد برطانیہ کے تمام سفر کے دوران خاصے گرم موسم میں بھی سوئیٹر، کوٹ اور پتلون کے نیچے لیگنگ پہن کر پھرتا رہا تھا مگر گلاسگو کے خشک موسم میں اس نے تمام گرم کپڑے اتارے اور آدھے بازوؤں والی پتلی سی قمیض پہن کر سیٹیاں بجاتا ہوا چہل قدمی میں مشغول ہو گیا۔ ثابت ہوا کہ خالد احمد کی شاعری کے علاوہ اس کی شخصیت کی انفرادیت کو بھی کوئی "بیٹ" نہیں کر سکتا۔ پھر وہی مظلوم سامعین اور اب پھر وہی مشاعرہ تھا اور ہم مظلوم شاعر تھے یا پھر یہ کہ مظلوم سامعین تھے۔ یونیورسٹی ہال کے مشاعرہ گاہ کو جانے والی سڑک انتہائی خوبصورت مناظر کے درمیان گھری ہوئی تھی۔ یہ علاقہ نتھیا گلی کی طرح تھا۔ چنانچہ سڑک کے کنارے کار پارک کرنے کے بعد یونیورسٹی تک پہنچتے پہنچتے ہمارا سانس پھول چکا تھا۔ مشاعرہ گاہ میں سامعین جوق در جوق آنا شروع ہوئے اور پھر ہال بھرا بھرا سا محسوس ہونے لگا۔

یہاں عاشور کاظمی کی صدارت تھی۔ عاشور کاظمی برطانیہ اور یورپ کے تقریباً تمام مشاعروں میں ہمارے ساتھ رہے۔ اس کی ایک وجہ شعرو ادب سے ان کی وابستگی اور دوسرے وجہ سگریٹ نوشی سے ان کی رغبت ہے۔

دوسری بات کی وضاحت کچھ واقف حال "علما" نے یوں کی ہے کہ موصوف دل کے مریض ہیں اور تعیق بھابی انہیں سگریٹ کے قرین نہیں جانے دیتیں۔ چنانچہ وہ ایسی تقریبات میں پورے جوش و خروش سے شریک ہوتے ہیں جن میں "محتسب" کی شرکت کا خدشہ نہ ہو۔

گلاسگو کے مشاعرے میں ایک بات اچھی اور ایک بری تھی۔

اچھی بات یہ تھی کہ اس میں شاعر بہت کم تھے اور بری بات یہ تھی کہ ہمیں شاعر سمجھ لیا گیا چنانچہ امجد اسلام امجد، خالد احمد، حسن رضوی اور مجھے "شعرا" کی کمی پوری کرنے کے لئے اپنی متعدد غزلیں سنانا پڑیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ تقریب بنیادی طور پر چونکہ ہم پاکستانی شعراء ہی کے اعزاز میں تھی اس لئے مقامی شعراء میں سے صرف چند ایک کو زحمت دی گئی۔ پاکستان حلقہ ادب و فن کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے مشاعرے میں گلاسگو کے جن شعراء نے اپنا کلام سنایا، ان میں سلطان محمود ظفر، میواسنگھ کوہلی، احمد ریاض اور قاضی اصغر شامل تھے۔

جبکہ عاشور کاظمی نے بطور صدر اپنے کلام بلاغت نظام سے نوازا۔ مشاعرے کے آغاز میں جناب نسیم احمد نے تلاوت کلام پاک اور ڈاکٹر طارق نے نعت رسول مقبول پیش کی جبکہ ادب و فن کے صدر ڈاکٹر شفیع کوثر نے امام خمینی کی وفات پر قرار داد تعزیت پیش کرتے ہوئے اسے عالم اسلام کا ایک نا قابل تلافی نقصان قرار دیا۔ حلقہ کے سیکریٹری جناب ضیاء الحق قریشی نے اپنی افتتاحی تقریر میں حلقے کی غرض و غایت اور اس کی کارکردگی پر روشنی ڈالی۔ تلخ حقائق ضیاء الحق قریشی سے یہ

میری پہلی ملاقات تھی مگر ان سے دوستی کے لیئے کافی تھی کہ پاکستان کے نظریئے سے ان کی بے پایاں محبت کی کمپرو مائنز کی قائل نہیں موصوف یہ بات ماننے پر تیار ہی نہیں کہ بھارت، ہندوستان کی تقسیم کے زخم کو کبھی بھول سکتا ہے اور یوں ضیاء الحق قریشی اس ضمن میں میرے ہم نوا تھے یا میں ان کا ہم نوا تھا کہ بھارت پاکستان کے وجود کو دل سے کبھی تسلیم نہیں کرے گا لہذا اس کے ساتھ تعلقات استوار کرتے ہوئے ہمیں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔

پاکستان میں جو لابی بھارت کے ساتھ دوستی بڑھانا چاہتی ہے اس کا استدلال یہ ہے کہ بھارت کی نئی نسل پرانی دشمنی بھول چکی ہے۔ اور اس کا رویہ اپنے آباء و اجداد سے بالکل مختلف ہے۔ حالانکہ یہ ایک مفروضہ ہے کیونکہ بھارت کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسٹوڈنٹس یونینوں کی قیادت مسلسل مسلم دشمن متعصب ہندو تنظیموں کے ہاتھ میں رہی ہے اور اس وقت بھی بھارت کے تعلیمی اداروں میں پرورش پانے والی نئی نسل اپنا ووٹ ان مسلم دشمن اور پاکستان دشمن تنظیموں ہی کو ڈالتی ہے۔ لہذا ہمیں کسی فیشن ایبل سلوگن پر ایمان لانے سے پہلے تلخ حقائق پر ایک نظر ضرور ڈال لینی چاہئے۔

مشاعرے کے اختتام پر میری ملاقات دیگر دوستوں کے علاوہ شوکت بٹ سے بھی ہوئی۔ شوکت بٹ برس ہا برس سے گلاسگو میں مقیم ہیں اور وہ ان خوش نصیب پاکستانیوں میں ہیں، جنہوں نے وہاں دوسرے درجے کا شہری بن کر رہنا پسند نہیں کیا چنانچہ وہ اہم سماجی حیثیت کے مالک ہیں اور انہیں گلاسگو کے جسٹس آف پیس ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ پاکستانی دوستوں سے ملاقاتوں سے فراغت کے بعد گلاسگو کے ایک پاکستانی ریستوران میں مہمانوں کے اعزاز میں منعقدہ عشائیے میں شرکت کے لئے ہم وہاں پہنچے تو ریستوران پاکستانیوں سے بھرا ہوا پایا۔ حلقہ ادب و فن نے اپنے دسترخوان کا دائرہ خاصا وسیع رکھا ہوا تھا۔

پاکستانیوں کی نئی نسل

یہاں میری ملاقات برطانیہ میں پیدا ہونے والی پاکستانیوں کی نئی نسل سے بھی ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ ہمارے اور ان کے درمیان ایک حجاب سا حائل ہو چکا ہے اور وہ ہمارے ساتھ گھلنے ملنے میں زیادہ آسانی محسوس نہیں کرتے۔ دراصل ان کی تربیت ایک بالکل مختلف معاشرے میں ہوئی ہے اور شاید ہم لوگ اپنے عمل سے ان کی تربیت کرنے کی بجائے اپنی زبان سے ان پر نکتہ چینی زیادہ کرتے ہیں۔ جس کی بنا پر ہمارے اور ان کے درمیان دوستی کی وہ فضا پیدا نہیں ہو پاتی، جس کی موجودگی میں فاصلے سمٹ کر رہ جاتے ہیں۔

لہذا یورپ اور امریکہ وغیرہ میں مقیم پاکستانیوں کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ ان بچوں پر ہر وقت انگلیاں نہ اٹھائیں، نیز اپنی روحانی اور ثقافتی برتری اپنی زبان سے بیان کرنے کی بجائے اگر اپنے عمل سے ثابت کریں تو یہ چیز ان کے ذہنوں پر زیادہ اثر انداز ہو گی۔ نیز جو پاکستانی اپنے دین اور کلچر کے ضمن میں کسی قسم کا رسک نہیں لینا چاہتے۔ انہیں چاہئے کہ وہ بچوں کے سن بلوغت تک پہنچنے سے پہلے پاؤنڈ اور ڈالر کو ٹھوکر مار کر ہر قسم کے مسائل کے مقابلے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو کر اپنے لوگوں کے درمیان واپس آ جائیں۔ انہیں سچی خوشیاں اور سچے غم وہیں ملیں گے۔

عشائیے سے فراغت کے بعد میں اور خالد ایک پاکستانی دوست محمد اکرم صاحب کے مہمان قرار پائے۔ حسن اور عاشور ڈاکٹر شفیع کوثر کے مہمان تھے اور امجد اسلام امجد احمد ریاض کی تحویل میں تھا۔ اکرم صاحب ہیلی کالج لاہور میں پڑھتے رہے ہیں۔ ہیلی کالج کے ہمسائے میں واقع ایم اے او کالج کے کینٹین پر چائے پینے آیا کرتے تھے چنانچہ وہ کینٹین کے وضعدار اور نیک نیت مالک، خان کو یاد کرتے رہے۔ عاشور کاظمی اگلے روز واپس لندن چلے گئے چنانچہ میں اور خالد بھی ڈاکٹر شفیع کوثر کی میزبانی میں آ گئے اور میرے خیال میں ہم نے اپنا سب سے اچھا وقت غالباً گلاسگو میں گزارا جو ڈاکٹر شفیع کوثر، ضیاء الحق قریشی اور شوکت بٹ کی بے پناہ محبت اور خلوص کی معیت میں بسر ہوا۔

لخ لومانڈ کی جھیل

ضیاء الحق قریشی نے ہمیں لخ لومانڈ لے جانے کا پروگرام بیاتا تھا۔ گلاسگو سارا ہی خوبصورت ہے اور یہ جگہ سارے گلاسگو سے زیادہ خوبصورت ہے۔ چنانچہ میں خالد اور حسن، قریشی صاحب کی کار میں بیٹھے اور لخ لومانڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔ شہر سے نکلنے کے بعد تقریباً آدھ پون گھنٹے کی ڈرائیو ہمیں اس خوبصورت علاقے کے مضافات میں لے گئی جہاں سے پہاڑی سڑکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نیچے ایک وسیع و عریض جھیل تھی اور ہماری کار درختوں کے جھنڈ میں سے گزرتی ہوئی بلآخر ایک پکنک اسپاٹ پر آ کر رک گئی۔ ہمارے ارد گرد پہاڑیوں کا سلسلہ تھا۔

درمیان میں دودھیا پانی کی جھیل تھی اور فضا میں وہ خاموشی تھی جو خدا اور اس کے بعض بندوں کے درمیان گفتگو آغاز کرتی ہے۔

یہاں خاصی سردی تھی چنانچہ میں نے اور حسن نے حفظ ماتقدم کے طور پر اپنے ساتھ رکھے گرم کوٹ پہن لئے تھے جبکہ خالد بو شرٹ پہنے گھوم رہا تھا۔ وہ سیٹی پر کوئی دھن بجائے کی کوشش کر رہا تھا مگر کپکپی کی وجہ سے کوئی دھن کہیں

درمیان ہی میں رہ جاتی تھی۔ باقی صرف وہ سیٹی رہ جاتی تھی۔ جو خطرے کے وقت بجائی جاتی ہے۔ قریشی صاحب اپنا ویڈیو کیمرہ ساتھ لائے تھے چنانچہ وہ ہماری ویڈیو فلم بناتے جا رہے تھے ایک موقع پر یہ فیضہ خالد احمد نے سنبھالا۔

اس نے بعض بڑے اچھے شاٹ لئے۔ اس ملکوتی فضا میں میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں کچھ دیر کے لئے سب سے الگ ہو جاؤں اور اس خوبصورتی سے ہم کلام ہونے کی کوشش کروں سو میں نے چند لمحے کے لئے خود کو گزشتہ ٤٧ برسوں سے الگ کیا اور فضا میں چاروں طرف پھیلے ہوئے حسن کو ڈری ڈری نظروں سے دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ فضا ایک خوبصورت خیال کی طرح مجھ پر اترنا شروع ہو گئی اور میں اس خیال میں گم ہوتا جا رہا ہوں۔

میں ہڑ بڑا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا کہ گزرے ہوئے ٤٧ برس سہمے سہمے سے میرے سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔ ان سے یہ خوبصورتی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

لخ لومانڈ کی جھیل پر غیر ملکی سیاح بھی خاصی تعداد میں موجود تھے جو اس کے ملکوتی مناظر اپنے کیمروں میں محفوظ کر رہے تھے۔ ان میں ایک جاپانی لڑکی بھی تھی جو نہیں جانتی تھی کہ وہ جھیل کی تصویریں بنا رہی ہے اور جھیل اپنی آنکھوں میں اس کی تصویر اتار رہی ہے۔ یہ نہ جاننا بھی اچھی بات ہے کہ بقول ندیم قاسمی

حسن بیگانہ احساس جمال اچھا ہے

پھول کھلتے ہیں تو بک جاتے ہیں بازاروں میں

جھیل کنارے ایک اسکاچ نے مفلروں کا چھابہ لگایا ہوا تھا۔ نہایت عمدہ مفلر اور نہایت سستے ذرا پرے سوونئیرز کی دکان تھی اور ان سوونئرز میں اسکاٹ لینڈ کے قومی رنگوں پر مشتمل ٹائیاں بھی تھیں۔ قریشی صاحب نے یہاں سے ہمارے لئے سوونیرز خریدے جن میں ویو کارڈ ز بھی شامل تھے۔ اب شام کا دھند لگا پھیل رہا تھا۔ فضا میں خنکی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ خالد احمد کی کپکپی نما ی اب سٹی میں تبدیل ہو کر گم ہو چکی تھی۔ چنانچہ ہم نے واپس گلاسگو کی راہ لی۔ میں ٧٠ء میں میوئخ سے تقریباً سو کلو میٹر کے فاصلے پر ٹیگرن سی کی جھیل دیکھی تھی یا گزشتہ برس بریڈ فورڈ کے مضافات میں ڈسٹرکٹ لیک کا نظارہ کیا تھا۔ اب یہ تیسری جھیل تھی اور یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ان تینوں میں سب سے زیادہ خوبصورت جگہ کون سی ہے۔

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یوں کہتے ہیں

ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

اور پروانہ کنفیوزڈ ہے کہ وہ کس کے رخ روشن کو زیادہ روشن قرار دے۔ مجھے تو شکاگو کی مسکین لیک بھی اچھی لگی تھی۔ جس کی لہریں خوفناک تھپڑوں کی صورت میں ساحل سے سر پٹکتی تھیں۔ یہ جھیل جمالی نہیں، جلالی کیفیت کی مظہر تھی۔ افتخار نسیم اس جھیل کے کنارے رہتا ہے اور اپنی خوبصورت شاعری سے اسے

پسمانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ خاندان واہ واہ گلاسگو واپسی پر ہم نے کچھ وقت شاپنگ میں گزارا۔ گلاسگو میں قائم حبیب بنک کے منیجر سید عترت حسین سے بھی ان کے بنک میں ملاقات ہوئی یہاں کچھ اور دوست بھی جمع ہو گئے اور پھر گپ شپ کی محفل کچھ دیر تک چلی۔ شیخ منظور حسین سے بھی اتفاقیہ طور پر ملاقات ہوئی۔ شیخ صاحب بہت عمدہ ذوق کے حامل ہیں اور خوبصورت گفتگو کرتے ہیں۔ اگلے روز لندن روانگی کے لئے ایئر پورٹ تک انہیں کی معیت میں وقت گزار جو بہت جلدی گزر گیا۔

جب میں اور حسن گھر لوٹے تو ڈاکٹر شفیع کوثر ہمارا انتظار اس طرح کر رہے تھے جس طرح گھر کے بڑے چھوٹوں کا انتظار کر رہے ہیں اور ہمارے بارے میں وہ متفکر بھی اسی طرح تھے۔ ڈاکٹر صاحب ہمارے ہم عمر ہیں مگر پردیسیوں کے بارے میں پریشانی کا حق ہم عمروں کو بھی حاصل ہوتا ہے حالانکہ ڈاکٹر صاحب کو ضیاء الحق قریشی صاحب ایسے شریف انسان کے بارے میں متفکر ہونا چاہئے تھا جو ہمارے ساتھ تھے۔ قریشی صاحب کے بارے میں،میں نے ایک بات تو بتائی ہی نہیں، ان سے میرے دو تین رشتے نکل آئے، وہ واہ کینٹ میں مقیم ظفر الحق صاحب کے سگے بھائی ہیں جو اپنے زمانے میں ادبی طور پر بہت فعال رہے ہیں۔ شاعرہ منیرہ قریشی صاحبہ کے چچا ہیں۔ رؤف قریشی صاحب کے چچا سسر ہیں اور میرے شاعر دوست حلیم قریشی کے کزن ہیں۔ خوبصورت انسانوں پر مشتمل یہ خاندان ہمارا "فیملی فرینڈ"۔ قریشی صاحب سمیت ان سب دوستو کا تعلق واہ سے ہے اور یوں اس خاندان کے ہر فرد کے ذکر پر باقاعدہ " واہ" کہنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر شفیع کوثر رات کو ڈاکٹر شفیع کوثر کے ساتھ گفتگو کا "سیشن " شروع ہوا تو بمشکل ختم ہونے میں آیا۔ حسن رضوی اور خالد احمد اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ ممکن ہے ان تک ہماری آوازیں نہ جا رہی ہوں لیکن ہم تک ان کے خراٹے با آسانی اور سافر تعداد میں پہچن رہے تھے۔ ڈاکٹر شفیع کوثر کی بیگم نے جو خود بھی مشاعرہ ہیں اور جن کا تعلق کراچی کے میمن خاندان سے ہے، ہمارے لئے کافی کی سپلائی لائن جا ری رہی۔

ازدواجی زندگی میں ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے کہ میاں بیوی کی محبت میں "مامتا" کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے اور یوں وہ دونوں ایک دوسرے کا بچوں کی طرح خیال رکھنے لگتے ہیں چنانچہ اب بھابی اس بات پر متفکر نظر آنے لگی تھیں۔

کہ ڈاکٹر صاحب نے صبح کلینک بھی جانا ہے مگر ڈاکٹر صاحب تو ساری "کشتیاں جلا کر بیٹھے ہوئے تھے اور مجھے بھی ان سے گپ شپ میں اس قدر لطف آ رہا تھا کہ سارے دن کی تھکن کے باوجود نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی چنانچہ ہم ادب کے گوناگوں اور پیچیدہ مسائل سے لے کر کائنات اور خدا تک کے موضوعات پہ کچھ اس خضوع وخشوع سے گفتگو کرتے رہے جیسے آج یہ گتھیاں سلجھا کر ہی اٹھیں گے حالانکہ خدا کے بارے میں پوپ کی ایک نظم ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ انسانی ذہن محدود ہے جبکہ خدا لا محدود ہے اور یوں ایک لامحدود چیز ایک محدود چیز میں نہیں سما سکتی۔ عدم نے یہ بات زیادہ خوبصورت انداز میں کہی ہے۔

آگہی میں اک خلا موجود ہے

اس کا مطلب ہے خدا موجود ہے

خدا کے بارے میں احسان دانش نے ایک ہی غزل میں دو طرح کے شعر کہے ہیں۔

کچھ ایسے مناظر بھی گزرتے ہیں نظر میں

جب سوچنا پڑتا ہے خدا ہے کہ نہیں ہے

آ جاؤ گے اک روز جو حالات کی زد میں

ہو جائے گا معلوم خدا ہے کہ نہیں ہے

ڈاکٹر شفیع کوثر نے بھی خدا کے موضوع پر دو خوبصورت شعر سنائے وہ آپ بھی سن لیں، ان میں سے پہلا شعر اکبر الہ آبادی اور دوسرا احمد ندیم قاسمی کا ہے

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں

ڈور کو الجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

نا رسائی کی قسم اتنا سمجھ میں آیا

حسن جب ہاتھ نہ آیا تو خدا کہلایا

ڈاکٹر کوثر کی دلچسپیاں بہت گوناگوں نوعیت کی ہیں، موصوف ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں۔ حلقہ ادب و فن کے انتہائی فعال صدر ہیں چنانچہ گلاسگو کی ساری ادبی رونق انہی کے دم سے ہے۔ سماجی کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں اور مسلمان کمیونٹی کے لئے بھی ہمیشہ سر گرم عمل رہتے ہیں، چنانچہ ان سے رات گئے تک ان موضوعات پر بھی کافی سیر حاصل گفتگو ہوتی رہی مگر اب دونوں کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو چکی تھیں چنانچہ ہم صبح تین بجے کے قریب اپنے اپنے بستروں پر جا کر لیٹ گئے۔

اگلے روز گلاسگو کے ایک ممتاز بزنس میں کی طرف سے ہم مہمانوں کے اعزاز میں عصرانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جن کا نام ذہن سے محو ہو گیا ہے۔ سرخ و سفید رنگت، شکل سے بٹ صاحب لگتے تھے اور اس خوراک سے بھی جس کا اہتمام انہوں نے کیا تھا۔ کسی نے بٹ صاحب سے پوچھا، بٹ صاحب آپ کو والد صاحب سے ورثے میں دو مکان ملے تھے ان کا کیا ہوا؟ بٹ صاحب نے مختصر سا جواب دیا ان کے سری پائے اور کلچے کھا لئے۔ ان "بٹ صاحب" کا معاملہ ایسا نہیں تھا کیونکہ انہوں نے خوش خوراکی کے باوجود اثاثے بیچنے کی بجائے اثاثے بنائے تھے۔ جس کا اندازہ ان کے رہن سہن سے بھی ہوتا تھا۔ امجد اسلام امجد اور فردوس بھابی بھی اس ظہرانے میں موجود تھے۔ امجد اور بھابی کا پروگرام ٹرین کے ذریعے واپس لندن جانے کا تھا تا کہ راستے کے مناظر سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملے جبکہ میں خالد اور حسن بائی

ایئر لندن جا رہے تھے۔ لندن ہمارے لئے فیصل آباد کا گھنٹہ گھر بن کر رہ گیا تھا کہ گھوم پھر کر ہم وہیں آ نکلتے تھے۔

کچھ "غیر سائنسی" حقیقتیں

ایئر پورٹ پر بہت سے احباب ہمیں الوداع کہنے کے لئے موجود تھے، ڈاکٹر شفیع کوثر جناب ضیاء الحق قریشی، شیخ منظور حسین، سید عشرت حسین۔ گلاسگو کے خوبصورت شہر اور اس کے خوبصورت مکینوں سے جدائی کا وقت آن پہنچا تھا۔ برٹش ائرویز کے کاؤنٹر سے بورڈنگ کارڈ لیتے ہوئے میں نے سوچا دنیا کتنی مختصر ہے۔ سات سمندر پار بیٹھے ہوئے دوستوں سے ملاقاتیں کتنی آسان ہو گئی ہیں۔ ہم کہاں سے چل کر کہاں پہنچے ہیں۔ لیکن پھر انہیں لمحوں میں خیال آیا کہ یہ دنیا یہی ہے جو ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں یا ہماری بینائی ہی اتنی ہے ؟ یہ آنکھیں کچھ چھپاتی بھی ہیں مجھ سے

ان آنکھیں سے پرے بھی روشنی ہے اگر یہ شعر اچھا ہے تو واضح رہے راقم الحروف کا ہے بلکہ کبھی کبھی تو یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ جو نظر آتا ہے ممکن ہے وہی حقیقت نہ ہو۔ آپ پولتھن کا ایک بے جان بیگ آگ کے پاس رکھیں۔ تھوڑی دیر بعد اس میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ اس پولھتن کے بیگ کی طرح ہم خود کچھ بھی نہ ہوں اور کسی اور آگ کی تپش سے ہم حرکت کرتے اور گفتگو کرتے نظر آتے ہوں ؟ تاہم اگر انسان اپنا علیحدہ وجود بھی رکھتا ہے تبھی وہ بہت پر اسرار ہے۔ پریشانی اور کھچاؤ سے اس کے جسم میں کیمیاوی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں جس کے نتیجے میں اسے ذیابیطس اور دل کی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ پریشانی ایک تجریدی چیز ہے۔ چنانچہ ایک خیال ذہن میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پریشانی سے جسم میں منفی تبدیلیاں واقع ہو سکتی ہیں تو دعا بھی جسم کی کیمسٹری بدل سکتی ہے۔

اور مثبت تبدیلیاں لانے پر قادر ہے۔ اچھا یا برا خیال بھی انسانی نظام پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ کیا آج کی زندگی کی بے شمار "لذتوں " سے محروم ہمارے بزرگ جو خوش و خرم زندگی بسر کرتے تھے اور لمبی عمریں پاتے تھے،ان کی یہ قوت ان کے دست دعا، ان کے خیال اور ان کی سوچ کے تابع تو نہیں تھی؟ سائنس کے عجوبات میں الجھے ہوئے اور اس کے کمالات کے سحر میں گم آج کے انسان کو شاید ان سوالات پربھی سنجیدگی سے غور کرنا پڑے۔ میں چھوٹے موٹے گناہوں کا قائل نہیں ہوں سائنس کا ایک کمال یہ تھا کہ تھوڑی ہی دیر بعد زمین سے ہمارا رابطہ ختم ہو گیا تھا اور ہم تیس ہزار فٹ کی بلندی پر فضا میں اڑ رہے تھے مگر لگتا یوں تھا جیسے ہم اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ ایئر ہوسٹسوں نے کمر ہمت باندھ لی تھی یعنی اپنے یونیفارم پر ایپرن پہن لئے تھے اور مہمانوں کی خدمت میں مشغول ہو گئی تھیں۔ میں نے یہ پہلی ڈومیسٹک فلائٹ دیکھی تھی جس کی پرواز کا دورانیہ بھی زیادہ

طویل نہیں تھا، مگر اس میں شراب سرو کی جا رہی تھی۔ ایئر ہوسٹس نے ایک گلاس اور وہسکی کی ایک خوراک جو ایک منی ایچر شیشی میں بند تھی، میرے سامنے بھی رکھ دی، میں نے وہسکی کی یہ "بوتل" اسے واپس کر دی اور کہا " میں چھوٹے موٹے گناہوں کا قائل نہیں ہوں۔

پھر کون سے گناہوں کے قائل ہیں ؟ اس سخن فہم حرافہ نے مسکرا کر کہا۔

مگر پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ آگے بڑھ گئی اور تھوڑی دیر بعد سیون اپ ٹائپ کی ایک مشروب میرے سامنے رکھ کر دوسرے مہمانوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ مجھے دنیا کی تقریباً سبھی معروف ایئر لائنز میں سفر کا اتفاق ہوا ہے۔ اور میری انتہائی عالمانہ "تحقیق کا نچوڑ یہ ہے کہ پی آئی اے کی سروس کے علاوہ اس کی ائر ہوسٹز بھی شکل صورت کے حوالے سے کسی دوسری ائر لائن کی ہوسٹز سے کم نہیں ہیں تا ہم اس میں الا ماشا ء اللہ کہنے کی گنجائش بہر حال موجود ہے۔

اس جہاز کی فضائی میزبان خواتین بھی خاصی اللہ لوک قسم کی تھیں۔ ان میں سے جو شادی شدہ تھیں، انہیں بہ آسانی طلاق ہو سکتی تھی اور جن کی شادی نہیں ہوئی تھی ان کی شادی آسمانوں پر ہی ممکن تھی۔ سو میں اپنے سفر کے ساتھ محو گفتگو ہو گیا۔

یہ ٹماٹر جیسے گالوں والا اسکاٹ تھا، کسی فرم سے وابستہ تھا اور لندن کاروباری میٹنگ کے سلسلے میں جا رہا تھا، میرے اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

ایک دل جلا اسکاٹ مجھے یقین ہے تم سفر سے لطف اندوز ہو رہے ہو گے ؟

شٹ، جہاز کے سفر سے تو میری جان جاتی ہے۔

وہ کیوں ؟

اس کی تباہی کی صورت میں شناخت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔

لاحول ولا قوہ

کوئی اور بات کرو۔

ٹھیک ہے مگر تم بھی اس سلسلے میں کوئی بات نہ کرنا۔ یہ بتاؤ برطانیہ کب آئے ؟

دو تین ہفتے قبل آئے تھے۔

کس سلسلے میں ؟

مشاعرے پڑھنے کے لئے۔

یہ کیا چیز ہے ؟

خاصی احمقانہ چیز ہے۔ بس تم یوں سمجھو کہ گھومنے پھرنے آئے ہیں۔

پھر تمہیں یہ ملک کیسا لگا؟

بہت خوبصورت۔

اور انگریز؟

بہت خوش مزاج با اصول۔

انگریز خوش مزاج با اصول؟

کیوں ؟میں کوئی بات غلط کہہ گیا ہوں ؟

ان سے زیادہ منافق اور بے اصول کوئی قوم نہیں۔ یہ ہمیں بھی اسی خندہ پیشانی سے ملتے ہیں مگر انہوں نے ہمیں پسماندہ رکھا ہے۔ تم نے لندن بھی دیکھا ہے اور گلاسگو بھی۔ کیا تمہیں واضح فرق نظر نہیں آیا۔ پھر یہ کہتے ہیں اسکاٹ لینڈ برطانیہ کا حصہ ہے۔ میں جانتا تھا اسکاٹ لینڈ والوں کا یہ ویک پوائنٹ ہے اگر میں نے اس میں زیادہ دلچسپی لی تو یہ انگریزوں کے ساتھ اپنی چپقلش کی طویل تاریخ بیان کرنے بیٹھ جائے گا جو میں گلاسگو میں قیام کے دوران کئی اسکاٹ لوگوں سے بار بار سن چکا تھا چنانچہ میں نے موضوع بدل دیا مگر اس کی سوئی آخر دم تک وہیں اڑی رہی چنانچہ لندن پہنچنے تک وہ مسلسل اس "مصرعہ طرح" پر غزل مکمل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

برائٹن کے "حمام" میں

ایئر پورٹ سے باہر نکلنے کے بعد ہم نے ٹرین پکڑی اور ہانسلو ویسٹ کے استیشن پر اتر گئے۔ وہاں سے میں نے بخش لائل پوری کو فو کیا کہ آپ کے مہمان پھر آ گئے ہیں، انہیں اسٹیشن سے آ کر لے جاؤ۔ اس پر مجھے خود ہی لاہور کے ایک شاعر یاد آ گئے جو کراچی گئے تو وہاں کئی مہینے قیام پذیر رہے۔ اس دوران شہر میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں ان کے نام کے ساتھ لاہور سے آئے ہوئے مہمان شاعر کی اناؤنسمنٹ بھی ہوتی۔ ایک مشاعرے میں ایک دل جلے اسٹیج سیکریٹری نے تنگ آ کر اس اعلان میں تھوڑی سی تبدیلی کی اور کہا اب لاہور سے آئے ہوئے مستقل مہمان شاعر اپنا کلام سنائیں گے۔

بخش کو فون کرتے ہوئے میرا جی چاہا کہ انہیں کہوں کہ لاہور سے آئے ہوئے مستقل مہمان شاعر پھر تشریف لے آئے ہیں، آپ آ کر لے جائیں مگر پھر یہ سوچ کر چپ رہا کہ اس شرارتی دوست کے ہاتھ یہ جملہ نہیں آنا چاہئے۔

تھوڑی دیر بعد ہم ایک بار پھر بخش کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے اور لندن کے ادیبوں کی پالیٹکس کے موضوع پر بحث تھی۔ لندن میں اس وقت ادبی گروپوں کی تعداد تقریباً اتنی ہی ہے جتنی لندن کے ادیبوں کی ہے۔ یہاں ادیب آپس میں گتھم گتھا بھی ہو جاتے ہیں چنانچہ اسی بہانے وہ اپنی صحت کا خیال رکھتے ہیں۔ یہاں سے میں نے دوستوں کو ٹیلی فون پر اپنی آمد کی اطلاع دی اور تھوڑی ہی دیر بعد اعجاز اپنی اسٹیشن ویگن لے کر بخش لائل پوری کے ہاں پہنچ گئے اور ہم اس کے ساتھ "اپنے " گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

اب لندن میں ہماری تین مصروفیات تھیں ایک اختر ضیائی کے مشاعرے میں شرکت کرنا تھی۔ دوسرے مجاہد ترمذی کا عشائیہ اٹینڈ کرنا تھا اور تیسرے پاکستانی، سفارت خانے جانا تھا۔ ان مصروفیات سے فراغت کے بعد ہم نے کار میں فرانس، جرمنی، ہالینڈ، بیلجیم، سویڈن، ڈنمارک اور ناروے کے لئے روانہ ہونا تھا۔ ڈنمارک اور نوروے میں تو مشاعرے تھے جبکہ بچارے باقی ملکوں نے رستے میں پڑنے کی وجہ سے رگڑ جانا تھا تاہم یہ روٹ ہم نے دانستہ تیار کیا تھا تا کہ ہم کہہ سکیں کہ

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے

بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

اور اب ایک بار پھر ہم اعجاز کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں باقر نقوی، ہمیں برائٹین لے جانے کے آئے ہیں۔ ان کے ساتھ عاشور کاظمی بھی ہیں۔ میں اور حسن تیار کھڑے ہیں، ہماری بے شمار دستکوں کے بعد خالد نے ابھی ابھی باتھ روم سے اطلاع دی ہے کہ وہ بھی تیار ہے۔ بس اور آدھ گھنٹے کی بات ہے۔ خالد قول کا سچا ہے۔ چنانچہ ٹھیک آدھ گھنٹے بعد باتھ روم کا دروازہ کھلتا ہے اور وہ ایک ہاتھ میں سگریٹ اور ایک ہاتھ میں پتلون کو "سہارا" دیئے باہر نکلتا ہے۔ اس کے باتھ بیس پچیس سگریٹوں کا دھواں بھی دروازہ کھلتے ہی ایک گھٹا کی صورت میں فضا پر چھا جاتا ہے چنانچہ یوں لگتا ہے جیسے خالد احمد کی صورت میں ایک جن دھوئیں کے بادلوں میں نمودار ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں جو تھوری بہت کمی تھی وہ خالد احمد اپنے قہقہوں کی گڑ گڑاہٹ سے پوری کر دیتا ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ یہ جن ابھی حسن سے مخاطب ہو گا اور پوچھے گا کیا حکم ہے میرے آقا؟ اور اگر حسن غلطی سے کوئی حکم بتا بیٹھا تو یہ جن اپنے آقا کو اتنی جگتیں کرے گا کہ آقا منہ چھپاتا پھرے گا۔ بحر حال اب خالد احمد مکمل طور پر دستیاب ہے۔ چنانچہ اب وہ ہمارے ساتھ چلنے کے لئے واقعی تیار ہے اور پھر تھوڑی دیر بعد ہم برائٹین کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں۔

برائٹین لندن سے تقریباً سو کلو میٹر کے فاصلے پر ایک خوبصورت ساحلی شہر ہے۔ برطانیہ کا ایک سرا گلاسگو اور دوسرا برائٹین ہے اور یوں برائٹین کو ہاتھ لگانے کے بعد ہم اس دعوے میں حق بجانب ہیں کہ ہم برطانیہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھومے ہیں۔ ادب کا کوئی قاری ایسا نہیں جو خالد احمد کے شعری مقام سے واقف نہ ہو، برائٹین کے سفر کا احوال تو مجھے بیان کرنا ہی ہے پہلے اس کے چند خوبصورت شعر سن لیں

کوئی تو روئے کپٹ کر جوان لاشوں سے

اس لئے تو وہ بیٹوں کو مائیں دیتا ہے

ترک تعلقات پہ رویا نہ تو نہ میں میں

لیکن یہ کیا کہ چین سے سویا نہ تو نہ میں

ہر چند اختلاف کے پہلو ہزار تھے

وا کر سکا مگر لب گویا نہ تو نہ میں

بے جہت فکر کے ہاتھوں میں کماں کیوں دی تھی؟

اب ہدف تو ہے تو کیا تیر تو چل جانا تھا؟

خالد احمد کی ایک ایکسٹرا کوالیفیکشن اس کی حاضر دماغی اور بذلہ سنجی بھی ہے وہ جس محفل میں موجود ہو وہ محفل بے رونق نہیں ہو سکتی، خالد کسی ایک کو اپنے جملوں کا ہدف بنا لیتا ہے اور ان جملوں میں ایسے ایسے نکتے پیدا کرتا ہے کہ محفل

کشت زعفران بن جاتی ہے۔ برائٹین کے رستے میں اس کا ہدف حسن رضوی ہے۔ ہمیں سو کلو میٹر طے ہونے کا پتہ ہی نہیں چلا جبکہ حسن بار بار پوچھتا ہے کہ برائٹین کب آئے گا بالکل اسی طرح جس طرح شادی شدہ لوگوں کے بارے میں ایک تحقیق یہ ہے کہ ان کی عمر لمبی ہوتی ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انہیں عمر لمبی لگتی ہے۔

بہر حال حسن کے سوال کے جواب میں کہ برائٹین کب آئے گا؟ خالد احمد کہتا ہے کہ برائیٹین تمہاری شاعری کی طرح نہیں کہ ہر کوئی ایک جست میں اس تک پہنچ جائے۔ خوبصورت چیزوں تک رسائی میں بہر حال کچھ وقت لگتا ہے۔ اس پر حسن امداد طلب نظروں سے میری طرف دیکھتا ہے مگر میں اس وقت ہنسنے کے موڈ میں ہوں چنانچہ ان لمحوں میں حسن کے لئے میں امریکہ کا ساتواں بحری بیڑا ثابت ہوتا ہوں۔

تصور جاناں

برائٹین کی حدود میں داخل ہوتے ہی انداز ہ ہوتا ہے کہ یہ شہر اسم بامسمی ہے، یہاں ہر چیز برائٹ نظر آ رہی ہے، چہرے بھی نکھرے نکھرے سے ہیں اور عمارتیں بھی زیادہ تر عمارتیں سفید رنگ کی ہیں اور یوں اجلی اجلی لگتی ہیں۔ ہماری منزل ساحل سمندر ہے۔ کسی سے سمندر کا پتہ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ سمندر سے چلنے والی ہوائیں خود اپنا رستہ بتاتی ہیں۔ چنانچہ ہم سمندر کی طرح کھنچے چلے جا رہے ہیں اور بلآخر ایک مقام پر سمندر ہمارے استقبال کے لئے سامنے کھڑا نظر آتا ہے، میں سمندر کے تپاک سے بہت ڈرتا ہوں چنانچہ میں نے کبھی نہیں چاہا کہ یہ آگے بڑھ کر میرا استقبال کرے، بس یہی دعا مانگتا رہتا ہوں کہ یہ جہاں بھی رہے خوش رہے۔ ساحل سمندر کے گردو پیش کی فضا بالکل دیسی ہے جیسے یورپ کے دوسرے ساحلوں کی ہے۔ ایک طرف خوب صورت ہوٹلوں اور ریستورانوں کی ایک طویل قطار جن میں ٹھرے ہوئے مہمان باہر کرسیاں ڈالے بیٹھے ہیں کہ غالب یاد آ جاتا ہے

جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن

بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

فرق صرف یہ ہے کہ انہیں جاناں کا تصور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ جاناں ان کے ساتھ چپکا ہوتا ہے اور کچھ اس طرح چپکا ہوتا ہے کہ چمٹا گرم کر کے ہی اسے الگ کیا جا سکتا ہے۔

صاحب پرے پرے

دوسی طرف سمندر کے کنارے قطار اندر قطار کھوکھا نما دکانیں ہیں جہاں سوئنرز اور دوسری فوری ضرورت کی اشیاء ملتی ہیں۔ ان ساحلوں کا ایک خاصا ان کے جوا خانے بھی ہیں مگر یہ صرف بڑے بڑے ساحلوں پر نظر آتے ہیں۔ سمندر کے کنارے بنچوں پر بابے اور بابیاں بیٹھے عمر رفتہ کو آواز دے رہے ہیں، ان سے اگر بیلو بیلو کیا جائے تو جان چھڑانا مشکل ہو جاتی ہے کہ وہ تو کسی ذی روح سے گفتگو کے لئے ترسے ہوتے ہیں۔ ساحل کی ریت پر بچے بچیاں عورتیں اور مرد غسل کے لباس میں ایک دوسرے سے چھلوں میں مشغول ہیں۔ پنجابی کا ایک اکھن ہے۔ انھے دیاں مسخریاں ماں بہن دے نال، یہاں یہ محاورہ بعض سوجا کھوں پر بھی فٹ آتا ہے آج سورج خوب چمک رہا ہے۔ سیاح معمول سے زیادہ تعداد میں یہاں موجود ہیں، ان میں بڑی تعداد میں غیر ملکی سیاحوں کی بھی ہیں۔ جب ہم پسماندہ ممالک کے لوگ ان مقامات پر آئے اور انہیں ہنستے کھیلتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنے محرومیوں کی ترجمانی میر تقی میر کی اس شعر کی ترجمانی میں نظر آتی ہے۔

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگ گل سے میر

بلبل پکاری دیکھ دیکھ کے صاحب پرے پرے

چنانچہ ہم اس "بلبل" کی آواز پر صاد کرتے ہیں اور ساحلی سڑک پر ڈرائیو کے لئے ذرا "پرے " نکل جاتے ہیں۔ ذرا دور جانے کے بعد باقر نقوی گاڑی ایک جگہ پارک کرتے ہیں اور کہتے ہیں آپ برائٹین کا یہ ساحلی حصہ بھی دیکھ لیں تا کہ دل میں کوئی حسرت نہ رہے۔

ہم ڈھلان سے اترنے کے بعد ساحل کی ریت پر پاؤں دھرتے ہیں تو ہمیں ایک مجذوب سے انگریز بزرگ نظر آتے ہیں جو بالکل برہنہ حالت میں ہماری طرف چلے آ رہے ہیں، خالد احمد ان کی دعائیں لینے کے لئے آگے بڑھے مگر اچانک اس کی نظر چند قدم کے فاصلے پر ریت میں اوندھے منہ لیٹی ایک دوشیزہ پر پڑتی ہے۔ جس کی کہنیا ریت میں دھنسی ہوئی ہیں اور وہ چیونگم چباتے ہوئے ہاتھ میں پنسل پکڑے کسی رسالے میں شائع شدہ معمہ حل کرنے میں مشغول ہے مگر ہم سے یہ معمہ حل نہیں ہو پاتا کہ وہ بزرگ تو خیر مجذوب ہیں مگر اس بی بی کو "فطری" لباس اتنا پسند کیوں ہے ؟

سلفے دی لاٹ ورگی

ہم اسی سوچ میں غلطاں و پیچاں ساحل پر آگے بڑھتے جاتے ہیں اور ہر دس قدم کے بعد کھلے آسمان تلے مرد و زن ہمیں اسی حالت میں نظر آتے ہیں جس حالت میں وہ پیدا ہوئے تھے۔ یہ سب لوگ ہماری موجودگی بلکہ ایک دوسرے کی موجودگی سے

بھی بے نیاز نظر آتے ہیں، ایک جگہ دو تین لڑکیاں اور دو تین لڑکے بیٹھے کچھ اس توجہ سے کھانا کھا رہے ہیں جیسے کسی اور کی توجہ ان کی طرف نہیں ہے۔ سمندر میں سے ایک دوشیزہ نہا کر باہر نکل رہی ہے

گوری نہا کے چھپڑ چون نکلی

تے سلفے دی لاٹ ورگی

وہ بیگ میں سے تولیہ نکالتی ہے۔ تولئے سے جسم پونچھتی ہے۔ اور پھر یہ تولیہ ریت پر بچھا کر اور آنکھیں بند کر کے یوں چت لیٹ جاتی ہے جیسے گیان دھیان میں مشغول ہو۔

ایک جلالی مائی صاحبہ

ایک مائی صاحبہ عمر ساٹھ سال، پچکی ہوئی کھال، لٹکا ہوا پیٹ سلوٹوں سے بھرا ہوا جسم ساحل پر مٹر گشت فرما رہی ہیں۔ اور ان کے چہرے پر اتنا جلال ہے کہ لگتا ہے انہیں اگر کوئی کپڑوں میں نظر آیا تو وہ اسے ماریں گی۔ حالانکہ خود انہوں نے اپنی پرانی وضع کا پاس کیا ہوا ہے۔ یعنی اپنی آنکھیں عینک سے ڈھانپتی ہوئی ہیں اتنے میں غسل آفتابی کے کچھ اور شوقین ساحل پر لنگر انداز ہوتے ہیں یہ گروہ مرد و زن پر مشتمل ہے۔ یہ ہماری موجودگی سے بے نیاز خود کو سہولت سے بے لباس کرتا ہے۔ یہ لوگ سمندر کی طرف بڑھتے ہوئے اپنا لباس ریت پر یوں پھینک دیتے ہیں جیسے عید کے روز قصائی بکرے کی کھال زمین پر ڈھیر کرتا ہے۔

مجھے کرشن جی مہاراج یاد آ جاتے ہیں،۔ کرشن جی ایک روز دریا کی سیر کو جاتے ہیں اور کیا دیکھتے ہیں کہ گوپیاں دریا میں غسل کر رہی ہیں۔ اور ان کے کپڑے دریا کے کنارے پڑے ہیں۔ کرشن جی چپکے سے یہ کپڑے اٹھاتے ہیں اور ایک درخت پر چڑھ کر خود کو ان کی ٹہنیوں میں چھپا لیتے ہیں گوپیاں جب نہا کر باہر نکلتی ہیں اور اپنے کپڑے غائب پاتی ہیں تو پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھتی ہیں۔ اسی اثنا میں ان کی نگاہ اچانک کرشن جی پر پڑتی ہے۔ وہ منتیں کرتی ہیں کہ ان کے کپڑے واپس کر دیئے جائیں۔

اس پر وہ ہاتھوں سے ستر کا کام لیتی ہیں۔ اور شرماتی لجاتی آگے بڑھتی ہیں۔ اس پر کرشن جی کپڑے دینے سے انکار کر دیتے ہیں اور یہ شرط عائد کرتے ہیں کہ جس نے کپڑے لینے ہیں وہ دونوں ہاتھ چھوڑ کر سامنے آئے۔ ورنہ کپڑے نہیں ملیں گے۔ چنانچہ مجبوراً گوپیوں کو ایسا ہی کرنا پڑتا ہے کرشن جی مہاراج کے سوانح نگار یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد اس کی توجیہ یہ بیان کرتے ہیں کہ کرشن جی سر عام برہنہ غسل کرنے کی قبیح رسم کی حوصلہ شکنی کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس کے لئے

مجبوراً یہ سب کچھ کرنا پڑا۔ حسن یہ واقعہ سننے کے بعد کہتا ہے میں بھی اس قبیح رسم کو ختم کرنا چاہتا ہوں کیا کیا جائے ؟تو گویا ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے حسن میرا یہ جواب سن کر کہتا ہے۔

ہیں ایسی بھی کوئی بات نہیں، میں ہنستے ہوئے کہتا ہوں یہ قوم روحانی بیماریوں سے نہیں جسمانی بیماریوں سے خوف زدہ ہوتی ہے دعا کرو کہ ایک ریسرچ یہ سامنے آ جائے کہ برہنہ غسل سے کینسر کے امکانات میں پچاس فیصد اضافہ ہو جات اہے۔ اس کے بعد یہ ساحل راتوں رات ویران ہو جائیں گے۔ تم نے دیکھا ہے ایڈز کے خوف نے انہیں کتنا قناعت پسند بنا دیا ہے۔ باقر نقوی گھڑی دیکھتے ہیں یہ ایک لحاظ سے سگنل ہے کہ اب واپس چلنا چاہئے۔ حسن ابھی اس سوچ میں گم ہے کہ یہ قبیح رسم کیسے ختم کی جائے کیونکہ اس کی نظر ریت پر پڑے ہوئے چھوٹے بڑے کپڑوں پر ہے۔ تم نے ایک بات محسوس کی؟ میں خالد سے پوچھتا ہوں۔

کیا؟

اس بے لباس ہجوم میں معاشرے کے باغی یہ لوگ نہیں ہم لوگ لگ رہے ہیں۔ چنانچہ اگر تم غور کرو تو یہ دزدیدہ نظروں سے ہمیں اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے بے شرم یہ نہیں ہم ہیں۔ اکثریت میں اقلیت کا یہ حال ہوتا ہے۔ تو پھر کیا خیال ہے / خالد شرارت آمیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے سوال کرتا ہے۔ یہاں نکل چلتے ہیں اب تو ویسے بھی کراہیت محسوس ہونے لگی ہے۔

استغفر اللہ اتنی بے شرمی

ہم اپنی کار کی طرف بڑھنے لگتے ہیں اور یہ دیکھ کر دل کو کچھ ڈھارس سی بندھتی ہے کہ اس محفل میں صرف ہم ہی بے شرم نہیں دو تین بوڑھے انگریز بھی ہم جیسے ہیں جو پورے لباس میں ملبوس آنکھوں پر کالی عینک چڑھائے بے بسی کے یہ مناظر ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے ہیں اور واپس گھر جا کر یقیناً وہ اخلاقی قدروں کے انحطاط پر اپنی دل گرفتگی کا اظہار کریں گے۔

خود ہم نے بھی واپس لندن جاتے ہوئے او استغفر اللہ کا ورد کرتے ہوئے اس بے شرمی پر تمام رستے میں اظہار خیال کیا۔

خالد احمد کا خیال تھا کہ جو مناظر ہم نے دیکھے ہیں یہ اس قوم کی اجتماعی سوچ کا مظہر نہیں بلکہ ایک انتہائی معمول اقلیت ہے جو قانونی تحفظ فراہم ہونے کے بعد اس مادر پدر آزادی کا مظاہرہ کر رہی ہے، عاشور کاظمی کا نقطہ نظریہ تھا کہ چونکہ یورپین اقوام کی اس نوع کی آزادی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا، اس لئے اس میں پرانی پابندیوں کے خلاف درد عمل کے طور پر تشدد اور انتہا پسندی کا رجحان نظر آتا ہے۔

چنانچہ یہ لوگ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک دفعہ پھر نارمل ہو جائیں گے جبکہ میرا خیال یہ تھا کہ جن رویوں کو ہم لوگ ابنار مل سمجھتے ہیں وہ ان لوگوں میں نارمل رویوں کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اہل مغرب صنعتی معاشرے میں اپنی ٹھہری ہوئی زندگی اور روٹین کیی مصروفیات سے تنگ آئے ہوئے ہیں۔

چنانچہ اس روٹین کو بریک کرنے کے کسی نئی چیز کی جستجو میں رہتے ہیں مگر کچھ عرصے بعد وہ نئی چیز کی جستجو میں رہتے ہیں مگر کچھ عرصے بعد وہ نئی چیز بھی روٹین میں تبدیل ہو جاتی ہے اور وٹ لیسٹ کا سوال ایک دفعہ پھر ان کے سامنے آن کھڑا ہوا ہے۔ چنانچہ وہ اس رستے پر بڑھتے جا رہے ہیں کچھ لوگ عالی شان اپارٹمنٹس کو چھوڑ کر غاروں میں رہنا شروع ہو گئے ہیں۔ شراب چھوڑ کر ہیروئن پینے لگے ہیں۔ امیر گھرانوں کے لڑکے لڑکیاں سب آسائشوں کو چھوڑ چھاڑ کر ہم ایسے غریب ملکوں میں گندے مندے لباس پہن کر پھرتے رہتے ہیں اور ان میں کئی بھیک بھی مانگتے نظر آتے ہیں۔

صنعتی معاشرے میں فیملی سسٹم کبھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اور فیملی سسٹم بریک ہونے سے نت نئی فرسٹریشنز جنسی عمل میں بھی پورسز بے راہ ردی کو فروغ دیتی ہیں اور رہن سہن کے نارمل رویوں کو ابنارمل جاننے اور اخلاقی ضابطوں اور بندھے بندھائے اصولوں کی شکست و ریخت کا باعث بھی بنتی ہیں۔

یہ برہنہ غسل تہذیب کی جکڑ بندوں کے خلاف احتجاج بھی ہو سکتا ہے۔ اور اگر احتجاج نہیں بھی ہے تو بزعم خود انسان کے آزاد ہونے کا اعلان ضرور ہے۔

لندن پہنچنے کے بعد تین کام باقی رہ گئے تھے ایک مجاہد ترمذی کے عشائیے میں شرکت، دوسرے اختر ضیائی کا مشاعرہ اور تیسرے پاکستانی سفارت خانے میں دوستوں سے ملاقات۔

مجاہد ترمذی کا عشائیہ

مجاہد ترمذی نے عشائیے کا انتظام اپنے دوست بلونت کپور کے اپارٹمنٹ میں کیا تھا۔ بلونت کپور ممتاز صحافی ہیں اور انگریز کے خلاف جدوجہد میں بارہا جیل یاترا بھی کر چکے ہیں اور اب ایک عرصے سے انگریزوں ہی کے ملک میں رہ رہے ہیں بلونت کپور کی ایک اضافی خوبی یہ ہے کہ وہ کھانا بہت اچھا بناتے ہیں۔ مجاہد ترمذی نے عشائیے کا اہتمام غالباً یہی سوچ کر بلونت کے ہاں کیا تھا۔ اس دعوت میں برادر عزیز جاوید حکیم قریشی، اعجاز احمد اعجاز، بیرسٹر رشید، قیصر امام، ابرار ترمذی اور دوسرے بہت سے دوستوں نے شرکت کی۔ مجاہد ترمذی لندن کی فعال ثقافتی شخصیت ہیں۔ وہ لاہور کے ایک ممتاز علمی گھرانے کے فرد ہیں۔ چنانچہ اگرچہ خود

شاعر ادیب نہیں ہیں لیکن فیض کلچرل اکیڈمی کی سربراہی کے حوالے سے ان کا پس منظر خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ تارکین وطن کا قبرستان اور اب برطانیہ کا آخری مشاعرہ تھا جس میں ہم نے شرکت کرنا تھی اور اس کے بعد بذریعہ کار یورپ کے طویل سفر کے لئے روانہ ہو جانا تھا۔ یہ مشاعرہ حلقہ ارباب ادب لندن کے زیر اہتمام تھا جس کے کرتا دھرتا اختر ضیائی ہیں۔ اختر ضیائی قادر الکلام شاعر ہیں اور لندن میں ادبی سرگرمیوں کو تر و تازہ رکھنے والوں میں سر فہرست ہیں۔

یہ مشاعرہ والتھم اسٹو کے ایک ہال میں تھا۔ اعجاز نے کار ایک قبرستان کے پس روک دی۔ اس قبرستان میں اس کا ایک عزیز دوست جمیل مدنی دفن تھا، مدنی ایک خوبصورت شاعر تھا تلاش روزگار میں اپنے وطن کے در و دیوار کو الوداع کہہ کر لندن آیا اور اپنوں سے ہزاروں میل دور لندن ہی کے قبرستان میں ابدی نیند سو رہا ہے۔ مجھے اجنبی مٹی میں دفن ہونا عجیب سا لگتا ہے چنانچہ یورپ اور امریکہ کی سیاحت کے دوران مجھے ہمیشہ یہی دھڑکا لگا رہا کہ میں کہیں فوت نہ جاؤں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے احباب کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے میری میت پاکستان بھجوانے کی بجائے گوروں کے قبرستان میں دفن کر دیں۔

اس قبرستان کا ایک حصہ مسلمانو ں کے لئے تھا جس میں پاکستانی، بھارتی، ترک امگریٹس دفن تھے۔ ترک مسلمانوں کے قبریں زیادہ صاف ستھری اور خوبصورت تھیں اور ان کے کتبوں پر ان کی تصویریں بھی کندہ تھیں۔ میں ابرار ترمذی، اطہر راز، حسن رضوی اور اعجاز، جمیل مدنی کے لئے دعائے مغفرت کرنے کے بعد قبرستان میں ادھر ادھر بکھر گئے تلاش روزگار میں برطانیہ آئے ہوئے پاکستانیوں کی قبروں پر جھاڑیوں اور خودرو پودے اگے ہوئے تھے۔

شاید ان کے عزیز و اقارب کو فرصت نہ تھی کہ وہ کبھی ان کی خبر بھی لے لیں جو ان کے بہتر مستقبل کے لئے اپنے وطن کو چھوڑ کر یہاں آن بسے تھے۔ میں نے ان قبروں کی صفائی کی ٹھانی مگر دو تین قبروں سے خود رو پودوں کو اکھاڑنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھوں سے خون بہہ رہا ہے۔ تیز نوکیلے کانٹے میری انگلیوں میں چبھ گئے تھے بلکہ پیوست ہو گئے تھے۔ میں نے اپنے مٹی سے بھرے ہوئے ہاتھ پانی سے دھوئے اور قبرستان کی حدود سے باہر نکل آیا اور میں نے اپنے زخمی ہاتھ دعا کے لئے اٹھا دیئے۔

یارب العالمین تیری نعمتیں دنیا کے سب انسانوں کے لئے ہیں۔ تو نے جن لوگوں کو ان نعمتوں امین بنایا تھا۔ وہ اس میں خیانت کر رہے ہیں اور یوں تیرے بندے تلاش رزق میں دربدر پھر رہے ہیں۔ مولائے کائنات سب انسانوں کو ان کا رزق ان کے گھروں میں عطا فرما تو سب کا رب ہے ان گوروں کا بھی جن کے کاشانوں پر تیری رحمتیں ہیں اور ان کالوں کا بھی جن کے آشیانوں پر مسلسل برق گر رہی ہے۔ اے خدا تو رحم کرنے والا ہے تو اپنے بندوں پر رحم فرما اور پھر میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا کار کے پاس گیا جہاں دوست میرے منتظر تھے۔

اختر ضیائی کا "میلہ"۔

قبرستان اور مشاعرہ گاہ میں اتنا ہی فاصلہ تھا جتنا زندگی اور موت کے درمیان ہوتا ہے۔ جہاں سے ہم آئے تھے وہاں موت کا سناٹا تھا اور جہاں ہم پہنچنے والے تھے وہاں زندگی کی رونقیں تھیں۔ پاکستانی خواتین و حضرات مشاعرہ گاہ کی طرف رواں دواں تھے۔ یوں لگتا تھا کچھ پیاسے ہیں جن کا رخ دریا کی طرف ہے۔ ہال سامعین سے بھر چکا تھا۔ امجد اسلام امجد اپنے دوستوں کے ساتھ پہلے سے وہاں موجود تھا۔ مجھے مکرم شاہ پر ترس آ رہا تھا۔

بے چارہ شریف آدمی ہے مگر امجد کی وجہ سے اسے ہر مشاعرے میں جانا پڑ رہا ہے۔ اختر ضیائی کے اس مشاعرے میں بریڈ فورڈ سے جاوید اقبال ستار، انصر جاوید اور عبدالطیف بھی یہاں پہنچے ہوئے تھے۔ اختر ضیائی انتظام میں کچھ اس طرح مصروف تھے جیسے کسی بارات کا انتظام کر رہے ہیں۔ بالآخر وہ اسٹیج پر آئے اور مشاعرے کے آغاز کااعلان کیا۔ صدارت ڈاکر ضیاء الدین شکیب کے سپرد تھی اور اسٹیج سیکریٹری سلطان فاروقی تھے۔

میرے خیال میں اختر ضیائی کے یہ دونوں انتخاب خوب تھے۔ ڈاکر شکیب کی رسائی کاسیکی اور جدید ادب تک ہے اور ان کی اپروچ سائنٹیفک بھی ہے۔ سلطان فاروقی نہایت نفیس شخصیت کے حامل ہیں اور شعر و ادب کا گہرا ذوق رکھنے والی شخصیت ہیں۔ چنانچہ مشاعر بڑے توازن کے ساتھ جاری رہا۔ سلطان فاروقی صاحب نے مقامی شعراء سے اپیل کی کہ وہ تین شعروں سے زیادہ نہ سنائیں اور ان کی اس اپیل پر کان دھرنے والون میں اعجاز احمد اعجاز اور ارشد لطیف بھی شامل تھے جبکہ کچھ دوست یہاں دو غزلے اور سہ غزلے سنانے پر بضد رہے جس پر صدر محفل ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب خاصے ناراض نظر آتے تھے۔

بلکہ ایک آدھ دفعہ تو مجھے خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر کسی شاعر کو ایک آدھ ہاتھ جھاڑ نہ دیں۔ ویسے اگر آپ میری رائے پوچھیں تو مقامی شعراء پر شعروں کی پابندی عائد کرنا کچھ زیادہ مناسب نہیں کیونکہ ایک تو ان کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ باہر سے آئے ہوئے شعراء کو اپنی شاعری سے متعارف کرائیں اور دوسری طف خود مہمان بھی یہ چاہ رہے ہوتے ہیں کہ وہ بیرون ملک شعری رویوں کے بارے میں زیادہ جان سکیں۔

بہر حال اس محفل میں جن شعراء نئے اپنا کلام سنایا، ان میں ہم مہمان شعراء کے علاوہ محترمہ سیما جبار، محترمہ نورین طلعت، محترمہ سیمیں برلاس، محترمہ حمیدہ معین رضوی، محبوب سیالکوتی، ڈاکٹر خوش دل شرما موہانی، ڈاکٹر محمود دیوان، انجم شہزاد، شوکت مرزا، نوید ممتاز، اعجاز احمد اعجاز، سرور راجا، ارشد لطیف،

محمد شریف، بقاء یشب تمنا، احمد منیر، اکبر حید ر آبادی، مرزا عابد نامی،عاشور کاظمی اور سلطان فاروقی شامل تھے۔

اکبر حیدر آبادی، برطانیہ کے استاد شعراء میں سے ہیں۔ محمد شریف بقا بنیادی طور پر ماہر اقبال ہیں لیکن خوبصورت شعر بھی کہتے ہیں۔ اسی طرح حمیدہ معین رضوی افسانہ نگار کے طور پر مشہور ہیں، اس محفل میں ان کی شاعری سے بھی تعارف ہوا۔ سیمیں برلاس سے ابوظہبی کے مشاعروں میں ملاقاتیں رہی ہیں، انہیں لندن میں دیکھ کر حیرت ہوئی مگر پتہ چلا کہ شادی کے بعد وہ برطانیہ منتقل ہو گئی ہیں۔ یشب تمنا اور ارشد لطیف کا شمار نئی نسل کے نمائندہ شعراء میں ہوتا ہے، یہ دونوں دوست حلقہ ارباب ذوق کے کرتا دھرتا ہیں اور یوں شاعری کے رکے ہوئے پانی میں کنکر پھینکتے رہتے ہیں۔ یہاں میری ملاقات جناب ضیاء الدین لاہوری بھی ہوئی۔ ضیاء صاحب ایک درویش آدمی ہیں۔ ، وہ لندن میں اس طرح رہتے ہیں کہ یہ شعراء آ جاتا ہے۔ دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں

باذار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں ان کے بچے پاکستان میں ہیں کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ بچوں کی تربیت مغربی معاشرے میں ہو چنانچہ کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد ضیاء صاحب پاکستان اپنے بچوں کے پاس چلے جاتے ہیں تا کہ ان کی تربیت میں بھی کوئی کمی نہ رہ جائے۔ ضیاء الدین لاہور تحقیق کے آدمی ہیں اور ان کا خصوصی موضوع ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ہے۔

لندن کی تاریخ کے اس یاد گار مشاعرے کے اختتام پر چند بلاک رے ایک عمارت میں عشائیے کا اہتمام تھا۔ یہاں بھی دیر تک احباب سے گپ شپ رہی۔ امجد ایک روز قبل پیرس سے لوٹا تھا اور وہ اپنی داستان غم سنا رہا تھا کہ کیسے وہاں اس کی جیب کٹ گئی اور جیب کترا اس کے سامنے سات سو ڈالر کچھ اس دیدہ دلیری کے ساتھ لے کر بھاگا کہ وہاں کھڑے سینکڑوں لوگ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ امجد پہلی دفعہ پیرس گیا تھا اور جانے سے پہلے اس "جہاں دیدہ" سے اس نے مشورہ بھی نہ کیا ورنہ میں اسے خبردار رہنے کے لئے میر تقی میر کا وہ شعر ضرور سناتا جو اس نے پیرس کے بارے میں کہا تھا۔

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت

اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

اور اب پیرس ہی پر کیا موقوف یورپ اور امریکہ کا کوئی مہذب شہر ایسا نہیں ہے، جہاں شام کے بعد کسی کی عزت جان اور مال محفوظ ہو۔ یہ کیسا نظام ہے جہاں دولت کی ریل پیل ہے مگر راہ گیروں سے ان کے پرس چھین لئے جاتے ہیں اور یہ کیسا نظام ہے جس میں جنس کی فراوانی ہے مگر پستول کی نوک پر عصمتیں لوٹی جاتی ہیں ؟ کبھی غور تو کرو کہ اس نظام میں کیا خرابی ہے اور وہ خرابی کہاں واقع ہے کہیں اس کی بنیادوں میں تو نہیں ؟

غیور احمد فاخر

اگلے روز میں اور حسن رضوی پاکستانی سفارت خانے میں غیور صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ غیور صاحب سے ہماری ملاقات عاشور کاظمی کی معرفت ہوئی تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں جو چند بہترین سفارت کار دیکھے ہیں ان میں سے ایک غیور صاحب بھی ہیں۔ میری ایک "تھیوری" یہ ہے کہ جو افسران فنون لطیفہ سے لگاؤ رکھتے ہیں وہ عوام کے لئے ان افسران سے بہر حال ثابت ہوتے ہیں جن کا فنون لطیفہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جناب غیور فنون لطیفہ سے گہرا شغف رکھتے ہیں بلکہ خود بھی شعر کہتے ہیں۔

بلکہ "فاخر" تخلص بھی فرماتے ہیں چنانچہ مجھے خوشی ہوئی جب مختلف مکاتب فکر کے پاکستانیوں نے میری موجودگی میں ان کے لئے کلمہ خیر کہا کہ اس سے میرے خیال کی تصدیق ہوتی تھی۔

غیور صاحب سے کافی پینے کے بعد میں اور حسن اپنے گھروں کو لوٹے کہ صبح ہم نے بذریعہ کا یورپ کی سیر کے لئے روانہ ہونا تھا۔ اس کے مطابق ہمیں فرانس، بیلجیم، جرمنی اور سویڈن سے ہوتے ہوئے ڈنمارک اور پھر ناروے پہنچنا تھا۔ اعجاز احمد اعجاز کی طبیعت میں افراتفری بہت ہے چنانچہ وہ ہمیں سونے کے لئے کہہ رہا تھا تا کہ ہم صبح جلدی اٹھ سکیں مگر ہم سونے والے کہاں تھے۔ رات بھر طالع بیدار نے سونے نہ دیا

یار نے ہم کو ہمیں یارنے سونے نہ دیا میرے خیال میں یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ میں نے یہاں یہ شعر محفل شعر لکھنے کے شوق سے نقل کیا ہے ورنہ جس یار کو میں نے سونے نہ دیا وہ عزیزم حسن رضوی سلمہ اللہ تعالی تھا۔

یورپ بائی روڈ

فرانس روانگی کے لئے ہم علی الصبح بیدار تو ہو گئے مگر پتہ چلا کہ ہماری یہ سحر خیزی اصل میں برادر عزیز اعجاز احمد اعجاز کی "احتیاط پسندی" کا نتیجہ ہے کیونکہ فرانس کے لئے ہماری فیری رات کے بارہ بجے روانہ ہونی ہے، بحر حال اس اثناء میں اعجاز نے کافی کام کر لئے تھے جن میں سے ایک اہم کام کار اور اس کے سبھی مسافروں کی انشورنس کا بھی تھا۔ یہ انشورنس بہت کمال کی تھی یعنی یورپ

کے تمام سفر کے دوران اگر یہ کار کہیں خراب ہو جائے تو ایک فون پر مکینک جائے واردات پر پہنچے گا۔

اور سے ہماری تسلی کے مطابق ٹھیک کرنے کے بعد ہم سے رخصت ہو گا۔ اگر کار میں کوئی ایسا نقص پیدا ہو جائے کہ اسے ٹھیک ہونے میں دو تین دن درکار ہوں تو انشورنس کمپنی کار کی تمام سواریوں کو اتنے دن اپنے خرچے پر کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرائے گی اور اگر کار کسی حادثے کا شکار ہو جائے تو یہ کمپنی کی ذمہ داری ہو گی کہ وہ اس کا ڈھانچہ واپس لندن پہنچانے کا انتظام کرے اگر ہم زخمی ہیں تو اپنے خرچ پر ہم سب کا علاج کرائے۔ تا ہم سب سے زیادہ "دل خوش کن" بات تو یہ تھی کہ اگر حادثے میں ہم لوگ انتقال کر جائیں تو انشورنس کمپنی ہمارے لواحقین کو اتنی بھاری رقم ادا کرے گی کہ ان کے وارے نیارے ہو جائیں گے مگر ان تمام سہولتوں میں سے ہم لوگ صرف ایک سہولت سے فائدہ اٹھا سکے۔

اور وہ بھی صرف اس قدر کہ جرمنی سے ڈنمارک روانہ ہوتے ہوئے کار راستے میں خراب ہو گئی اس پر اعجاز کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا کہ چلو انشورنس کی کچھ رقم تو واپس آئی چنانچہ اس نے خوشی خوشی کمپنی والوں کا دیا ہوا ایک نمبر ڈائل کیا اور تقریباً دو گھنٹے بعد ایک عالیشان کار میں ایک جرمن مکینک صاحب تشریف لائے اور کار کو اسٹارٹ کر کے ایک فارم پر ہمارے دستخط لئے اور اپنے گھر کی راہ لی۔ حالانکہ ہماری دلی خواہش تھی کہ اس میں کوئی ایسا نقص پیدا ہوا ہو کہ ہم دو تین روز ہیمبرگ کے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام کے مزے لے سکیں مگر ہمارے ایسے نصیب کہاں چنانچہ لوگ لندن سے فرانس، بیلجیم، جرمنی، ہالینڈ، سویڈن، ڈنمارک،ناروے وغیرہ کا چکر کاٹ کر بخیر و عافیت واپس لندن پہنچ گئے۔

اور یوں فوت وغیرہ نہ ہونے کی وجہ سے انشورنش کے لئے ہماری ادا کی ہوئی رقم ڈوب گئی۔ ہمارے ہم سفروں میں ایک صاحب صدیق نامی بھی تھے جو انشورنسس ایکسپرٹ ہیں، ان کا ذریعہ روزگار ہی انشورنس کرانا ہے، اپنی کار کی انشورنس، اپنی انشورنس، اپنے بریف کیس کی انشورنس اور اس کے علاوہ ہر اس چیز کی انشورنس جو کوئی نہ کراتا ہو اور خدا کے فضل سے آج تک ان کی کوئی انشورنس ضائع نہیں گئی بلکہ ان کی وجہ سے کئی انشورنس کمپنیاں ضائع ہو چکی ہیں، انہوں نے ہمیں اس ضمن میں خاصے ماہرانہ مشورے دیئے مگر افسوس ہم لوگ اپنی بزدلی کی وجہ سے انشورنس کے تمام فوائد سے محروم رہے۔

جو کام بھگت جائے اچھا ہے

پروگرام کے مطابق ہمیں پانچ بجے ڈوور کی بندرگاہ کے لئے روانہ ہونا تھا جو لندن سے ای میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ زیادہ زیادہ دو گھنٹے کا راستہ ہے اور یوں ہمیں

سات بجے ڈوور ہونا چاہئے۔ میں اعجاز سے پوچھتا ہوں کہ ہم پانچ گھنٹے پہلے پہنچ کر کیا کریں گے مگر وہ "انجمن احتیاط پسند مصنفین" کا رکن ہے، اس کا کہنا ہے کہ وقت سے پہلے پہنچنا بہتر ہوتا ہے اس پر مجھے والد ماجد یاد آ گئے۔ ان کی طبیعت میں بھی جلدی بازی بہت تھی۔ والدہ مرحومہ بتاتی ہیں کہ ایک دفعہ بچپن میں، میں سخت بیمار ہو گیا حتی کہ ڈاکٹروں نے اعلان کر دیا کہ بچہ چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔ یہ سن کر ابا غسال کو بلا لائے تا کہ جو کام بھگت جائے وہی اچھا ہے۔

ڈوور کے لئے روانگی

ٹھیک پانچ بجے شام ہم لوگ ڈوور کے لئے روانہ ہو جاتے ہیں۔ نشستوں اور ان کے مسافروں کی ترتیب کچھ یوں ہے کہ اعجاز اپنی اسٹیشن ویگن کے اسٹیرنگ پر ہے اس نے سرخ رنگ کی بی کپ سر پر اوڑھ لی ہے۔ اس کے برابر میں اس کاایک عزیز صدیق نامی ہے جو کافی حد تک فارغ البال ہے اور اس نے موٹے شیشوں کی عینک چڑھائی ہوئی ہے، اس کا کام یورپ کے سفر کے دوران میپ ریڈنگ اور اس کے مطابق اعجاز کی رہنمائی کرنا ہے۔ پچھلی سیٹ پر دائیں ہاتھ کی کھڑکی کی طرف اطہر راز براجمان ہو گیا ہے۔

ہمارے اس لم سلمے اور لحیم شحیم شاعر دوست کا سر کار کی چھت سے ٹکرا رہا ہے گھنٹے ڈرائیور کی سیٹ میں دھنسے ہوئے ہیں اور کولہے توسیع پسندی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ حضرت بخش لائل پوری ہیں اور ان کے برابر میں بائیں ہاتھ والی کھڑکی کی طرف میں ہوں۔ اس سے پچھلی سیٹ قدرے اونچی ہے اور اسپر طرح سیدھا بیٹھنا ممکن نہیں، مگر وہ لمبائی میں زیادہ ہے چنانچہ حسن رضوی اور ابرار ترمذی اس پر استراحت فرمانے کے انداز میں بیٹھے یا لیٹے ہوئے ہیں یہ دونوں سید بادشاہ یورپ کے تمام سفر کے دوران ہمیں یہ تاثر دیتے رہے کہ ان کا سفر بہت تکلیف سے کٹ رہا ہے مگر واپس لندن پہنچنے کے بعد انہوں نے بتایا کہ پوری کار میں سب سے آرام وہ نشست انہی کی تھی۔

اور اگر یہ بات وہ دوران سفر بتا دیتے تو انہیں اس نشست پر قبضہ غاصبانہ کا خطرہ تھا۔ ان کے پیچھے کھلی ڈکی تھی جس میں سلیپنگ بیگ، کھانے پینے کی چیزیں، اور پتہ نہیں کیا الم غلم بھرا ہوا تھا، کار کی چھت پر کیرئیر بھی تھا اور اعجاز نے ہمارے بیگ وغیرہ بڑی سختی سے وہاں باندھے ہوئے تھے۔ کار میں یورپ کا یہ میرا پہلا سفر تھا بلکہ صدیق کے علاوہ سبھی دوست یہ ایڈونچر پہلی بار کر رہے تھے۔

میرے اور حسن رضوی کے پاس پاکستانی پاسپورٹ تھے جبکہ باقی دوست برٹش پاسپورٹ ہولڈرز تھے مگر مختلف ملکوں کے بارڈر کراس کرتے ہوئے اندازہ ہوا کہ یورپ میں اصل پاسپورٹ آپ کی نسل اور آپ کا رنگ ہے اور یوں پاسپورٹ کا رنگ

کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ گوروں کی بسون کی بسیں،امگریشن کے عملے "ویو" کرتی گزر جاتی تھیں اور ہمیں تقریباً ہر بارڈر پر روک لیا جاتا تھا۔

بس اتنا تھا کہ برٹش پاسپورٹ کو وہ سرسری انداز میں دیکھتے تھے کہ اس میں ویزے وغیرہ کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا اور پاکستانی پاسپورٹ کا معائنہ خوردبین سے کرتے تھے تاہم مہر لگانے کی زحمت بہر حال وہ کسی بھی پاسپورٹ کے ضمن میں نہیں اٹھاتے تھے۔

سوشلزم کا فرائی پین کیپٹلزم کا چولہا

لندن سے ڈوور کی طرف روانہ ہوتے ہی بخش لائل پوری کی شامت آ گئی۔ حسن نے ہمارے بزرگ کو ایک ایسی بحث میں الجھا لیا جس کا سرا کسی کے بھی ہاتھ میں نہیں تھا چنانچہ ترقی پسندی سے لے کر انجمن ترقی پسند مصنفین برطانیہ تک کے بیشتر معاملات پر گرم گرم گفتگو ہوئی۔ میرے خیال میں ترقی پسندی کے بارے میں بخش کا نقطہ نظر ترقی پسندی کے اصولوں کے عین مطابق تھا مگر ہمارے ہاں کے ترقی پسند خوف فساد خلق کی وجہ سے اس ضمن میں تقیہ سے کام لیتے ہیں تا ہم ان کے دل کا معاملہ بہر حال کھل جاتا ہے جس کی وجہ سے پاکستان کے مسلم عوام ان سے بدک جاتے ہیں۔

اور یوں تمام تر معاشی بد حالی، انار کی اور ایک بد ترین استحصالی نظام کے شکنجے میں کسے ہوئے عوام اپنے دین اور روحانی قدروں کی قربانی کے عوض سرخ جنت قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں اور اب تو خود سرخ جنت کے مکینوں نے بھی اس جنت سے بغاوت کر دی ہے۔ اگرچہ اس ضمن میں میرا نقطہ نظریہ ہے کہ یہ لوگ سوشلزم کے فرائی پین سے نکل کر کیپٹلزم کے چولہے میں گرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ویسے یہ دونوں نظام پوری نیک نیتی سے انسان کی بہتری کے لئے وضع کئے گئے تھے مگر ایک نے انسانی جسموں کو خرکار کیمپوں کے سپرد کر دیا اور دوسرے نے جسموں کی اتنی پرورش کی کہ ان کی روحوں پر بے انت خواہشوں کی چربی چڑھ گئی یہ دونوں نظام زوال پزیر ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کی جگہ کون سا نظام لیتا ہے۔ دنیا بھر کے ستائے ہوئے لوگ اس تیسرے نظام کی راہ دیکھ رہے ہیں جو کتابوں سے نکل کر عملی صورت میں کہیں نافذ ہو اور اس کی افادیت سامنے آئے۔

یورپ بائی روڈ

فیری تھی کہ کاؤنٹی تھی

اور یوروپی فیری کیا تھی ایک نہایت خوبصورت چھوٹی سی کاؤنٹی تھی جس میں ریستوران تھے، بار تھے، کاسمیٹکس کی دکانیں تھیں، مختلف چیزوں کے اسٹورز تھے اور ہنستے مسکراتے خوبصورت چہرے تھے۔

اعجاز اس بات پر بہت خوش ہے کہ ہمیں گیارہ بجے والی فیری میں جگہ مل گئی ہے اور اس سے وہ نتیجہ یہ اخذ کرتا ہے کہ ہمیں علی الصبح بیدار کر کے اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا تھا۔ فیری کی روانگی کی اناؤنسمنٹ ہو گئی ہے۔ فرانس کی بندرگاہ کے لئے یہاں سے صرف ایک گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔ ہم یہ سفر انگلش چینل میں طے کریں گے اور رات کو بارہ بجے کے لئے پہنچیں گے جہاں فرانس کے وقت کے مطابق ایک بجا ہو گا۔ کیلے سے پیرس دو سو کلو میٹر ہے اور ہماری کار یہ فاصلہ تقریباً تین گھنٹوں میں طے کرے گی۔ گویا ہم صبح چار بجے پیرس میں ہوں گے۔

فیری اب فرانس کی طرف رواں ہے۔ ڈوور کی بتیاں دور ہوتی جار رہی ہیں۔ ہم جہاز کے آخری سرے پر اس کے کھلے حصے میں جا کھڑے ہوتے ہیں۔ جہاں سے دور منزلوں کو جانے والے جہاز سمندو میں رینگتے محسوس ہو رہے ہیں۔ سمندر کی تیز ہوا سرد ہوتی چلی جا رہی ہے۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد ہم اندر ریستوران میں آن بیٹھے ہیں۔ یہاں میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ گزرتا ہے کہ سب کو میری جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ جان بچی سو لاکھوں پائے مسلسل کئی دن کی بے آرامی کی سجہ سے میری پنڈلیوں میں خاصا درد سا ہونے لگا ہے۔ چنانچہ میں کافی پینے سے پہلے اسپرین کی دو گولیاں کھانا چاہتا ہوں۔ اسپرین کی یہ گولیاں سائز میں ہمارے پرانے ایک روپے کے سکے کے برابر ہیں میں یہ دونوں گولیاں اس خیال سے بیک وقت منہ میں ڈال لیتا ہون کہ یہ پانی می حل ہو جانے والی ہیں چنانچہ ایک گھونٹ پانی پیتے ہی کہ پگھل جائیں گی اور یوں ان کے حلق میں پھنسنے کا خطرہ نہیں ہو گا، ہوتا یوں ہے کہ پانی کا ایک گھونٹ چھوڑ پورا گلاس پینے کے باوجود ان میں سے ایک گولی حلق میں پھنس گئی ہے۔ اور وہ نیچے اترنے کا نام نہیں لے رہی۔ مجھ پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے مگر مجھ سے زیادہ گھبراہٹ حسن پر طاری ہے۔

وہ میرے پیچھے کھڑے ہو رک میری گردن پر مکے مارتا ہے مگر جب گولی حلق سے نہیں اترتی تو وہ مزید پریشان ہو جاتا ہے اور مجھے مزید پانی پینے کے لئے کہتا ہے مگر یہ عجیب گولی ہے کہ پانی اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔

میرے لئے تو یہ گولی تھری ناٹ تھری کی گولی ثابت ہو رہی ہے کہ اب میرا سانس بھی رکنے لگا ہے میں دعا مانگتا ہوں کہ میرا جو انجام بھی ہونا ہے وہ خشکی پر ہو کیونکہ میں نے سن رکھا ہے کہ بحری جہاز میں فوت ہونے والے مسافر کی میت سمندر میں پھینک دی جاتی ہے تا کہ وہ مچھلیوں کے لئے لنچ یا ڈنر کے کام آ سکے۔ ہماری پنجابی فلموں میں ولن نما ہیرو عموماً اپنے مخالف کو یہی دھمکی دیتے ہیں کہ تیری لاش نوں مچھلیاں ای کھان گیاں۔ اس وقت یہ ڈائیلاگ میرے حوصلے مزید پست کر رہا۔ اب تو بخش، اعجاز، اطہر، ابرار اور صدیقی بھی پریشان ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ میں با آواز کلمہ شہادت کا ورد کرنے کی کوشش کر تا ہوں مگر گلے میں اسپرین پھنسی ہوئی ہے

کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

چنانچہ دل میں کلمہ پڑھنے کے بعد گردن پیچھے کی طرف لڑھکا دیتا ہوں اور بزرگ برادرم عزرائیل کی آمد کا انتظار کرنے لگتا ہوں مگر ہوتا یوں ہے کہ گردن پیچھے لڑھکانے سے اسپرین اچانک حلق سے نیچے اتر جاتی ہے۔ اس دوران میرے علاوہ حسن کے بھی ہاتھ پاؤ ٹھنڈے اور چہرہ پیلا پڑ چکا ہے اسپرین کے حلق سے اترتے ہی میرے سمیت سب کے چہرے کھل اٹھتے ہیں اور وہ سب تالیاں بجا کر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت اس سفر میں جو دوست پرانی وضع داریاں برقرار رکھنے پر بضد ہیں، ان میں سے ایک اطہر راز بھی ہیں چنانچہ وہ عنایت خسروانہ سے کام لیتے ہیں۔ چار کافیوں کا بل اپنی جیب خاص سے ادا کرتے ہیں اور پھر تمام سفر کے دوران اس فیاضی کا وہ گاہے گاہے مظاہرہ کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ موصوف سفر کے اختتام سے پہلے ہی مقروض ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ سفر میں خلوص کا اتنا قحط ہو جاتا ہے۔ کہ یاراں فراموش کردند عشق کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

ریستوران سے نکل کر اب ہم فیری کا ایک چکر لگاتے ہیں۔ سکولوں کے لڑکے اور لڑکیاں سیاحت کے لئے فرانس جا رہے ہیں اور ان کے چہروں پر وہ ایکسائٹمنٹ ہے جو عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتی چلی جاتی ہے اور پھر ایک وقت آتا ہے کوئی بڑی سے بڑی خوشی بھی جذبات میں بس ایک ہلکا سا ارتعاش پیدا کرتی ہے اور یہ سرد مہری موت کی علامت ہے میرے اپنے لوگ ایک جگہ آٹھ دس پاکستانی نظر آتے ہیں۔ یہ سب شرعی وضع قطع کے حامل لوگ ہیں، انہوں نے ایک بڑا سا میپ اپنے سامنے پھیلا یا ہوا ہے اور پنسل سے اس کے مختلف حصوں پر نشانات لگا رہے ہیں۔

میں جب اس وضع قطع کے لوگوں کو دیکھتا ہوں تو میرا دل ان کے لئے بے پناہ اپنائیت محسوس کرتا ہے کہ ان کی شکلیں میرے آباء و اجداد سے ملتی ہیں چنانچہ میں انہیں سلام کر کے ان کے پاس بیٹھتا ہوں

آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں ؟

روس جانے کا ارادہ ہے۔

روس ؟وہاں کس سلسلے میں جا رہے ہیں۔

بس اپنے بھائیوں سے ملیں گے۔

کیا وہاں آپ کے کوئی عزیز ہیں ؟

دنیا کے سب انسان آدم کی اولاد ہیں اور یوں وہ سب ایک دوسرے کے عزیز ہیں اور پھر وہاں تو ہمارے دیتی بھائی بھی ہیں

آپ کا تعلق شاید تبلیغی جماعت سے ہے اور آپ غالباً روس تبلیغ کے لئے جا رہے ہیں مگر روس میں مذہب پر عمل پیرا ہونے کی تو اجازت ہے لیکن کسی مذہب کی تبلیغ کی اجازت نہیں ہے۔

ہم لوگ تبلیغ کے اہل نہیں ہیں ہمیں تو صرف اپنی اصلاح کرنا ہے۔

تو پھر آپ روس جا کر کیا کریں گے ؟

کچھ نہیں وہاں صرف مسجدوں میں نماز ادا کریں گے۔

جس سے ہمارے مسلمان روسی بھائیوں کو یہ احساس ہو گا کہ وہ پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ایک سویع مسلم برادری کے رکن ہیں۔ اس کے علاوہ نماز کے اوقات میں ہم اگر سفر میں ہیں تو پبلک مقامات پر بھی نماز ادا کریں گے۔ جسے آپ تبلیغ کہتے ہیں وہ اپنے عمل ہی سے ہو سکتی ہے باتوں سے نہیں۔ اپنے عنفوان شباب میں بھی تبلیغی جماعت سے منسلک رہا ہوں چنانچہ رائے ونڈ سے مختلف علاقوں کو جانے والی جماعتوں کے ساتھ میں بھی کاندھے پر بستر اٹھائے ایک قصبے تک جاتا رہا ہوں واقعی؟ ان کے چہرے پر خوشی سے کھل اٹھتے ہیں۔ کیا کلمہ بدل گیا ہے ؟ ہاں مگر ایک دفعہ ایک بہت دلچسپ صورت حال پیدا ہوئی میرا دوست عارف مرحوم---

بھائی عارف سلطان فونڈری والے ؟

ہاں ہاں وہی آپ انہیں جانتے ہیں ؟ بھائی عارف نے تو اللہ کے رستے میں جان دی ہے وہ جماعت کے ساتھ لندن سے پیدل حج کو جوتے ہوئے یوگو سلاویہ کے قریب حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے تھے۔ جماعت کے بزرگ تو ان کے لئے بہت دعائیں کرتے ہیں۔

ہاں وہی عارف عارف میرا جان و جگر تھا اور جماعت میرا تعلق بھی اس کی پر تاثیر باتوں کے حوالے سے تھا تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ ایک دن ہم لوگ ایک قصبے میں گئے۔ اس روز عارف متکلم کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس نے رستے میں گاؤں کے ایک شخص کو روکا اور اس سے دین کی باتیں کرنے کے بعد کہا بھائی کلمہ سنا دو۔ اس پر اس دیہاتی نے ہڑ بڑا کر کہا کیوں کلمہ بدل گیا ہے۔

شاید اس واقع کے بعد ہی جماعت کے دوستوں نے کلمہ سننے کا سلسلہ بند کر دیا۔ ان دوستوں نے ہنستے ہوئے کہا تاہم اس سے ہمارا مقصود کسی مسلمان کے مسلمان ہونے پر شک کا اظہار نہیں بلکہ دوسروں کے حوالے سے صرف اپنے کلمے کی اصلاح تھا۔ ویسے اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات بتائیں۔

فرمائیے

آپ جماعت سے اگر کیوں ہوئے ؟

کوئی خاص وجہ نہیں میں نے ہنستے ہوئے کہا روئے ونڈ کے لنگر میں ٹینڈوں کے علاوہ کچھ نہیں ملتا تھا اور اس کے لئے بھی شوربے میں غوطہ لگانا پڑتا تھا تب کہیں ایک آدھ ٹنڈا اس میں سے بر آمد ہوتا تھا۔ اس پر تبلیغی دوستوں کے چہروں پر مسکراہٹ ابھری اور وہ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر شاعر خوش کلام اعجاز احمد اعجاز مجھے ڈھونڈتا ڈھونڈتا اس طرح آ نکلا اور پھر میں ان دوستوں کو خدا حافظ کہہ کر فیری کی ڈیلوری فری شاپس کا جائزہ لینے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ انگلش چینل یا مسی پسی ریور ان ڈیوٹی فری شاپس میں زیادہ رش ام الخبائث اور سگریٹوں کے شعبے میں تھا۔ میں نے پرفیومز کے شعبے کی طرف رجوع کیا۔ اپنی پسندیدہ خوشبوؤں کی قیمتیں دریافت کیں۔ ان کا موازنہ بازار کی قیمتوں سے کیا تو اندازہ ہوا کہ کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ ویسے بھی ہم فرانس جا رہے تھے جہاں دنیا کی بہترین خوشبوئیں تیار ہوتی ہیں اور نسبتاً کم قیمت پر ملتی ہیں۔ ونڈو شاپنگ کے بعد اعجاز اور میں عرشے کی طرف چلے گئے۔ آسمان پر چودھویں کا چاند تھا اور جہاز انگلش چینل کا سینہ چیرتا ہوا ہولے ہولے آگے بڑھ رہا تھا۔

ان لمحوں میں ایک یاد نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ یاد مجھے ۱۹۷۰ء میں لے گئی۔ میں امریکہ میں مسی پسی ریور کے کنارے پر واقع شہر سینٹ لوئیس میں رہتا تھا۔ مسی پسی ریور میں چودھویں کا چاند چمک رہا تھا اور ایک جہاز سینکڑوں ہشاش بشاش چہروں کو دریا کی سیر کرا رہا تھا۔ بیسیوں جوڑے ڈائنسگ فلور پر رقص کرنے اور ڈائننگ ہال میں کھانا کھانے کے بعد اب عرشے کی ریلنگ پر جھکے ہوئے تھے۔

ایک چاند آسمان پر تھا اور کتنے ہی چاند اس عرشے پر جمع تھے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو بھول جاتے ہیں ؟ خوشگوار لمحے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوتے بلکہ ذہن کے کسی گوشے میں سنور جاتے ہیں اور پھر اداس لمحو ں کو خوشگوار بناتے ہیں۔ کیا یہ خوشگوار لمحے زندگی میں صرف ایک شخص سے وابستہ ہوتے ہیں ؟ ہاں ایسا بھی ہوتا ہے لیکن اگر ایسا نہ بھی ہو تو سچے جذبوں کا حامل ہر لمحہ جاوداں ہوتا ہے۔ میرے لئے تمہیں سمجھنا بہت مشکل ہے۔

خود میرے لئے بھی بہت مشکل ہے کیونکہ میں ایک لمبے سفر پر ہوں صرف منزل پر پہنچ کر قیام کروں گا مگر رستے مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ میرے کانوں نے یہ مکالمہ عرشے کی ریلنگ پر جھکے دریا میں چودھویں کے چاند کے عکس پر نظریں جمائے سنا تھا۔ اور اس وقت میں بیس برس بعد انگلش چینل میں جہاز کے عرشے پر کھڑے آسمانوں پر چمکتے ہوئے چودھویں کے چاند کی کرنیں اپنے وجود میں سمیٹتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کیا میں ابھی تک لمبے سفر پر ہوں اور کیا ابھی وہ منزل نہیں آئی جہاں مجھے قیام کرنا ہے ؟

اعجاز احمد اعجاز نے مجھے میرے خیالوں سے چونکاتے ہوئے سامنے روشنیوں کی طرف اشارہ کیا ہم فرانس پہنچ گئے ہیں۔ جہاز لنگر انداز ہونے والا ہے جلدی نیچے چلو۔ مگر نیچے اپنی کار کی طرف جانے سے پہلے ابرار، اطہر راز، حسن، بخش اور صدیق کو تلاش کرنے کا مرحلہ ابھی باقی تھا جو جہاز کی وسعتوں میں نہ جانے کہاں گم ہو گئے تھے۔ ان سب کو تلاش کرنے کے بعد ہم جلدی جلدی سیڑھیاں اترتے ہوئے نچلی منزل پر آ گئے مگر یہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ یہاں بھی اعجاز کی پھرتیاں اپنا کام دکھا گئی ہیں۔

کیونکہ جہاز لنگر انداز ہونے میں ابھی کم از کم آدھا گھنٹہ باقی ہے چنانچہ ہم لوگ دوبارہ اوپر کی منزل پر آ گئے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد فرانس کی بندر گاہ کیلے کی آمد کا اعلان ہوا اور ہم لپک کر نیچے پارکنگ لاٹ میں آ گئے جہاں ہم نے کار پارک ہوئی تھی۔ مگر اناؤنسمنٹ کے باوجود مزید پندرہ منٹ ہمیں کار میں ہی بیٹھنا پڑا اور پھر خدا خدا کر کے جہاز لنگر انداز ہوا تو کاروں ٹرکوں اور ٹریلروں کا ایک ریلا جہاز سے نکل کر باہر خشکی پر آگیا۔

اور اب ہم فرانس کی سر زمین پر تھے۔ آزادی اور حریت فکر کی سر زمین۔ سارتر اور ڈیگال کی سر زمین، اس وقت ہماری گھڑیوں پر رات کے سوا بارہ بج رہے تھے۔ جبکہ فرانس میں رات کا سوا بجا تھا۔ بندرگاہ کے علاقے سے نکل کر اعجاز احمد اعجاز نقشے کو اپنے سامنے پھیلا دیتا ہے اور صدیق کی مدد سے راستے کا تعین کرنے کے بعد ہم پیرس کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ بندرگاہ سے نکلتے نکلتے رات کو پونے دو بج گئے ہیں۔ باہر موسم قدرے گرم ہے۔ چنانچہ ہوا کے لئے کار کی کھڑکیاں کھلی ہیں۔ کیا یہ کھڑکی بند نہیں کر سکے ؟

کیوں؟

مجھے سردی لگ رہی ہے۔

تمہارا دماغ صحیح ہے اچھی خاصی گرمی ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ سردی لگ رہی ہے دراصل تمہیں سردی نہیں لگ رہی تم صرف سرد مہری کا شکار ہو۔ میرا خیال ہے تم دونوں اصل میں تھک گئے ہو۔ لہذا کچھ دیر آنکھیں بند کر کے سیٹ کے ساتھ ٹیک لگا کر سو جاؤ اس کے بعد نہ تمہیں نہ سردی لگے گی نہ تمہیں گرمی محسوس ہو گی۔

کیپ رائٹ کپ لیفٹ

اب ہم کیلے شہر سے گزر رہے ہیں۔ چودھویں کا چاند ہمارے ساتھ سفر میں ہے۔ اس کے دودھیا روشنی میں یہ قدیم طرز کا شہر بہت طلسماتی سا لگ رہا ہے۔ گلیاں کے بر عکس فرانس میں ٹریفک دائیں ہاتھ چلتا ہے چنانچہ ابرار ترمذی تھوڑی تھوڑی دیر بعد اعجاز احمد اعجاز کو یاد دہانی کے لئے کیپ رات کی آواز لگاتا ہے جب کہ پاکستان میں اس کے بر عکس کیپ لیفٹ کی تلقین کی جاتی ہے جو عموماً پولیس والے کرتے ہیں۔

ہماری کار تیزی سے پیرس کی طرف بھاگ رہی ہے جو یہاں سے دو سو کلو میٹر ہے اور اندازہ یہ ہے کہ ہم صبح کے چار بجے پیرس پہنچ جائیں گے مگر ہمارا یہ اندازہ خاصا غلط ثابت ہوتا ہے کیونکہ نیند کی وجہ سے ہمیں رستے میں کئی جگہ رکنا پرتا ہے۔ یہاں کی بائی وے مجھے لندن سے بہتر لگ رہی ہے۔ ہلکی ہلکی چاندنی میں ارد گرد کے مناظر واضح نہیں ہیں لیکن لگتا ہے کہ ہم میدانی علاقے سے گزر رہے ہیں اور ہمارے دونوں طرف درختوں کے گہرے جھنڈ ہیں۔ بخش لائل پوری آواز بلند لحن کے ساتھ درود شریف پڑھ رہے ہیں صلی علی محمد یہ مبارک آوازیں بحر حال تمام عمر ایک مسلمان کا پیچھا کرتی رہتی ہیں۔ میں نے ایک دفعہ جماعت اسلامی کے حوالے سے لکھا تھا کہ انسان اگر جماعت اسلامی سے نکل بھی جائے، جماعت اسلامی اس میں سے نہیں نکلتی۔ یہی حال مذہب کا بھی ہے۔ شاید اس کئے کہ مذہب کو لوگوں کی نہیں لوگوں کو مذہب کی ضرورت ہے۔

لندن سے روانگی کے بعد صدیق اب تک خاموش ہے۔ چہرے پر موٹے شیشوں کی عینک کی وجہ سے وہ ایک بہت با وقار سکالر کا تاثر دیتا ہے مگر سفر بڑی ظالم چیز ہے۔ یہ انسان کو بولنے پر مجبور کر دیتی ہے چنانچہ صدیق اپنی گفتگو کا آغاز ہی مختلف ملکوں کی نائٹ لائف کے بیان سے کرتا ہے اور ایسے ایسے انکشاف کرتا ہے کہ یار لوگ سن سوں کرنے لگتے ہیں۔ اسے بڑی مشکل سے اس نوع کی حکایات بیان کرنے سے روکا جاتا ہے کہ یہ پردیسیوں کے لئے مضر صحت ثابت ہو سکتی ہیں۔ پچھلی سیٹ سے کچر کچر کی مدھم سی آواز سنائی دیتی ہے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو ابرار ترمذی فلموں کے ظالم بادشاہوں کی طرح ایک سیب ہاتھ میں

تھامے اسے چک مار رہا ہے اور اپنے پاؤں میں رکھے ہوئے خوراک کے خفیہ تھیلے میں سے ایک سیب نکال کر اپنے ہم نشست حسن رضوی کو پیش کر رہا ہے۔ کیلے کے بعد سفر کے دوران فرانس کا پہلا شہر سینٹ عمر آیا تھا جسے گزرے کافی دیر ہو گئی ہے۔ سینٹ عمر؟ میں اس نام پہ چونکتا ہوں مگر کوئی دوست اس نام کے پس منظر سے پوری طرح واقف نہیں۔

پیرس اوہ پیرس

اس وقت صبح کے تین بج رہے ہیں۔ اعجاز احمد اعجاز گاڑی ہائی وے سے اتار کر ایک پارک کے قریب پارک کر دیتا ہے۔ جہاں ٹائلس وغیرہ بھی بنے ہیں۔ ہم ٹانگیں سیدھی کرنے کے کار میں سے باہر قدم رکھتے ہیں اور میدان خالی پا کر اونچی اونچی آواز میں گپیں ہانکنے لگتے ہیں اور اپنی تھکاوٹ دور کرنے کے لئے قہقہے لگاتے ہیں۔ اچانک رات کے آخری پہر میں نیند میں ڈوبی ہوئی ایک نسوانی آواز ہمارے کانوں کو سنائی دیتی ہے۔

آپ براہ کرم شور نہ کریں

ہم گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتے ہیں مگر کوئی خاتون نظر نہیں آتی، صرف ایک سرخ رنگ کا ڈبل ڈیکر ٹریلر ایک سائیڈ پر کھڑا نظر آتا ہے۔ ہم دوبارہ باتوں میں مشغول ہو جاتے ہیں ایک دفعہ پھر یہ آواز کانوں میں پڑتی ہے۔

کیا آپ لوگ براہ کرم خاموشی اختیار نہیں کریں گے۔

اس دفعہ اس آواز کا سراغ مل جاتا ہے۔ ٹریلر کے ڈرائیونگ کیبن کے اوپر ایک اور کیبن بنا ہوا ہے جو اس ٹریلر کا بیڈ روم ہے۔ دوسری منزل پر موجود بیڈ روم میں استراحت فرماتی ہوئی ایک خاتون اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر ہم سے مخاطب ہے۔ چنانچہ ہم صرف خاموش نہیں ہوتے بلکہ خاموشی سے کار میں بیٹھتے ہیں اور ایک بار پھر پیرس کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ پیرس کی صبح صبح کے چار بجے کے قریب ہم ایک بار پھر ایک سروس پر رکتے ہیں اور کافی پیتے ہیں۔ چار کپ کافی کی قیمت ۳۵فرانک ہے جو تقریباً ساڑھے تین پاؤنڈ بنتی ہے۔ یہ قیمت لندن سے دوگنی ہے۔ اب پیرس یہاں سے صرف ایک سو کلو میٹر کے فاصلے پر رہ گیا ہے۔ صبح کی سپیدی نمودار ہو وہی ہے اور اب مناظر آہستہ آہستہ واضح ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ ساری رات کے سفر کے بعد صبح کے ساڑھے پانچ بجے جب آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگتی ہیں تو اعجاز ہائی وے سے اتر کر اپنی کار ایک پکنک اسپاٹ پر روک دیتا ہے۔ جہاز کے اور بھی بہت سے لوگ کاروں ٹرکوں ٹریلروں میں سستا رہے ہیں۔ یہ پیرس کی پہلی صبح ہے جو میں فراموش نہیں کر سکتا۔ یہ ہرے بھرے درختوں اور پودوں سے لدا ہوا ایک باغ ہے۔ پرندوں کی چہکار میں ایک تقدس ہے اور یوں یہ صبح ایک روحانی تجربے کی طرح مجھ پر وارد ہوتی ہے۔ بائی وے قریب ہنے کی وجہ سے گاڑیوں کا شور سنائی دے رہا ہے مگر صبح کی خوبصورتی اس شور پر غالب ہے۔ اعجاز ابرار اور اطہر کار میں سے سلیپنگ بیگ نکال کر گھاس پر غنودگی کے عالم میں پڑے ہیں۔ حسن اور بخش کار ہی میں لیٹے سستا رہے ہیں جبکہ میں ننگے

پاؤں سیر گلستاں میں مشغول ہوں۔ زولا تم کہاں ہو؟ پیرس اب یہاں سے صرف ۲۵کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ میں سوا چھ بجے اعجاز احمد اعجاز کو گہری نیند سے بیدار کرتا ہوں۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھتا ہے اور اسٹیرنگ پر بیٹھ جاتا ہے۔ ہم پیرس کے بہت قریب پہنچ گئے ہیں۔ اب چار سڑکیں متوازی جا رہی ہیں اور رش میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ جوں جوں پیرس قریب آ رہا ہے میرے دل دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی ہے۔ میں ۱۹ برس بعد اس شہر میں آ رہا ہوں۔ اس شہر میں جس کے ساتھ میری بہت خوبصورت یادیں وابستہ ہیں۔ زولا کے شہر میں عالمی شہرت کی شخصیت زولا نہیں، وہ زولا جسے صرف میں جانتا ہوں۔ کیا وہ آج بھی اسی شہر میں ہے ؟ اگر ہے تو کہاں ہے۔ اب تو ہم شاید ایک دوسرے کو پہچان بھی نہ سکیں۔

ہم سوا سات بجے پیرس پہنچ جاتے ہیں جس کی گلیاں ثابت پتھروں کی بنی ہوئی ہیں۔ ہم ایک گھنٹے تک ہوٹل کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں مگر اکثر سائن بورڈ فرانسیسی زبان میں لکھے ہیں چنانچہ پتہ نہیں چلتا کہ جو عمارتیں نظر آ رہی ہیں ان میں سے ہوٹل کون سا ہے ؟ چنانچہ تھک ہار کر سوا آٹھ بجے کے قریب ہم ایک گلی میں کار پارک کر دیتے ہیں۔ اس کے قریب ایک پل ہے اور پل کے نیچے ریل کی پٹڑیوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم ریلوے اسٹیشن کے قریب کسی علاقے میں ہیں۔ ۱۹ برس پہلے ٹریفک کا جو برا ہال تھا آج ۱۹ برس بعد بھی پیرس میں ٹریفک کی بد نظمی کا وہی حال ہے۔ ایک پولیس والا غلط پارکنگ اور ٹریفک کی خلاف ورزیوں پر دھڑا دھڑ لوگوں کے چالان کر رہا ہے۔

تقریباً گیارہ بجے ہمیں ایک ہوٹل میں کمرہ مل جاتا ہے۔ اس ہوٹل کا نام "ناول" ہے۔ یہ میرا کے علقے میں ہے جو پیرس کے ڈسٹرکٹ ایتھنز میں واقع ہے۔ کمرے کا کرایہ پچیس پاؤنڈ ہے اور کمرہ بھی ابھی تیار نہیں ہے۔ بارہ بجے تیار ہو گا۔ یہ وقت ہم ہوٹل کے لاؤنج میں گزارتے ہیں جہاں منیجر صاحب نے ایک نہایت واہیات فلم لگائی ہوئی ہے۔ مگر موصوف ٹیلیویژن اسکرین کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہے۔ ان کا مقصود غالباً صرف ہم پردیسیوں کا اخلاق خراب کرنا ہے۔ فیصلہ کیا ہے کہ وہ ہوٹل کی بجائے کار ہی کو بطور بیڈ روم استعمال کریں گے کیونکہ پیرس میں اچکے بہت ہیں لہذا ضروری ہے کہ کار اور اس میں پڑے سامان کی حفاظت کے لے یہ تین دوست کار ہی کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنائیں۔ سور کی تھوتھنی والا کلرک میں ابھی سونے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ فون؟ اور پیرس میں ؟ مگر دوسری طرف اطہر راز تھے۔ میں نیچے لابی سے بول رہا ہوں اور اوپر آپ کے کمرے میں آنا چاہتا ہوں / سست بسم اللہ چشم براہ ہوں۔ مگر یہ بد بخت آنے نہیں دیتا۔ کون بد بخت؟ یہ جو سور کی تھوتھنی والا کاؤنٹر کلر ہے۔ مگر اعجاز تو نہا دھو کر اور کافی دیر آرام کر کے یہاں سے گیا ہے۔ اس کو تو کاؤنٹر کلرک نے نہیں روکا۔ اسی وجہ تو اب وہ مجھے نہیں آنے دے رہا۔ آپ کلرک سے بات کریں۔ ۔ کلرک کی انگریزی میری فرانسیسی جتنی تھی چنانچہ ایک دوسرے کے ساتھ اندازے سے جو بات چیت ہوئی۔

وہ کچھ یوں تھی۔

تم میرے دوست کو کمرے میں کیوں نہیں آنے دے رہے ؟

وہ پانی لینے آیا ہے۔

تو اس میں کیا حرج ہے ؟

بہت حرج ہے۔ وہ پہلے تمہارے کمرے میں شیو کرے گا، پھر نہائے گا، پھر آرام کرے گا، پھر پانی جگ میں بھر کر واپس کار میں چلا جائے گا۔ اس کے بعد تمہارے دوسرے دو دوست باری باری یہی حرکت دہرائیں گے۔ ہم نے تم سے دو آدمیوں کے کمرے کا کرایہ لیا ہے پانچ آدمیوں کا نہیں۔ یہ تم بہت زیادتی کر رہے ہو۔ دنیا کے کسی ہوٹل میں مہمانوں کی آمد پر پابندی نہیں ہوتی۔ ہمارے ہاں بھی نہیں ہے، مگر یہ کیس مختلف ہے۔ اگر تم مہمانوں کے اتنے ہی شوقین ہو تو کوئی مہمان کمرے میں بھیجوں ؟ کس قسم کا مہمان۔ تم جس قسم کا پسند کرو، فرانسیسی، انگلش، امریکی، عرب، انڈین؟

لاحول ولا قوہ۔ میرے خیال میں تم محمڈن ہو؟ الحمد اللہ، مگر تم میرے دوست کو کمرے میں آنے دو، یہ نہیں ہو سکتا البتہ ایک فیور کر سکتا ہوں ؟ وہ کیا؟ اسے پانی دے دیتا ہوں۔ میری اور میرے دوستوں کی سات نسلیں تمہارا یہ احسان فراموش نہیں کر سکیں گے۔ گدھے کا بچہ۔ یہ آخری الفاظ میں نے اردو میں ادا کئے تھے بلکہ اس سے کچھ بہتر الفاظ تھے مگر قارئین کی سہولت کے لئے انہیں عام فہم بنا دیا ہے۔

کاؤنٹر کلرک سے گفتگو کے بعد میں نیچے اترا تا کہ کار کے محافظ دوستوں کی خبر گیری کر سکوں۔ اعجاز ڈرائیونگ سیٹ کو ریلیکسنگ بنا کر نیم دراز حالت میں کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس نے دھوپ سے بچنے کے لئے اپنی پی کیپ کو ماتھے تک سرکایا ہوا تھا۔ ابرار شاہ اور اطہر راز پچھلی سیٹوں پر قمیض اور بنیان اتارے لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے کار کا اگلا دروازہ کھولا اور اعجاز کے برابر میں بیٹھ گیا۔ مجھے یوں لگا تندور میں بیٹھ گیا ہوں اندر خاصی تپش تھی اور دو تین مکھیاں بھی خاصا تنگ کر رہی تھیں۔ ابرار نے اپنے خوراک کے خفیہ تھیلے میں ہاتھ ڈالا اور ایک پیکٹ سا باہر نکالا۔

آپ یہ قیمہ ختم کریں۔

کیا مطلب؟

لندن سے چلتے ہوئے میں یہ گھر سے بنوا کر لایا تھا ختم ہی نہیں ہو رہا؟ اللہ نے چاہا تو ناروے تک پہنچتے پہنچتے ختم ہو جائے گا، دراصل مجھے فی الحال بھوک نہیں ہے۔

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ

عطا بھائی ہم تو یہاں آ کر پھنس گئے ہیں۔ بھولے بھالے اور گول مٹول سے اطہر راز نے اپنے مخصوص معصومیت کے انداز میں کہا۔ کیا ہوا؟ایک تو یہ کہ یہاں گرمی بہت ہے، شیو کرنے، نہانے اور آرام کرنے کو جی چاہ رہا ہے اور یہ سب کچھ کار میں ممکن نہیں اس یزید سے پانی حاصل کرنے کے لئے جتنے جتن کرنا پڑے، وہ آپ کے سامنے ہیں اور ایک تکلیف تو ایسی تھی کہ بس عطا بھائی کیا بیان کروں ؟

وہ کون سی ایسی تکلیف تھی؟

مجھے پیشاب بہت روز کا لگ رہا تھا۔ اطہر راز کے فقرہ مکمل کرنے سے پہلے ہی خواہ مخواہ میری ہنسی چھوٹ گئی چھا پھر کیا ہوا؟

میں کار سے اترا اور کسی باتھ روم کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا، مجھے فرانسیسی نہیں آتی، فرانسیسیوں کو انگریزی نہیں آتی چنانچہ بہت دیر تک سڑکوں پر پھرتا رہا بلآخر ایک ایک پبلک ٹائلٹ نظر آیا لیکن پتہ چلا اسے استعمال کرنے کے مشین میں دو فرانک ڈالنا پڑے ہیں اور میری جیب میں ٹوٹے ہوئے فرانک نہیں تھے، ادھر صورت حال یہ تھی کہ صورتحال میرے بس سے باہر ہو رہی تھی وہ تو اللہ بھلا کرے ایک پچیس سالہ فرنچ خاتون کا جو تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی آئی اور سڑک کے کنارے بیٹھ کر پورا اسکرٹ اوپر اٹھایا اور یہ کام اس سلیقے سے کیا کہ دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ والا شعر یاد آگیا۔

پھر کیا ہوا؟ بلاوجہ ہنسنے سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ اس خاتون کے اس انقلابی اقدام سے میری ہمت بندھی چنانچہ میں نے بھی وہیں کھڑے کھڑے وہ دھواں دھار حرکت کی کہ پیرس کی بنیادیں کمزور پڑ گئی ہوں گی مگر عطا بھائی بعد میں مجھے افسوس بہت ہوا۔ کس بات کا افسوس؟

میں جب لمبا راستہ طے کر کے واپس اپنی کار میں پہنچا تو یہ جو آپ بازار کے دونوں طرف کھڑی کاریں دیکھ رہے ہیں نا اور ان میں سے جو پرانے ماڈل کی فوکس ویگن ہے جسے پکاسو کی پینٹنگ کی طرح پینٹ کیا گیا ہے تو ایک نیگرو آیا اور اس فوکس ویگن کے پیچھے کھڑے ہو کر اس نے وہ کام کیا جس کے لئے میں خواہ مخواہ اتنا راستہ طے کیا تھا۔ عطا بھائی یہ لوگ تو بالکل ہمارے جیسے ہیں۔ میں نے ہنستے ہنستے ابرار شاہ کی طرف دیکھا تو وہ قیمہ ختم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ اگر یہ قیمہ مزید کچھ عرصہ پڑا رہتا تو کھانے والے کو ختم کر دیتا۔

آپ کو ایک اور بتا بتاؤں ؟ اطہر راز نے مجھے مخاطب کیا ادھر گزرنے والے لونڈے بالے ہمیں خواہ مخواہ چھیڑ کر گزرتے ہیں عطا بھائی ہم تو نکو بنے ہوئے ہیں لڑکیاں تنگ کر رہی ہیں۔ ابرار شاہ نے قیمہ ختم کر کے بظاہر شکایت آمیز لہجے میں کہا اور یہ کوئی اچھی لڑکیاں نہیں ہیں ان کے ساتھ ان کے دلال بھی نظر آتے ہیں۔ یار تو لعنت بھیجو کار پر ہوٹل میں کمرہ لو اور آرام سے وہاں رہو، تم لوگ اتنا لمبا سفر طے کر کے آئے ہو تھکن سے تمہارا برا حال ہے اور پھر پیرس تم دیکھ بھی پہلی دفعہ رہے ہو۔ اتنا سفر تم نے یہ پیرس دیکھنے کے لئے طے کیا تھا؟ چلو اٹھو نکلو یہاں سے ہوٹل

میں کمرہ لیتے ہیں میں نے جھنجلا کر کہا۔ کمرہ لینا کوئی پرابلم نہیں، ابرار شاہ نے کہا مگر جب ہم لوگ واپس آئیں گے تو پیرس کے اچکے کار لے کر فرو چکر ہوں گے۔ تو کیا ہوا کار انشورڈ ہے نقصان ہوتا تو انشورنس والوں کا ہو گا، اور پھر ویسے بھی تو یہاں دو رویہ اتنی کاریں کھڑی ہیں۔ آخر ان کے مالکان بھی تو کاریں خالی چھوڑ کر گئے ہیں۔

مگر انہوں نے اوسلو اور کوپن ہیگن جا کر مشاعرہ نہیں پڑھنا، اعجاز نے کتاب سے نظریں ہٹا کر مسکراتے ہوئے کہا بات یہ ہے کہ انشورنس والے انشورنس کی رقم تو ادا کر دیں گے مگر کار کی عدم موجودگی میں آپ کا سارا پروگرام تباہ ہو جائے گا لہذا ہم یہیں ٹھیک ہیں۔ ویسے بھی ہم بہت مزے سے ہیں۔ کیوں اطہر بھائی۔ اطہر بھائی نے بے بسی میں سر ہلا دیا۔ میں اوپر کمرے میں پہنچا تو حسن نیند سے بیدار ہو کر بالکونی میں کھڑا تھا۔ سامنے ایک ہیئر ڈریسر کی دکان تھی۔ جس کے دو حصے تھے مردوں والے حصے پر مسکولر اور خواتین والے حصے پر فیمینن لکھا تھا۔ ۔ اس وقت دو پہر کے چار بجے تھے اور گلی میں ایک عجیب طرح کی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اس علاقے میں عرب اور نیگرو زیادہ تعداد میں تھے۔ چنانچہ جو اکا دکا راہگیر نظر آتا وہ عرب یا نیگرو ہوتا۔ ہمارے سامنے فلیٹ نما بد رنگ عمارتیں تھیں جن کی لمبی لمبی کھڑکیاں تھیں اور ان کے آگے ریلنگ ہوئی تھی۔

حسن نے بتایا کہ پیرس میں ان کے ایک عزیز ڈاکٹر پرویز ہیں۔ انہوں نے فون پر ان سے بات ہے اور وہ دفتر سے فارغ ہو کر چھ بجے ہمارے پاس ہوٹل پہنچیں گے۔ چنانچہ میں اور حسن وقت گزری کے لئے ہوٹل سے باہر نکل گئے بخش اور صدیق اپنے کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ نیچے اتر کر ہم کار کی طرف گئے تاکہ اطہر، اعجاز اور ابرار کو بھی ساتھ لے لیں، لیکن وہ کار لاک کر کے پیرس کی گلیاں ماپنے نکلے ہوئے تھے۔

ہم ہوٹل کی ڈھلان والی گلی سے باہر نکلے اور واپسی کے رستے کو ذہن میں محفوظ رکھتے ہوئے ایک طرف منہ اٹھا کر چل دیئے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد ہم ایک با رونق بازار میں تھے مگر یہ بازار فروٹ اور سبزی مارکیٹ قسم کا تھا اور یہ فروٹ اور سبزیاں کسی دکان میں نہیں، عین سڑک پر چھابوں میں سجائی گئی تھیں۔ سڑک وہی پتھر کی اینٹوں کی تھی اور اس کی وجہ اہل فرانس کی قدامت پسندی اور اپنے کلچر سے محبت ہے چنانچہ جب یہ سڑکیں ٹوٹنے لگتی ہیں تو ان کی جگہ ماڈرن سڑکیں تعمیر کرنے کی بجائے ان کا صدیوں پرانا انداز برقرار رکھا جاتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ لندن کے بر عکس خاصی گرمی کے باوجود لوگ کپڑوں سے باہر نہیں ہو رہے تھے۔ البتہ ایک نیگرو خاتون ایسی تھی جس نے اپنے بالائی جسم کو صرف ایک دوپٹہ نما چادر سے ڈھانپا ہوا تھا۔ یہاں سے نکل کر ہم ایک اور بازار میں ونڈوو شاپنگ میں مشغول ہو گئے۔ یہاں سستی سستی چیزیں بھی تھیں۔ جوتے، کپڑے اور پرفیومز وغیرہ، کم سے کم قیمت کی پرفیوم ۲۰ فرانک کی تھی۔

ماسی برکتے کا تندور

ہم نے ابھی تک دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا چنانچہ اب بھوک لگنا شروع ہو گئی تھی۔ اچانک میری نظر دو دیسی چہروں پر پڑی جو گواچی ہوئی گاں کی طرح پیرس کے اس بازار میں منہ اٹھا کر گھوم رہے تھے۔ یہ دو انڈین نوجوان تھے انہوں نے ہمیں ایک انڈین ریستوران کا پتہ بتایا۔ پتہ کیا بتایا بیچارے ہمیں وہاں تک چھوڑنے آئے اور پھر گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔

یہ تلاش رزق میں فرانس تک آ پہنچے تھے اور اب یہاں اپنے ملک سے قدرے بہتر دھکے کھا رہے تھے۔ ریستوران کیا تھا ماسی برکتے کا تندور تھا۔ وہاں پہلے سے دو انڈین بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ جاتے وقت انہوں نے بل دینا چاہا تو تندور کے مالک انوبھا نے پیسے لینے سے انکار کر دیا کہ تم میرے پرانے دوست ہو اور دوستوں سے کھانے کے پیسے نہیں لئے جاتے مگر وہ انوبھا کے شدید انکار کے باوجود جاتے جاتے میز پر کچھ رقم چھوڑ گئے۔ ہوٹل کا مالک پرانی قدروں کا حامل اور خاصا وضع دار انسان تھا۔ اس نے میز پر پڑی رقم افسردہ نظروں کے ساتھ دیکھا۔ اور ہمیں مخاطب کر کہا یہ لوگ دراصل فرانس میں آ کر ہندستانی نہیں رہے۔ یہ بھول گئے ہیں کہ ہمارے کلچر میں مہمانوں سے کھانے کا بل وصول نہیں کیا جاتا۔

ہم دونوں نے اپنے لئے صرف ایک دال کا آرڈر دیا۔ اورنج جوس اور پاپڑ ویٹر خود ہی میز پر رکھ گیا۔ ایک دال اور تین چار چپاتیوں کا جو بل آیا وہ ساٹھ فرانک تھا۔ ویٹر یہ بل خود بخود لے آیا تھا۔ اچانک انوبھا کی نظر بل پر پڑی تو اس نے بل اٹھا لیا اور کہا آپ یہاں سیاحت کے لئے آئے ہیں۔ آپ کو پیسوں کی ضرورت ہے۔ مجھ پر بھگوان کی بہت کرپا ہے، آپ کبھی دوبارہ آئیں گے تو ضرور بل وصول کروں گا۔ مگر ہم نے اس کے شدید اصرار کے باوجود ساٹھ فرانک میز پر رکھے اور باہر نکل آئے عجیب بے وقوف آدمی ہے۔

اوکے اوکے فش ان چپس

میں نے ڈاکٹر پرویز کو یہ واقعہ سنایا تو وہ بھی دل کھول کر ہنسے۔ پھر اسی نوع کا ایک واقعہ انہوں نے ایک مشہور پاکستانی کرکٹر کے حوالے سے سنایا جسے کچھ دن پیرس میں گزارنا پڑے، وہ پہلے کھانا کھانے کے لئے ریستوران میں گیا تو مینو کھول کر بیٹھ گیا مگر کھانوں کے نام فرانسیسی میں ہونے کی وجہ سے اسے کچھ سمجھ نہ آئی تو اس نے ایک گاہک کو فش اینڈ چپس کھاتے دیکھ کر اس ڈش کا نام پوچھا اور اسی کا آرڈر دیا۔ اس کے بعد روزانہ اس بچارے کو فش اینڈ چپس کھانا پڑے تو اس کا منہ پھر گیا۔

ایک دن اس نے حوصلہ کر کے مینو منگوایا اور اندھا دھند ایک ڈش پر انگلی رکھ دی۔ ویٹر نے جواب میں کچھ پوچھا اس پر موصوف گھبرا گئے اور کہا او کے اوکے فش اینڈ چپس۔ یہ واقعہ سنا کر ڈاکٹر پرویز نے وضاحت کی کہ زبانوں کا مسئلہ صرف چھوڑے ریستورانوں میں ہے ورنہ بڑے ریستورانوں میں اس قسم کا کوئی پرابلم نہیں۔ آئفل ٹاور کے حضور باتیں کرتے کرتے ہم لوگ آئفل ٹاور کے قریب پہنچ گئے تھے، ڈاکٹر پرویز بخاری نے کار ایک جگہ پارک کی۔ سامنے عہد حاضر کا عجوبہ آئفل ٹاور پورے اوقات اور تمکنت سے اپنے مقام پر کھڑا تھا۔ میں یہاں تیسری دفعہ آیا تھا۔ پچھلی مرتبہ میرے ساتھ کوچہ حیدر پہلوان کا بھولا تھا جس کا اصل نام رشید بٹ تھا اور جس نے ایمسٹرڈیم سے پیرس تک کے ٹرین سفر کے دوران مجھ سے گزارش کی تھی کہ میں چیکر کے سامنے اسے بھولا نہ کہوں بلکہ بٹ صاحب کہوں تا کہ پر دیس میں بیستی نہ ہو جائے۔

میں ایک دفعہ پھر آئفل ٹاور کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ ٹاور آج سے سو سال پہلے جس انجنیر نے تعمیر کیا تھا اسی نے نہر سویز کا ڈیزائن بھی تیار کیا تھا۔ یہ ٹاؤ ۹۸٤ فٹ اونچا ہے اور ایک صدی بیشتر اس کی تعمیر پر اٹھتر لاکھ فرانک خرچ ہوئے تھے۔ اسٹیل کے اس بلند و بالا مینا پر سیاح لفٹ کے ذریعے اوپر جاتے ہیں جہاں ایک ریستوران بھی بنا ہوا ہے۔ میں دونوں دفعہ لفٹ پر ساری نہ کر سکا تھا اور اس دفعہ بھی یہ ممکن نہ تھا کیونکہ ان دونوں ٹاور کی سو سالہ تقریبات منا نے کی تیاریاں کی جا رہیں تھیں جس کی وجہ سے لفٹ بند کر دی تئی تھی۔ ایفل ٹاور کے ارد گرد انہی تیاریوں کے ضمن میں بڑے بڑے لوہے کے گارڈ پڑے ہوئے تھے۔

مجھے کچھ یاد پرتا ہے جیسے اس جگہ سرخ گلابوں کے تختے تھے جو بہت خوبصورت لگتے تھے۔ میں نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر پرویز بجاری سے کہا۔ میں آپ کی یاد اشت کی داد دیتا ہوں۔ ڈاکٹر بخاری نے میری بات کی تصدیق کی یہاں واقعی پھولوں کے تختے تھے مگر سو سالہ تقریبات کے لئے چونکہ جگہ در کار تھی اس لئے عارضی طور پر ہٹا دیئے گئے ہیں۔

دریائے سین کی سیر ایفل ٹاور سے ذرا فاصلے پر دریائے سین بہہ رہا تھا۔ ہم پیدل وہاں تک پہنچے یورپ میں ایسے مقامات کو سیاحوں کے لئے اصل سے زیادہ دلکش بنا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں سیاحوں اور مقامی باشندوں کا ہجوم تھا، جو خوبصورتی سے سجے ہوئے اسٹیمر میں سیر کے لئے یہاں آئے تھے۔ ڈاکٹر پرویز نے ٹکٹیں خریدیں اور پھر دوسرے سیاہوں کے ساتھ ہم بھی ایک طویل قطار میں اپنی باری کے انتظار میں کھڑے ہو گئے۔

اسٹیمر نے بھونپو بجا کر اپنی روانگی کا اعلان کیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے دریائے سین میں رینگنا شروع کر دیا۔ ایک فرنچ لڑکی گائیڈ کے طور پر انگریزی اور فرنم میں دریائے سین اور اس کے گرد و نواح کی داستان بیان کرتی جاتی تھی اور ہمارا اسٹیمر ۲۲ پلوں کے نیچے سے گزرا۔ دیرا کے دونوں طرف سینکڑوں برس پرانے مکان اپنی تاریخی سطوت کے ساتھ عجیب تمکنت کے ساتھ کھڑے تھے۔

ان مکانوں کی مرمت کی گئی ہے اور اب یہ پیرس کا انتہائی مہنگا رہائشی علاقہ ہے۔ جب ہمارا اسٹیمر کسی پل کے نیچے سے گزرنے لگتا تو پل پر کھڑے لوگ ہاتھ ہلا ہلا کر سیاحوں کو خوش آمدیدی کہتے بعض جو جوڑے سیاحوں کو دیکھ کر مسخریاں کرنے لگتے بلکہ ایک جگہ دریا کے کنارے تین ہومو بھی بیٹھے تھے جب اسٹیمر ان کے قریب سے گزرا تو انہوں نے اپنے تشخص واضح کرنے کے لئے آزادی عمل کا مظاہرہ بھی کیا۔ رستے میں پرانے شہنشاہوں کے محل بھی اپنے اپنے وقت کے عرش نشیبوں کے خاک نشین ہونے کی داستان سنانے کے لئے کھڑے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے تک دریائے سین میں کشتی رانی کے بعد ہم واپس اپنی کار کی طرف گئے اور پھر پرویز بخاری ہمیں پیرس کے دوسرے تاریخی علاقوں کی سیاحت کار میں بیٹھے بیٹھے کراتے رہے۔ ان علاقوں میں گھومتے ہوئے لگتا ہے تاریخ کی سوئی ایک دم پیچھے کو مڑ گئی ہے۔ دریائے سین کے پارنیوپلین کا مزار انولیہ، لودھر کا عجائب گھر، کلیسائے نوٹرا ڈیم اس کے علاوہ قدم قدم پر خیر اور شر کی نظر آتی ہیں جو فرانس کی تاریخ میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے چلتی ہیں۔

میرے خیال میں کھانے کا ٹائم ہو گیا ہے ؟ ڈاکٹر پرویز بخاری نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا اور پھر ہماری کار میری فرمائش پر کہ مجھے برگر بہت پسند ہے میکڈانلڈز کے سامنے کھڑی تھی۔ میکڈونلڈ فاسٹ فوڈ کے حوالے سے دنیا کا مشہور ترین چین ہے اور پیرس کا یہ میکڈونلڈ ان تمام میکڈونلڈز ان تمام سے خوبصورت تھا جو میں نے آج تک دنیا کے مختلف ممالک میں دیکھے تھے۔

پاکستانی دنیا کے کسی بھی ملک میں چلا جائے وہ اپنی روایات کبھی فراموش نہیں کرتا، اس ریستوران میں بھی سیلف سروس تھی مگر ڈاکٹر پرویز ہمیں ایک میز کے گرد بٹھا کر خود لائن میں لگ گئے اور پانچ آدمیوں کا کھانا ایک بڑی ٹرے میں ڈال کر لائے اور اسے اپنے مہمانوں کے لئے میز پر سجا دیا حالانکہ ڈاکٹر پرویز پیرس میں بہت اعلی سماجی مرتبے کے حامل ہیں مگر بطور میزبان وہ ویٹر کے فرائض بھی جود انجام دے رہے تھے۔

میرے نزدیک اس نوع کا رکھ رکھاؤ گھر یلو تربیت اور خاندانی پس منظر کا بھی رہن منت ہوتا ہے۔ ڈاکٹر پرویز پروفیسر مصطفی بخاری کے فرزند ہیں جو گورنمنٹ کالج سرگودھا سے بطور فارسی کے پروفیسر ریٹائر ہوئے اور ان دونوں لاہور میں ہیں سو ان کا بیٹا خواہ فرانس کی یونیورسٹی میں پروفیسر ہو اور فرانسیسی پرچے کا مدیر بھی ہو اردو فارسی کلچر کے اثر سے کیسے نکل سکتا ہے ؟

دریائے سین کی سیر

اوئے ایہہ کی اے ؟

کھانے سے فراغت کے بعد ایک بار پھر ہم تھے اور پیرس کی سڑکیں تھیں۔ اس وقت ہم سنٹرل پیرس میں تھے اور ایک با رونق سڑک پر سے گزر رہے تھے جس کے دونوں طرف درختوں کے گھنے جھنڈ تھے۔ اچانک اس جھنڈ میں سے دو لڑکیاں باہر نکلیں، کار کی لائٹ ان پر پڑی تو بے ساختہ میرے منہ سے نکلا اوئے ایہہ کہ اے ؟ میرے لئے یہ منظر ناقابل یقین تھا ڈاکٹر پرویز نے کار آہستہ کر دی تھی۔

میں نے آنکھیں مل کر دوبارہ اس طرف دیکھا دوبارہ وہی منظر میرے سامنے تھا۔ یہ دونوں لڑکیاں مکمل طور پر فطری لباس میں سڑک کے کنارے کھڑی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب یہ کیا معاملہ ہے ؟ میں نے اپنی حیرانی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

یہ یہاں کا مشہور پارک بودادی بیلون ہے۔ اس میں ہرنیوں کی بجائے تماشائیوں کی تفریح طبع کے لئے یہ ہرنی جیسی آنکھوں والی لڑکیاں چھوڑ دی گئی ہیں معاملے طے پانے پر تماشا اور تماشائی ان درختوں کے پیچھے چھپ جاتے ہیں۔

جوں جوں کار آگے بڑھتی گئی میری حیرانی کم ہوتی گئی اور پریشانی میں اضافہ ہوتا گیا۔ درختوں کے جھنڈ میں سے یہ ہرنیاں اچانک نمودار ہوتیں اور سڑک کے درمیان میں آن کھڑی ہوتیں۔ میرے خیال میں عورت کی جتنی تذلیل مغرب نے کی اتنی شاید ہی دنیا کے کسی معاشرے نے کی ہو اور عورتیں ہیں کہ اس عزت افزائی پر مغرب کی ممنون ہیں۔ کیا عورتیں واقعی ناقص العقل ہیں ؟

عورت کی تذلیل کا یہ سلسلہ پگال کے علاقے میں بھی عروج پر تھا، جس طرح ہمارے ہاں قصائیوں نے بکرے کی کھال اتار کر انہیں کھونٹی پر لٹکایا ہوتا ہے اسی طرح اس علاقے میں بھی مردوں نے عورتوں کو توہین اور ذلت کی کھونٹی پر لٹکایا ہوا تھا اور یہ سب مناظر مکروہ سرمایہ داری نظام کے تخلیق کردہ ہیں خواہ فرانس میں اس نظام کر سوشلزم ہی کا نام کیوں نہ دیا گیا ہو

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ

دنیا ہے تری منتظر اے روز مکافات

رات کو بارہ بجے کے قریب ہم واپس پانے ہوٹل پہنچے تو اعجاز ابرار اور اطہر راز ابھی سیاحت سے نہیں لوٹے تھے، تھوڑی دیر بعد وہ بھی آ گئے۔ ڈاکٹر پرویز ہم سے پر جوش معانقہ کر کے تیس میل دور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے تھے تھکاوٹ سے ہمارا جسم چور تھا۔ ہمارا ارادہ اب کمروں میں جا کر گہری نیند سونے کا تھا۔

مگر ابرار نے تجویز پیش کی کہ پیرس جتنا دیکھنا تھا دیکھ لیا اب رات کو سونے میں ضائع کرنے کی بجائے کیوں نہ جرمنی کی طرف سفر شروع کر دیا جئے چنانچہ سب دوستوں نے اس سے اتفاق کیا، ہم نے اوپر جا کر اپنا سامان سمیٹا کاؤنٹر پر بل ادا کیا اور کار میں بیٹھ گئے۔ صدیق نے اپنے سامنے نقشہ پھیلایا ہوا تھا اس نے بزن کا اشارہ کیا اور اعجاز نے کار کا رخ جرمنی کی طرف موڑ لیا۔

جرمنی پہنچنے کے لئے ہمیں بیلجیم سے ہو کر گزرنا تھا۔ سو اس وقت ہم بیلجیم کے راستے میں تھے۔ ابرار ترمذی تھوڑی تھوڑی دیر بعد جاگتے رہو کے انداز میں کیپ رائٹ کی آواز لگاتا تا کہ اعجاز غلطی سے کہیں لیفٹ لین میں نہ آ جائے حالانکہ اتنی اتحیاط کی چندا ضرورت نہ تھی کہ لندن سے روانہ ہوتے ہوئے ہن نے اپنی لائف انشورنس کرالی تھی۔ بیچارے بیلجیم کا تو پتہ بھی نہ چلا ہمیں سفر کا پتہ بھی نہ چلا اور بیلجیم عبور کر کے ہم مغربی جرمنی کی سرحد میں داخل ہو گئے، فرانس سے بیلجیم میں داخل ہوتے ہوئے ہمیں چیک پوسٹ پر پاسپورٹ دکھانے کے لئے بھی نہ رکنا پڑا کیونکہ چیک پوست جالی پڑی تھی البتہ جرمن امیگریشن آفیسر نے ہم سیاہ فاموں کے پاسپورٹ چیک کئے۔ ان میں سے میرے اور حسن کے پاس پاکستانی پاسپورٹ تھے جبکہ باقی دوست برٹش پاسپورٹ پر سفر کر رہے تھے مگر جب تک یہ دوست اپنے چہروں پر سفید پالش نہیں کرائیں گے۔

انہیں اس سلوک کا مستحق نہیں سمجھا جائے گا جس سلوک کا مظاہرہ سفید فاموں سے بھری ہوئی بس کے مسافروں کے ساتھ کیا گیا۔ یہ مسافر امگریشن کے عملے دیو کرتے ہوئے بارڈر کراس کر گئے۔ جرمن امگریشن افسر نے پاسپورٹ چیک کرنے کے علاوے ہمارے چہروں کا بھی ناقدانہ جائزہ لیا اور پھر گرین سگنل دے دیا بلکہ پاسپورٹ پر انٹری کی مہر بھی نہیں لگائی۔ ہم پیرس سے رات کو تقریباً ایک ڈیڑھ بجے چلے تھے اور اب صبح ہو چکی تھی چنانچہ ہم نے بارڈر کے قریب و جوار میں واقع ایک ریستوران کے پاس کار روکی۔ قریب ہی کرنسی تبدیل کرنے کا کھوکھا بھی تھا چنانچہ کچھ برطانوی پاؤنڈز کی قومیت تبدیل کر کے انہیں جرمن سکے مارک میں کنورٹ کیا اور بیڈ ٹی پینے کے ریستوران میں داخل ہو گئے۔

یہ ہم ریستوران میں کیوں جا رہے ہیں ؟

چائے پینے لے لئے ؟

چائے پینے کی کیا ضرورت ہے ؟

آپ کا سوال بہت جینوئن ہے بس یونہی فضول خرچی کو جی چاہ رہا ہے۔

چائے پینے سے پیسے کا نہیں وقت کا ضیاع ہو گا۔ لہذا ہمیں سفر جاری رکھنا چاہئے۔

سفر جاری رکھنے کے لئے چائے پینا ضروری ہے۔ جہاں تک وقت کے ضائع ہونے کا تعلق ہے تو ہم پاکستانیوں نے اپنے ٤٢ سال ضائع کئے ہیں، چند منٹ اور سہی۔

مگر ابرار ترمذی نے اپنا وقت ضائع نہیں ہونے دیا چنانچہ جتنی دیر ہم چائے پیتے رہے وہ کار میں بیٹھا رہا۔ بل ادا کرنے ہوئے خود ہمیں بھی وقت کے ضائع ہونے کا احساس ہوا کیونکہ ایک کپ چائے کی قیمت تقریباً ایک پاؤنڈ کے برابر تھی۔

ہمبرگ کی تاریک گلیاں

اب ہمارا رخ ہیمبرگ کی طرف تھا۔ زیادہ تر راستہ میدانی علاقے پر مشتمل تھا اور سر بلند فصلیں پنجاب، سندھ اور سرحد کے کھیتوں کی یاد دلا رہی تھیں۔ رستے میں ہم بائی وے سے اتر کر جرمنی کے صنعتی شہر ڈوشل ڈون میں سے گزرے مرسیڈیز کار اسی شہر میں تیار ہوتی ہے۔ شام کو پانچ بجے کے قریب ہم بھمبرگ میں تھے۔

ہم نے سینٹرل ہان ہاف ریولے استیشن کے پاس کار کھڑی کی اور ایک دفعہ پھر ہوٹل کی تلاش کے علاوہ زبان کا مسئلہ درپیش تھا۔ پاکستان میں بیٹھ کر ہم لوگ سمجھتے ہیں کہ انگریزی جاننے کا مطلب یہ ہے کہ آپ دنیا کے کسی بھی ملک میں اجنبی نہیں ہیں حالانکہ اس چکر میں ایک طبقے نے ہمیں اپنے ملک میں اجنبی ضرور بنا دیا ہے۔ بہر حال ہوٹل کی تلاش میں ہمیں یہاں بھی خاصا خجل و خوار ہونا پڑا۔ اس وقت تھکن سے بدن چور تھا کہ پندرہ سولہ گھنٹے کی طویل مسافت کے بعد ہم لوگ یہاں پہنچے تھے۔ تا ہم اس دوران میں نے فون پر پاکستان نازی اور بچوں سے بات کی۔ یاسر عمر اور علی آوازیں پردیس میں مجھے ادا کر دیتی ہیں لیکن اگر یہ آوازیں نہ سنوں تو اداسی ڈپریشن میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

چمن کا میوہ

جرمن بارڈ ر سے ہم نے کرنی کی بہت معمولی مقدار تبدیل کرائی تھی چنانچہ میں اور حسن رضوی جرمن کرنسی کے حصول کے لئے اسٹیشن میں ٹورسٹ کاونٹر پر گئے اس کاؤنٹر تک ہماری رہنمائی ایک خان صاحب نے کی تھی جن کا تعلق چمن سے تھا، گویا چمن کا میوہ ہیمبرگ تک جاتا ہے۔ آپ پاکستانی بھائی لگتے ہیں ؟ بالکل صحیح اندازہ لگایا۔ بھائی کو بھائی ہی پہچانتا ہے۔ آپ بھی نوکری کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔ حلیے سے تو یہی لگتا ہے مگر اس وقت تو ہم ہوٹل کی تلاش میں ہین> اپ کسی ایجنٹ

کے ہتھے نہ چڑھ جائیں، وہ محض اپنی کمیشن کے لئے آپ کو کسی مہنگے ہوٹل میں ٹھرا دے گا۔ تو پھر کیا کریں ؟ میں جب یہاں آیا تو کچھ عرصے کے لئے ایک ہوٹل میں ٹھرا تھا، ٹھیک ٹھاک ہوٹل تھا۔ اسٹیشن سے قریب ہے اس کا نام پنشن ہے اپ وہاں چلے جائیں۔

یہ پینشن کہاں واقع ہے ؟

قریب ہی ہے چلیں میں آپ کو وہاں تک چھوڑ آتا ہوں۔ ہم نے اپنے اس پاکستانی بھائی کا شکریہ ادا کیا۔ خالص جرمن طرز کے گھر جیسے اس ہوٹل کی مالک ایک لہیم شحیم جرمن لیڈی تھی جس کا دفتر دوسری منزل پر تھا۔ لکڑی کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے جن میں کوئی بلب روشن نہیں تھا ہم اس کے دفتر میں پہنچے تو اس بارہ من کی دھوبن سے پہلے اس کے کتے نے ہمارا استقبال کیا جس نے پطرس بخاری والے کتے کی طرح اپنی دم خلق جدا کا امتحان لینے کے لئے عین دروازے کی رہگزر میں پھیلائی ہوئی تھی خوش قسمتی سے یہ دم ہمیں نظر آ گئی چنانچہ ہم لوگ اس پر سے پھلانگ کر بارہ من کی دھوبن تک پہنچے۔ کمرے کا کرایہ ۱۲۰ مارک یومیہ تھا۔ جس میں چار بستر لگے ہوئے تھے۔ دو بستر علیحدہ علیحدہ اور دو اوپر نیچے ہم نے اپنے پاکستانی بھائی سے مشورہ کیا، اس نے کہا بالکل مناسب کرایہ ہے، اس سے کم کرائے پر آپ کو کہیں ایسا کمرہ نہیں ملے گا چنانچہ ہم نے دو کمرے لئے ایک میں بخش، صدیق، حسن اور میں دوسرے میں اعجاز احمد اعجاز، اطہر راز اور ابرار ترمذی،

محترمہ ایک بات اور بتاتی جائیں

لینڈ لیڈی نے مجھے گروپ لیڈر کے طور پر اپنے ساتھ لیا اور سیدھا باتھ روم میں لے گئی جو کمرے سے ملحق نہیں بلکہ بہت سے کمروں کا مشترکہ باتھ روم یہ بیسن ہے۔ اس نے بیسن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، اس میں منہ دھوتے ہیں، پھر اس نے ٹونٹی کھو کر مجھے اپنا دھلا دھلایا منہ مزید دھوکر دکھایا۔ یہ تو آپ نے بے حد کرم کیا جو اس کا استعمال بتا دیا ورنہ ہم تو شاید اسے کموڈ کے طور پر استعمال کرتے۔ میں نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

مجھے اس بات کا اندیشہ تھا کیونکہ اکثر پاکستانیوں کو سب کچھ بتانا پڑتا ہے۔ اس نے میرے ریمارکس کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے کہا، اور کموڈ وہ سامنے ہے اس پر پاؤں رکھ کر نہیں بیٹھتے اس پر اس طرح بیٹھتے ہیں پھر اس نے کموڈ پر بیٹھ کر دکھایا۔ تم اپنے باقی دوستوں کو بھی ان چیزوں کا استعمال سکھا دو۔ اس نے اپنے دفتر کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ذرا ایک منٹ کے لئے رک جائیں میڈم میں نے اسے پیچھے سے آواز دی، آپ نے تو یہ بتا دیا کہ کموڈ پر اس طرح بیٹھتے ہیں مگر یہ نہیں بتایا کہ اس کے بعد کیا کرتے ہیں ؟

اس پر میڈ م نے غور سے میری طرف دیکھا اور اپنی غلطی کا احساس ہونے پر ایک دم اس کے چہرے پر ندامت کے آثار پیدا ہوئے اور اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا آئی ایم سوری جنٹلمین میں نے آپ کی حیثیت کا اندازہ لائے بغیر یہ احمقانہ باتیں کیں، دراصل اس سلسلے میں مجھے کافی تلخ تجربے ہوئے ہیں، جس کے بعد ہر پاکستانی کو مجھے یہ سب کچھ بتانا پرتا تھا۔ میں ایک دفعہ پھر معذرت خواہ ہوں۔

میں واپس دفتر میں گیا اور لینڈ لیڈی سے دونوں کمروں کی چابیاں لے کر دوستوں کے ساتھ کمرے کی طرف گیا مگر پھر خیال آیا کہ لینڈ لیڈی سے چیک آؤٹ ٹائم پوچھ لینا چاہئے کیونکہ کل ہمیں ڈنمارک کے لئے روانہ ہونا تھا۔ میں کتے کی دم پھلانگ کر کمرے میں داخل ہوا تو لینڈ لیڈی ہمارے پاکستانی بھائی کو کچھ مارک دے رہی تھی، پاکستانی بھائی نے مجھے دیکھا تو جھینپ گیا۔ حالانکہ اس بیچارے نے تو ہمیں ٹھیک مشورہ دیا تھا کہ آپ کسی ایجنٹ کے ھتھے نہ چڑھ جائیں اور اگر ہم کسی ایجنٹ کے ھتھے چڑھ گئے تھے تو یہ ہماری اپنی غلطی تھی۔

اس وقت رات کے تقریباً نو بج چکے تھے اور ہمارے پاس ہیمبرگ کے لئے یہی ایک رات تھی چنانچہ فیصلہ ہوا کہ بس لوگ جلدی سے تیار ہو کر نیچے کار کے پاس پہنچ جائیں۔ ہمارے کمرے میں ٹیلی فون بوتھ ٹائپ ایک چیز کھڑی تھی اس کا دروازہ کھول کر دیکھا تو یہ شاور تھا مگر اس بوتھ کے شیشے ٹرانسپیرنٹ تھے چنانچہ سب دوستوں نے ایک دوسرے کو ہدایت کی کہ وہ شاور کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ جائیں تا کہ باری باری سب نہا سکیں اور یوں غض بصر سے کام لینے ہوئے سب دوستوں نے باری باری غسل کیا اور نیچے کار کے پاس پہنچ گئے۔ بخش لائل پوری تھکے ہوئے تھے چنانچہ انہوں نے کہا آپ لوگ جائیں میں یہیں کمرے میں رہوں گا۔ بس جو کچھ دیکھیں وہ واپس آ کر بتا دیں مجھے اپ پر اعتبار ہے۔

ہم لوگ نیچے آ تو گئے ہیں مگر اب جایا کہاں جائے ؟ ابرار ترمذی نے کار کے پاس پہنچ کر ایک جینوئن سوال کیا۔ اکرم چغتائی نے مجھے اپنے ایک دوست ممتاز بٹ کا فون نمبر دیا تھ اور کہا تھا کہ وہ ہیرا آدمی ہے۔ اس ہیرے کو فون کرتے ہیں کہ وہ آج کیرات ہیمبرگ کی سیر کرائے۔ ممتاز بٹ کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ پاکستان گئے ہوئے ہیں۔ اپ کون بول رہے ہیں؟ ہم لاہور سے آئے ہیں اکرام چغتائی کے دوست ہیں۔ آپ لوہور سے بھی آئے ہیں اور اکرام چغتائی کے دوست بھی ہیں تو پھر آپ فوراً پہنچیں میں راشد ہوں۔ ہالی ڈے ریستوران ریپربون میں ہے۔ آپ وہاں آ جائیں۔ کیا آپ کے پاس کوئی سواری ہے ؟

میرے اثبات میں جواب دینے پر اس نے اعجاز احمد اعجاز کو راستہ سمجھایا مگر راستہ سمجھانے سے کیا فرق پڑتا تھا اس کے لئے جرمنوں کو سمجھانا ضروری تھا کہ وہ ہماری خاطر انگریزی سیکھ لیں مگر اس سے پہلے انہیں انگریزوں کی ڈیڑھ سو سال تک غلامی کرنا پڑتی۔ چنانچہ راستہ سمجھنے کے باوجود ہم بھٹکتے بھٹکتے رات کو تقریباً گیارہ بجے ہالی ڈے ریستوران پہنچے۔

خوش طبع اور خوش شکل راشد ہمارا منتظر تھا۔

وہ ہمیں اس طرح ملا جیسے برسوں سے شناسا ہو اور تھوڑی دیر بعد اس نے ایک بڑی میز پر تکلف کھانوں سے سجا دی۔ کھانے سے فراغت کے بعد ہم حرف معدا زبان پر الئے تو اس نے آدھی رات کو شراب کے نشے میں مدہوش شرابیوں کے علاوہ آپ کو سڑکوں پر کیا نظر آئے گا۔ رات گئے تک تو صرف یہی بازار آباد رہتا ہے جہاں آپ اس وقت موجود ہیں۔ کیا مطلب؟ یہ علاقہ ہیمبرگ کی نائٹ لائف کا مرکز ہے اور پوری دنیا کے سیاح ہیمبرگ میں صرف اس ریپربون کے علاقے کے لئے آتے ہیں۔ یہ نائٹ لائف تو ہم نے کیا دیکھنی تھی بس بازار کا ایک چکر لگایا۔ ایک گلی میں جس کے دونوں سروں پر بڑے بڑے گیٹ بنے ہوئے ہیں۔ شیشے کے کیبن بنے ہیں اور ہر کیبن میں ایک بنت حوا بیٹھی ہے۔

یہ وہ حوا ہے جسے مغرب نے حقوق دلوانے کے جھانسے میں اس کے کپڑے تک اتروا لئے لیکن وہ اپنی اس ذلت پر بھی خوش ہے چنانچہ وہ ان کیبنوں میں قصائی کی دکان پر کھال اترے ہوئے بکرے کی طرح کھونٹی پر لٹکی ہوئی ہے اور گاہکوں کا انتظار کر رہی ہے تماشائیوں کی سیٹیاں بھی اس کی جودی کو بیدار نہیں کرتیں کیونکہ اگر اس کی خودی بیدار ہو گئی تو ایئر کنڈیشنڈ گھر، ایئر کنڈیشنڈ کار، ملبوسات جو انہوں نے صرف گھر میں پہننا ہوتے ہیں ٹیلی ویژن، وی سی آر، مائیکرو ویو، اوون، ریفریجریٹر، مشروبات کاسمیٹکس اور اس نوع کی دوسرے بے شمار آسائشوں کی ماہانہ قسطیں کون ادا کرے گا، جنہیں صنعت کار نے صارفین کی ضرورت بنا دیا ہے اور انڈسٹری کا ڈھانچہ قائم رکھنے اور صارفین کو شکنجے میں کسنے کے لئے ان کے پاؤں میں آسان قرضوں کی زنجیریں ڈال دی ہیں۔

ہمبرگ کی تاریک گلیاں جنس کا جمعہ بازار اس گلی کے علاوہ پیچ در پیچ گلیوں میں سینکڑوں کی تعداد میں جنس کا جمعہ بازار لگا ہوا ہے۔ اور یہ جنس جنس لطیف نہیں، جنس کیف کی صورت میں ہر موڑ پر کھڑی نظر آتی ہے۔

اور پھر قطار اندر قطار نائٹ کلب ہیں جہاں دنیا کے بد ترین شوز پیش کئے جاتے ہیں جنہیں کہنے والے بہترین شو بھی کہتے ہیں۔ ہر کلب کے بار ایجنٹ راہگیروں کو رو ک روک کر راز ہائے درون خانہ سے آگاہ کرتے ہیں۔ بلکہ بازو سے کھینچتے ہوئے اندر لے جاتے اور ایک جھلک دکھا کر باہر لے آتے ہیں۔ ایک جھلک ہمیں بھی دکھائی گئی ہے جو عورت مرد کے تعلق کے حوالے سے ہے اور جس کا برسر اسٹیج مظاہرہ انسان کو شرف انسانیت سے محروم کرنے کے مترادف ہے۔

ہمارے ہاں گائے بھینسوں کو جس طرح شام کے بعد باڑے میں بند کر دیا جاتا ہے ایک اسی طرح کا باڑہ ہے اور اس میں اللہ تعالی کی یہی لطیف مخلوق بند ہے۔ گاہک بارے میں میں گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہیں اور ان گائے بھینسوں کو ٹٹولنے کے بعد ہانک کر لے جاتے ہیں۔

ایک بازار ہے جس کے باہر لکھا ہے صرف مردوں کے لئے یہاں تماشائی بھی مرد ہیں اور تماشا بھی مرد ہیں۔ ہم ان عفونت زدہ گلیوں کا چکر کاٹ کر واپس میں روڈ پر آتے ہیں تو نظر ایک بوڑھے پر پڑتی ہے جس کے بدن پر لباس کی بجائے چیتھڑے ہیں۔ وہ چلتے چلتے سر کے بل گرتا ہے اور بے ہوش ہو جاتا ہے۔ اس کے ماتھے سے خون کی ایک لکیر پھوٹی ہے جو سڑک پر پھیل گئی ہے اس کے گرد راہگیروں کا ہجوم اکھٹا ہو جاتا ہے مگر کوئی اس کے قریب نہیں جاتا۔ کچھ دیر بعد پولیس آتی ہے اور اسے اٹھا کر لے جاتی ہے۔

یہاں نظر پڑتی ہے ایک نوجوان لڑکی اور لڑکے پر لڑکی کی گود میں ایک بچہ بھی ہے مگر یہ اس بات کا بہر حال کوئی ثبوت نہیں کہ وہ میاں بیوی ہیں، ان کے ساتھ آٹھ دس کتے ہیں جن سے سڑک پر چلنے والے خوفزدہ نظر آتے ہیں۔ یہ خواجہ سگ پرست جدھر جاتا ہے، دم ہلاتے ہوئے کتے اس کے ساتھ چلتے ہیں لوگ یہ انوکھا منظر حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ واپس کار کی طرف جاتے ہوئے ایک شخص ہمارا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

انڈین؟ نہیں پاکستانی۔ اس سامنے والے کلب میں ایک پاکستانی لڑکی کا بہترین شو، کوئی انٹری فیس نہیں تم اس کی ایک جھلک مفت بھی دیکھ سکتے ہو۔ جی چاہتا ہے کہ زمین کا سینہ شق ہو جائے اور ہم اس میں سما جائیں۔ جرمنی صرف ریپرپون نہیں ہے ؟ کار میں بیٹھتے ہوئے میں خود کلامی کے موڈ میں ہوں۔ میں جانتا ہوں جرمنی صرف ریپر پون نہیں ہے۔ مگر جو نظام ریپر پون کو جنم دیتا ہے۔ میری نظروں میں اس نظام کے تحت ہونے والی تمام ترقی بے کار ہے۔ ریپر بون بے لگام خواہشوں کی بے دام غلامی کا نام ہے اور غلامی کا یہ جو اس نظام کے تحت پرورش پانے والے پادریوں ں، پروفیسروں سائنس دانوں بد معاش انسانوں شریف انسانوں اور زندگی کے تمام شعبوں کے افراد کی گردنوں میں موجود ہے۔ انسنا کو اشیا کا غلام بنا دیا گیا ہے۔

اور یہ ایشیاء تیار کرنے والی مشینیں انسانوں کی آقا بن گئی ہیں۔ مگر ریپربون تو پاکستان میں بھی گھر گھر موجود ہے۔ یقیناً موجود ہے اور سرمایہ پرست نظام کے تحت چلنے والے ملکوں سے زیادہ بد ترین شکل میں موجود ہے کیونکہ ہمارے ہاں یہ نظام بھی ادھوری شکل میں نافذ ہے جس کے نتیجے میں اس کی اچھائیوں میں سے ہمیں حصہ نہیں ملا، صرف اس کی برائیاں ہمارے حصے میں آئی ہیں۔ یا خدا:انسان اس زمین پر تیرا نائب ہے۔ اسے نیابت کے آداب سکھا۔ ایک متقی سکھ سے ملاقات اگلے روز صبح ٹھیک دس بجے اعجاز احمد اعجاز ڈائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا تھا کیونکہ رات کو سونے سے پہلے طے پایا تھا کہ ہم لوگ دس بجے ڈنمارک کے لئے روانہ ہو جائیں گے مگر ابھی تو ہمیں ناشتہ بھی کرنا تھا چنانچہ ہم لوگ پنشن کے عقب میں واقع ایک سردار جی کی دکان میں داخل ہوئے۔ یہ ایک جنرل اسٹور تھا مگر ہماری اطلاع کے مطابق یہاں بریک فاسٹ، لنچ یا ڈنر کا انتظام بھی ممکن تھا۔

ہم نے بچرچ بریک فاسٹ اور لنچ کا فیصلہ کیا چنانچہ ہم نے یہاں دال روٹی کو ترجیح دی اور سات آدمیوں کی دال روٹی ہمیں ساٹھ مارک یعنی بیس پاؤنڈ میں پڑی۔ برنچ کے

بعد میں نے حسب معمول سگریٹ سلگایا تو سردر جی کاؤنٹر کے پیچھے سے چل کر میرے پاس آئے اور کہا سگریٹ نوشی ہمارے مذہب میں حرام ہے۔ آپ نے اگر پینا ہے تو براہ کرم دکان سے باہر جا کر پیئیں۔

اندازہ ہوا کہ یہ کوئی فاسق و فاجر سکھ نہیں ہیں بلکہ بڑے متقی قسم کے سکھ ہیں۔ سردار جی سے گپ شپ کے دوران یہ بھی پتہ چلا کہ ان کا خاندان صدیوں سے افغانستان میں آباد ہے اور انہیں جرمنی میں آباد ہوئے ابھی کچھ ہی عرصہ گزرا ہے نیز یہ کہ سردار جی اور ان کے اہل خانہ فارسی، پنجابی اور اردو بڑی روانی سے بولتے ہیں۔

میں سرداروں کی ایک صفت کا بے پناہ قائل ہوں اور وہ یہ کہ وہ ہر قسم کے حالات میں اپنی ثقافت کی بہر صورت حفاظت کرتے ہیں چنانچہ دنیا کی غالباً یہ واحد قوم ہے جو دنیا کے کسی بھی ملک میں خواہ کتنے ہی عرصے سے آباد کیوں نہ ہو۔ اس کا تعلق اپنی زبان اور اپنی ثقافت کے دیگر مظاہرے سے پوری مضبوطی کے ساتھ موجود رہتا ہے۔

ہیمبربگ سے نکلنے کے لئے ہائی وے پر چڑھنے سے پہلے ہماری گاڑی راستے میں ہی خراب ہو گئی۔ دل خوش ہو گیا کہ بلآخر خدا نے ہماری سن لی، چنانچہ دعا کہ کہ یا باری تعالی اس میں اتنا نقص ضرور ڈال جو چوبیس گھنٹوں کے دوران ٹھیک نہ ہو سکتا ہو تا کہ ایک تو انشورنس کے لئے ادا کی ہوئی رقم تر ہوئے اور دوسرے قواعد کے مطابق انشورنس والے کار ٹھیک ہونے تک کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ہمارے کمرے بک کرا دیں۔

مگر شو مئی قسمت کہ اے اے والوں کا مکینک کار خراب ہونے کے تقریباً دو گھنٹے بعد یعنی دو بجے کے قریب موقع واردات پر پہنچ گیا اور پانچ منٹ میں خرابی دو ر کر کے رومال ہاتھ میں پونچھتے ہوئے بولا بے فکر ہو جائیں اب یہ تمام سفر میں خراب نہیں ہو گی، یہ بھلا کیسے خراب ہو گی اسے جرمن ہاتھ لگے ہیں۔ جرمن اپنے قومی افتخار کے اظہار کو کائی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

کوپن ہیگن۔ بد سے بدنام برا

تقریباً سو کلو میٹر کی مسافت طے کرنے کے بعد ہم پٹ گارڈن میں تھے جہاں سے ہم نے ڈنمارک کے لئے فیری لینا تھی، یہ فیری بہت خوبصورت اور آرام دہ تھی اس نے دو گھنٹے کے سفر کے بعد ہمیں ڈنمارک کی ایک بندرگاہ پر پہنچا دیا جہاں سے کوپن ہیگن ۱۲۰ میل ہے۔

پٹ گارڈن سے کوپن ہیگن تک ۱۲۰ میل کی مسافت طے کرنے کے بعد جب ہم لوگ کوپن ہیگن شہر میں داخل ہوئے تو جسم تھکاوٹ سے چور تھے مگر دوسروں کا تو علم نہیں البتہ سفر میرے لئے ٹانک کا کام دیتا ہے۔

چنانچہ جب میں نئی سرزمینوں پر قدم رکھتا ہوں تو میری تھکاوٹ کا فور ہو جاتی ہے اور میں خود کو نئے سرے سے چاق و چوبند محسوس کرنے لگتا ہوں۔ ڈنمارک اور دوسرے سیکنڈے نیوپن کنٹریز کے بارے میں بہت عرصے سے بہت کچھ سن رکھا تھا اور اب یہ سب کچھ دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ چنانچہ میں تھکاوٹ کو بھول چکا تھا اور ایک دفعہ جو کو تر و تازہ بلکہ تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ اس سفر کے دوران ہم جس شہر میں داخل ہوئے یہ عجیب بات ہے کہ دانستہ، نا دانستہ طور پر خود بخود اس شہر کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ جاتے چنانچہ ہم ایک بار پھر کوپن ہیگن کے ریلوے اسٹیشن کے باہر کھڑے تھے۔ ایک بات جو مجھے اپنے پاکستانی بھائیوں کے حوالے سے سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ ان کا ہر جگہ موجود ہونا ہے۔ آپ دنیا کے کسی دور دراز کونے میں چلے جائیں شہر کے دروازے پر کوئی پاکستانی ہاتھ میں شہر کی چابیاں تھامے آپ کا منتظر ہو گا بلکہ مجھے اس امر پر بھی مکمل یقین ہے کہ جب چاند پر انسانوں کی باقاعدہ آمد رفت شروع ہو گی تو چاند پر اترنے کے بعد بعد مسافر جس ویگن پر بیٹھیں گے اس ویگن کا مالک، ڈرائیور، یا کلینر پاکستانی ہو گا، جو ان مسافروں میں سے پاکستانی مسافروں کو چھانٹ کر الگ کر لے گا اور پہلی بات یہ کہ ان سے ٹکٹ بھی نہیں لے گا اور دوسرے یہ کہ انہیں اپنے گھر لے جائے گا اور ان کی خوب خاطر تواضع کرے گا، اگر کسی مسافر کے پاس واپس زمین پر پہنچنے کا کرایہ نہیں ہو گا تو یہ دوسرے پاکستانی بھائیوں سے مل کر اس کے لئے کرایہ بھی جمع کرے گا۔

آپ سوچ رہے ہون گے کہ میں شاید بہت ہی حسن ظن سے کام لے رہا ہوں آپ کا گما بھی صحیح ہے کیونکہ آپ کی نظروں میں وہ پاکستانی ہیں جو پاکستان میں رہتے ہیں وہ ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچتے ہیں بلکہ جو پاکستانی بیرون ملک آباد ہیں وہ باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کے لئے جن کے لئے وہ دیدہ دل فرش راہ کر دیتے ہیں۔ اپنے مہمانوں کے لئے یہ پاکستانی ایک بالکل دوسرے روپ میں نظر آتے ہیں۔

اور کچھ اسی قسم کے مہمان نواز پاکستانی کوپن ہیگن ریلوے اسٹیشن کے باہر کھڑے تھے اور کچھ اسی طرح کھڑے تھے جیسے ہمارے استقبال کے لئے کھڑے ہیں۔

یہ سب کے سب ٹیکسی ڈرائیور تھے۔ وہی ٹیکسی ڈرائیور جو پاکستان میں ان مسافروں کو بھی لفٹ نہیں کراتے جن سے ڈبل کرایہ وصول کرتے ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی ہمارے یہ دوست والہانہ طور پر ہمارے طرف بڑھے ہمارے حلیے اور کار کی نمبر پلیٹ سے وہ جان گئے کہ ہم یہں پردیسی ہیں۔ انہوں نے ہمارے وطن مالوف کے بارے میں دریافت کیا اور جب انہیں معلوم ہوا کہ ہم پاکستانی ہیں تو انہوں نے ہمیں یہ تاثر دیا جیسے ہم الہ دین ہیں اور وہ ہمارے جن ہیں جو ہمارے چراغ رگڑ نے پر ہر خدمت بجا لائیں گے ہم نے ان سے کیا خدمت لینا تھی، بس ان کی محبت کے بوجھ تلے دب کر رہ گئے۔

کوپن ہیگن میں ہمارے دو میزبان تھے ایک ترغیب بلند نقوی اور دوسرے سردار شمشیر سنگھ یہ دونوں بزم ادب کوپن بیگن کے روح رواں ہیں اور اہم نے انہی کے مشاعرے میں شرکت کے لئے اتنا سفر طے کر کے یہاں پہنچتے تھے۔ ان ٹیکسی ڈرائیوروں میں سے یک مجھے فون کرانے کے لئے ریلوے اسٹیشن کی عمارت میں لے گیا، مغربی ملکوں میں فون کرنے کے لئے سفارش کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ صرف ٹوٹے ہوئے پیسو کی ضرورت ہوتی ہے۔ متذکرہ پاکستانی میرے ساتھ تو ٹیلی فون بوتھ تک میری رہنمائی کے لئے گیا اور دوسرے وہ نہیں چاہتا تھا کہ فون کرنے کے لئے مجھے چینج کی خاطر دوسروں کا دست نگر ہونا پڑے۔

سردار جی گھر پر ہی تھے میری آواز سن کر کچھ اتنی گرم جوشی سے خوش آمدید کہا کہ بچی کھچی تھکن بھی دور ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد سردار شمشیر سنگھ ہمارے استقبال کے لئے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے، سرداروں کی جپھی میں بڑا خلوص ہوتا ہے۔ اس کا ایک مظاہرہ میں نے دہلی میں شمشیر سنگھ شیر کے ساتھ اپنے اعزاز میں منعقدہ دعوت کے موقع پر بھی دیکھا تھا۔ دعوت میں موجود سردار ہم پاکستانی مہمانوں کے ساتھ معانقہ کرتے تو جس طرح سے چینی اور اس وقت تک باتھ نہیں چھوڑتے جب تک مہمان خود نہ باتھ چھڑانا چاہے اسی طرح ہمارے یہ سردار دوست بھی دہلی میں جب ہم سے معانقہ کر رہے تھے تو لگتا تھا ان کے دلوں میں موجود محبت ان کے سینوں سے شعاعوں کی طرح پھوٹ کر براہ راست ہمارے سینوں میں سرایت کرتی جا رہی ہے۔

بلکہ اس محفل میں موجود ایک نوجوان سردار ادیب مجھے کبھی نہیں بھولے گا، مجھے اس کا نام تو یاد نہیں، لیکن اس کی یہ ادا یاد ہے کہ مجھے سے گلے ملتے وقت اپنی محبت کے اظہار کے لئے جب اسے کوئی طریقہ سمجھ نہ آیا تو اس نے پہلے بسم اللہ پڑھی، پھر کلمہ طیبہ کار ورد کیا اور اس کے بعد معانقے کے دوران پوری الحمد شریف تلاوت کر گیا۔

سردار شمشیر سنگھ نئے مجھے گھٹ کرجبھی ڈالی اور پھر ان کی سربراہی میں ہم سب لوگ ترغیب بلند نقوی کے گھر پہنچ گئے جہاں پہلے سے دوست جمع تھے۔ ترغیب بلند نقوی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی البتہ کوپن بیگن کے اس مشاعرے کے سلسلے میں فن پر ان سے بات ہوئی تھی اور اب یہ انتہائی دلچسپ شخصیت میرے سامنے کھڑی تھی۔

موصوف مسلسل بولتے چلے جاتے ہیں لیکن ایک منافق کی خاموشی کے مقابلے میں ایک کھرے آدمی کا بولنا بلکہ بولتے چلے جاتا یقیناً ایک احسن فعل ہے۔ کوپن بیگن اور اس کے بعد اوسلو میں بھی ترغیب بھائی سے مسلسل ملاقاتوں کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ شخص قابل محبت ہے۔

ان کی باقی خصوصیت کا ذکر بعد میں آئے گا کہ اس سے پہلے یہ بتاتا بھی ضروری ہے کہ لندن سے عاشور کاظمی اور باقر نقوی ہم سے پہلے اہل و عیال کے ساتھ کوپن بیگن پہنچ چکے تھے چنانچہ ترغیب بھائی کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی جب ان پر نظر پڑی توہم لوگ ایک دوسرے سے کچھ اس طرح ملے جیسے صدیوں بعد ملے ہوں۔

سویڈن کے خوبصورت نوجوان شاعر جمیل احسن سے بھی یہاں ملاقات ہوئی۔ میں جمیل احسن کی غزلیں فنون میں پڑھتا رہا ہوں۔ اپنے برادر طارق عسکری بھی موجود تھے۔ طارق عسکری یار عزیز زاہد ملک کے پچرے حرمت سے بطور بیورو چیف کوپن ہیگن وابستہ ہیں۔ حضرت شاہ یہاں بھی وہاں بھی مجھے یہاں سب سے زیادہ حیرت اور خوشی حضرت شاہ کو دیکھ کر ہوئی، حضرت شاہ برسوں سے برطانیہ میں مقیم ہیں۔ میں جب پاکستان سے یورپ کے مشاعروں کے لئے روانہ ہونے والا تھا، اس وقت ان سے میری ملاقات لاہور میں ہوئی تھی، ان کا خوبصورت شعری مجموعہ بے گھر آنکھیں، ترتیب و تدوین کی منزلوں سے گزر رہا تھا، اور انہوں نے اس شعری مجموعے کا دیباچہ لکھنے کا کام میرے سپرد کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ حضرت شاہ کوپن ہیگن والوں سے وعدہ کر چکے تھے کہ ان کے مشاعرے میں ضرور شریک ہوں گے۔

چنانچہ پاکستان میں سب کام چھور کر موصوف سیدھے لندن پہنچے اور وہاں سے اپنے گھر بریڈ فورڈ جانے کی بجائے کوپن بیگن کا ٹکٹ کٹایا اور اب ترغیب بھائی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے کچھ اس طرح چمک رہے تھے جیسے مقامی شاعر ہوں۔ یہاں میری ملاقات ایک محنتی اور خاموش شخص کے ساتھ بھی ہوئی۔

ارے یہ تو حسن عابدی ہیں، بہت پرانے ترقی پسند دانشور، جیلیں بھی کاٹیں۔ تکلیفیں اٹھائیں مگر اپنے موقف سے دستبردار نہیں ہوئے۔ مجھے اس قسم کے نظریاتی لوگ پسند ہیں، جن کا تعلق خواہ کسی بھی نظریے سے ہو مگر وہ اس نظرئیے سے مخلص ضرور ہوں۔ حسن عابدی میرے دوست خالد احمد کے بہنوئی بھی ہیں اور یوں ان کے ساتھ احترام کا ایک رشتہ یہ بھی تھا، لہذا کوپن ہیگن اور اس کے بعد اوسلو میں مسلسل ملاقاتوں کے باوجود ان سے زیادہ بے تکلفی کی نوبت نہیں آئی۔ خدا جانے ہم دونوں

میں اسے کس کی خوش قسمتی قرار دیا جا سکتا ہے ؟ کوپن ہیگن میں ہن نے تین دن بسر کئے۔

ان تین دنوں کا کچا چھٹا تو میں بعد میں بیان کروں، پہلے آپ کو کوپن ہیگن کے مشاعرے کا احوال سنا لوں جو بزم ادب کے زیر اہتمام قطب شمالی کے اس شہر میں منعقد ہوا جو کبھی دائی کنگز کا مرکز تھا۔

موجودہ ڈینش لوگ انہی والی کنگ کی اولاد ہیں اور دیکھا جائے تو کتنے نا خلف ہیں بہر حال اب اسی شہر کی ویسٹر بروکی کی رنکھو لائبریری میں انٹر نیشنل اردو مشاعرہ منعقد ہو رہا تھا اور ہال شائقین ادب سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، یہاں اچانک میری نظر ایک سانولے سلونے اور گول مٹول سے شخص پر پڑی۔ یہ مسعود منور تھا جو مرحوم ضیاء الحق کے زمانے میں فرار ہو کر افغانستان چلا گیا تھا۔ افغانستان سے بھارت جہاں وہ ایک پاکستان دشمن روزنامے ملاپ میں کالم لکھتا رہا، افغانستان اور بھارت دونوں پاکستان دشمنی میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

چنانچہ فہمیدہ ریاض ہو یا مسعود منور میرے لئے ان کے اس عمل کا جواز تلاش کرنا ممکن نہیں کہ اپنے ملک کے کسی حکمران کی دشمنی میں کسی دشمن ملک کی گود کو آغوش مادر سمجھ لیا جائے، چنانچہ فہمیدہ ریاض اور مسعود منور بھی بہت تپاک سے ملا بلکہ مشاعرے میں کلام سنانے سے پہلے اپنی تقریر میں وہ لاہور اور اپنے پرانے دوستوں کا ذکر کرتے ہوئے اتنا جذباتی ہو گیا کہ اس کی آواز رندھ گئی۔

اوسلو سے برادر عزیز جمشید مسرور اپنے مہمانوں کے سواگت کے لئے کوپن ہیگن پہنچے ہوئے تھے کیونکہ دو روز بعد اوسلو میں جو مشاعرہ منعقد ہونا تھا، اس کے مدار الہام وہی تھے۔ جمشید مسرور، حضرت مسرور کپور تھلوی کے صاحب زادے ہیں اور انہوں نے اپنے والد کے نام کو بٹ نہیں لگنے دیا۔ اگرچہ ان کا رنگ سخن اپنے والد سے بالکل مختلف ہے تاہم فنی پختگی انہیں اپنے والد ہی سے ورثے میں ملی ہے۔

چنانچہ یورپ میں مقیم شعراء میں وہ ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ میری ان سے ملاقات گذشتہ سے پیوستہ برس لاہور ہی میں ہوئی تھی ان چند ملاقاتوں میں جمشید کی دوستی کئی برسوں پر محیط محسوس ہوئی، جمشید کے ساتھ کوپن ہیگن اور اوسلو میں ہونے والی آوارہ گردیوں کا تذکرہ آگے آئے گا پہلے اس مشاعرے کا اہوال سن لیں جس کے لئے ہن نے اتنی طویل مسافت طے کی تھی۔ مشاعرے کی صدارت عاشور کاظمی کے سپرد تھی جبکہ مہمان خصوصی میں پاکستان سے بطور خاص مدعو کئے گئے ہم تین شعراء یعنی میں، حسن اور حسن عابدی تھے۔

نظامت کے فرائض پہلے ترغیب بلند نقوی اور پھر اسلام ساقی نے انجام دیئے۔ مشاعرے کا آغاز حافظ عظیم کی تلاوت کلام پاک سے ہوا اور نعت رسول مقبول سردار شمشیر سنگھ نے پیش کی، سردار صاحب اردو اور پنجابی غزل گو شاعر ہیں مگر میرے لئے یہ اطلاع انکشاف کا درجہ رکھتی تھی کہ وہ نعت گو بھی ہیں، یہاں انہوں نے جو نعت پڑھی اس پر انہیں بہت داد ملی۔ یہ ملنے کی گھڑی بھی کیا گھڑی

ہے کوپن ہیگن کے اس مشاعرے می سامعین کی پر جوش داد نے ہر شاعر کی آمد پر ایک سماں باندھ دیا تاہم جن شعراء کو خصوصی طور پر بہت داد ملی، ان میں اعجاز احمد اعجاز اور ترغیب بلند نقوی سر فہرست تھے۔ ترغیب بلند نقوی استاد قمر جلالوی کے انداز میں شعر کہتے ہیں ان کے مزے دار شعر سنیں۔

یہ ملنے کی گھڑی بھی کیا گھڑی ہے

اسے اپنی مجھے اپنی پڑی ہے

تڑپ اٹھیں گے سن کے وہ بھی نقوی

کہانی میں نے بھی ایسی گھڑی ہے

ترغیب بھائی نے اس مشاعرے میں صرف اپنی شاعری ہی سے رنگ نہیں جمایا بلکہ اپنے داد دینے کے مخصوص اور پر جوش اسلوب سے مشاعرے کو بھی کہیں کا کہیں پہنچا دیا اور یوں اس مشاعرے کی حیثیت یاد گار ہو گئی۔ مشاعرے میں داد دینا ہی فن نہیں بلکہ چوڑی دار پا جانے اور کالی اچکن میں ملبوس ترغیب بھائی کو داد دیتے دیکھنا اپنے طور پر ایک فن ہے اور اس کی تصویر کشی لفظوں میں نہیں کی جا سکتی، کسی حد تک ویڈیو فلم ہی سے اس تاثر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

مشاعرے میں پاکستان سے آئے ہوئے شعراء کے علاوہ یورپ کے مختلف ملکوں اور میزبان ملک ڈنمارک کے جن شعراء نے اپنا کلام سنایا ان میں بخش لائل پوری، ابرار حسین، جمیل احسن، جمشید مسرور، باقر نقوی، مسعود منور، اطہر راز، اعجاز احمد اعجاز، غلام عباس، وسیع الرحمان وسیع، امداد علی ڈوگر، سکھ دیو، سندھو، سن جیت سنگھ سندھو، تنویر احمد تنویر، حضرت شاہ، عابد علی عابد، مصطفے حسین مفتی، علی صفدر، ایوب خک، مقبول بھٹی، حافظ عظیم، محمد اقبال اختر، سردار شمشیر سنگھ شیر، اور افضل عباس شامل تھے۔ اسلام ساقی اور محمد اقبال اختر سے مشاعرے سے پہلے اور مشاعرے کے بعد بھی ملاقات ہوئی۔ محبتوں کے یہ سفیر بھی ایک عرصے سے دیار غیر میں آباد ہیں۔ اور پاکستان کو یاد کر کے ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہیں۔ آسائش، خوشی کے ہم معنی ہے ؟ سکینڈے نیوین کنٹریز کے بارے میں سنا بہت کچھ تھا مگر ان ممالک کو دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ان ممالک کی شہرت دو وجود سے ہے۔ ایک ان کی فلاحی مملکت ہونے اور دوسرے ان ممالک میں پائی جانے والی جنسی بے راہ روی کی وجہ سے فلاحی مملکت کے حوالے سے قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہاں انسانوں کی بنیادی ضروریات پوری کئے جانے کے بعد ان کے لئے زندگی کی بیشتر آسائشیں بھی مہیا کر دی گئی ہیں۔

لیکن خوشی آسائشوں کے ساتھ بہر حال مشروط نہیں ہیں، خوشیوں کا ایک تعلق علی نصب العین سے بھی ہوتا ہے، انسان جب عیش و عشرت ہی کو واحد نصب العین سمجھ بیٹھے، اس صورت میں تباہیاں اس کا مقدر بن جاتی ہیں، چنانچہ سیکنڈے نیوین کنٹریز میں خود کشی کی شرح میں اضافہ ہو گیا ہے کیونکہ آسائشیں زندگی کے مختلف

مراحل میں بتدریج حاصل ہون تو ایکسائٹمینٹ کا باعث بنتی ہیں۔ لیکن اگر یہ پیدائش کے فوراً بعد بیک مشت میسر آ جائیں تو باقی ساری زندگی مقصد سے جالی ہو جاتی ہے اور انسان موت کی خواہش کرنے لگتا ہے۔ ہمارے ہاؤ بھی امراء کے جو بچے سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوتے ہیں، ان میں سے اکثر ابنارمل ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے بیشتر ہونق پائیں گے۔ سیکنڈے نیوپن کنٹریز کے لوگ اکسائے ہوئے ہیں اور یوں یہ رحمت ان کے لئے زحمت بن گئی ہے۔

جہاں تک ممالک میں پائی جانے والی جنسی بے راہروی کا تعلق ہے، اس نے اب ایک مختلف شکل اختیار کر لی ہے۔ کوپن ہیگن کے گلی کوچوں میں گھومتے ہوئے قطعا یہ احساس نہیں ہوتا کہ ہم ایسے معاشرے کے افراد کے درمیان ہیں جو جنس کو ناشتے، لنچ یا ڈنر کی طرح ایک روٹین کی چیز سمجھتا ہے اور اس ضمن میں کسی قسم کے ٹیبو کا اسیر نہیں ہے، چنانچہ سڑکوں اور بازاروں میں کسی قسم کی کوئی چھچھوری حرکت دیکھنے میں نہیں آتی بلکہ بادی النظر میں یون محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کوپن ہیگن میں نہیں منصورے میں پھر رہے ہیں۔

البتہ ساحل سمندر یورپ کے دوسرے ساحلوں جیسے ہی ہیں یعنی یہاں بالائی لباس پہننا خاصا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اور جو برہنہ ساحل ہیں وہاں زیریں لباس بھی غیر اخلاقی حرکت کے زمرے میں آتا ہے۔ تاہم ایک کام ان ممالک میں اچھا ہوا ہے اور وہ یہ کہ طوائفوں اور دلالوں کا ایک حد تک خاتمہ کر دیا گیا ہے۔

یہاں وہ گھناؤ نے مناظر دیکھنے میں نہیں آتے جنہوں نے ہیمبرگ اور ایمسٹرڈیم کو خصوصی طور پر متعفن بنا دیا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق سیکنڈے نیوپن کنٹریز میں عورت کو جنس بازار بنانے کے خلاف شدید رد عمل ہوا ہے چنانچہ اس نوع کے اکا دکا منظر کے علاوہ یہ مکر وہ اور غلیظ آثار یہاں سے مٹا دیئے گئے ہیں۔ البتہ اس معاشرے کا ایک دو غلاپن، جسے سمجھنے سے قاصر ہوں وہ بلیو فلموں کی تیاری اور انہیں تیسری دنیا کے ممالک میں فروخت کرنا ہے۔ ان بلیو فلموں میں عورتوں پر ہر طرح کا جسمانی تشدد بھی دکھایا جاتا ہے، ان کے برہنہ جسموں پر کوڑے برسائے جائے ہیں حتی کہ لہو رسنے لگتا ہے۔ خونخوار کتے ان پر چھوڑ دیے جاتے ہیں اور اس کے علاوہ تمام ذلتیں ان کے نصیب میں لکھ دی جاتی ہیں جو ذہنی طور پر مردوں کے لئے لذت کا باعث ہو سکتی ہیں جن نظاموں کی بنیاد محض، جسمانی آسائشوں کے حصول پر ہو، اس نظام کے تحت تشکیل پانے والا معاشرہ بہت مہذب بھی ہو جائے تو شاید اس سے زیادہ مہذب نہیں ہو سکتا۔

کوپن ہیگن میں جن نئے دوستوں سے ملاقات ہوئی ان میں سے مشتاق بٹ اور ترلو چن خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ان دونوں میں کوئی قدر مشترک نہیں، مگر یہ دونوں مختلف حوالوں سے مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ ترلوچن، سردار شمشیر سنگھ کا داماد اور بین الاقوامی شہرت کا حامل ایک بڑا آرٹسٹ ہے۔ مشتاق بٹ میرے، گراں ماڈل ٹاؤن لاہور کا رہنے والا ہے۔ اس کے جسم میں بجلیاں بھری ہوئی ہیں۔ وہ پاکستانی فوج کا سابق کمانڈر ہے، اس کی بیوی ڈینش ہے۔ ترلوچن اور ساحل سمندر ترلوچن نے ہمیں

اپنے گھر چائے پر مدعو کیا اور مور اوور کے طور پر اپنا اسٹوڈیو بھی دکھایا۔ جب ہم لوگ سیڑھیاں اتر کر تہہ خانے میں پہنچے تو وہاں آرٹ کی ایک دنیا آباد نظر آئی۔ ترلوچن کی پینٹنگز ایک منفرد انداز کی حامل ہیں ان میں سے زیادہ تر دائروں کی صورت میں ہیں۔ ان کی معنویت تک رسائی کے لئے انہیں قدرے فاصلے سے دیکھنا پڑتا ہے۔ اس صورت میں ان پینٹنگز کی گہرائی اور وسعت کا صحیح طور پر اندازہ ہوتا ہے، یورپ کے ممتاز نقادوں نے اس کے کام کی کھل کر تعریف کی ہے اور کہا ہے ترلوچن وہ دکھانا چاہتا ہے جو دکھائی نہیں دیتا، ترلوچن ایک بڑا آرٹسٹ ہی نہیں ایک بہت اچھا انسان بھی ہے ہر بڑے آدمی کی طرح وہ بناوٹ اور تکبر سے پاک ہے ہم لوگ اس کی معیت میں ساحل سمندر تک گئے تو رستے میں دوران گفتگو اس کی شخصیت کی معصومیت نے بہت متاثر کیا لیکن ساحل سمندر پر دو تین ہزار مرد و زن کو ہیئت کذائی میں دیکھا اس سے ہماری اخلاقی صحت کے متاثر ہونے کا اندیشہ تھا، چنانچہ جلد سے جلد واپس گھر پہنچنے کی ٹھانی اور کھلی فضا میں کافی دیر تک لمبے لمبے سانس لئے تب کہیں جا کر اوسان بحال ہوئے۔

اوسلو کی ایک جھلک

اب ہماری اگلی اور آخری منزل اوسلو تھی۔ جمشید ہمارے استقبال کے لئے ایک روز پہلے اوسلو پہنچ گئے تھے۔ ویسے بھی مشاعرے کے مدار المہام ہونے کی وجہ سے سارے انتظامات بھی انہی کو کرنا تھے۔ ڈنمارک سے فیری میں بیٹھنے کے پندرہ منٹ کے بعد سویڈن آگیا۔ یہاں ہم مے فیری میں سے اپنی کار اتاری اور سڑک پر آ گئے۔ یہ غالباً اتوار کا دن تھا اور شاید صبح کے پانچ بجے تھے۔ ہم سویڈن کے شہر ہیلسنبرگ میں گزرے رہے تھے، اس کی گلیاں ویران پڑی تھیں۔ اس شہر تک پہنچنے کے لئے فیری کا سفر ہم نے بحر منجمد شمالی میں سے کیا تھا۔ عاشور کاظمی اور باقر نقوی اہل و عیال ہم سے اگلی کار میں تھے یہاں گاڑیوں میں پٹرول ڈلوانے کی ضرورت پڑ گئی مگر سب پٹرول پمپ بند پڑے تھے۔ جوینده یا بنده چنانچہ ہم نے بھی ایک پٹرول پمپ تلاش کر ہی لیا اور کار میں پٹرول بھروانے کے بعد ایک ریستوران میں ناشتے کے لئے داخل ہو گئے۔ آملیٹ، ڈبل روٹی اور گرم گرم کافی نے جسم کی زائل توانائی بحال کر دی اور ہم دوبارہ عازم اوسلو ہو گئے۔ یہاں سے ہم نے ای سکن ہائی وے پر گاڑی چڑھا دی اور گوٹن برگ سے گزر کر یوڈیولا سے ہوتے ہوئے سویڈن اور ناروے کی مشترکہ سرحد سوٹن سنڈ پہنچے اور ایک انتہائی خوبصورت منظر کو آنکھوں میں سومنے اور ایکپل کراس کر کے ناروے کے شہر سارپس برگ سے گزرے اور بالا آجر اوسلو میں داخل ہو گئے۔

یہاں ایک پاکستانی کی کبابوں کی دکان سے جمشید کو فون کیا جس دکان سے میں نے فون کیا وہ شاہی محل دفتر خارجہ بندرگاہ اوسلو اور قدیم شاہی قلعے کے بالکل پاس

تھی چنانچہ جمشید کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی اور یوں مردانہ وجاہت کا یہ خوبصورت نمونہ کچھ ہی دیر میں اپنے بازو وا کئے ہمارے سامنے کھڑا تھا۔

اوسلو میں ہمارا قیام دنیائے فانی کے چند روزہ قیام سے بھی کم تھا یعنی آج رات کو مشاعرہ پڑھنا تھا اور اگلے روز واپس لندن کے لئے روانہ ہو جانا تھا، تاہم اتنے کم وقت کے باوجود اپنے دوست پروفیسر مسعود ہاشمی کے بہنوئی اور انتہائی صاحب ذوق شخصیت افتخار حسین کی طرف سے دی گئی پر تکلف ضیافت میں بھی شرکت کی معروف افسانہ نگار ہرچرن چاولہ کے عصرانے میں بھی شریف ہوئے اور ریڈیو اوسلو این اور کے کے لئے اپنا انٹرویو بھی ریکارڈ کرایا جو سید ماجد علی اور ان کے ساتھیوں انیس احمد اور محمد اشرف نے ہم سے کیا۔

رات کو، رات کا لفظ صرف ٹائم کے حوالے سے کہا ورنہ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ جب ہم لوگ مرکزی اوسلو کی سی مفنش عمارت میں ساتویں منزل پر پہنچے جہاں ایشین آرٹ کونسل نے مشاعرے کا اہتمام کیا تھا تو ہال کو سامعین سے کچھا کچھ بھرا ہوا پایا۔ ایشین آرٹ کونسل ناروے میں موجود پاکستانیوں کی سب سے فعال ثقافتی تنظیم ہے۔ اس سے قبل یہ تنظیم پاکستانی ثقافت کے حوالے سے متعدد بھر پور تقریبات منعقد کرتی رہی ہے اور اس مشاعرے کی صورت میں تو اس تنظیم نے ایک ایسا پروگرام پیش کیا جو ناروے کی ادبی تاریخ میں یادگار رہے گا کیونکہ اس میں پاکستان سے مدعو کئے گئے تین شعراء کے علاوہ پورے یورپ سے اردو کے نامور شعراء شریک ہوئے۔ مشاعرے کی صدارت بخش لائل پوری نے کی اور متعدد مقامی شعراء نئے بھی اپنا کلام سنایا۔ جمشید مسرور بہت مضبوط اعصاب کے مالک ہیں سارے انتظامات کی فائنل ذمہ داری بھی انہی پر تھی اور نظامت کے ابتدائی فرائض بھی انہی نے انجام دینا تھے اور یہ سب کام انہوں نے پوری خوش اسلوبی سے انجام دیئے۔ مہمانوں کو خوش آمدید کہنے کے بعد انہوں نے نظامت کے لئے سردار شمشیر سنگھ شیر کا نام پکارا اور اس کے بعد یہ شیر اپنی خوبصورت سے نظامت مشاعرے کے کلائمکس کی طرف بڑھاتا چلا گیا اور جب مشاعرے کے اختتام کا اعلان ہوا تو سامعین کا جی نشستوں سے اٹھنے کو نہیں چاہتا تھا۔ اوسلو کی یہ حسین ترین شعری شام سامعین کے علاوہ شعراء کو بھی ہمیشہ یاد رہے گی۔

اوسلو کا شہر ہمارے ایبٹ آباد سے مماثلت رکھتا ہے۔ بشرطیکہ اس مماثلت میں سے ایبٹ آباد کی گندگی اور غربت نکال دی جائے چنانچہ مشاعرے اور ڈنر کے بعد جب ہم لوگ ایک پہاڑی پر واقع جمشید مسرور کے گھر داخل ہوئے تو بالکل یہی احساس ہوا جیسے ہم موسم گرما کی تعطیلات میں اپنے کسی عزیز کے ہاں ایبٹ آباد آئے ہوئے ہیں اور روبینہ بھابی کے پر جوش اور محبت بھرے برتاؤ نے ہمارے اس احساس کی تصدیق بھی کر دی کہ واقعی ہم اپنے قریبی عزیزوں کے درمیان موجود ہیں۔ اس وقت رات کا ایک بج چکا تھا۔ مگر اندھیرے کی بجائے ہلکی ہلکی روشنی ابھی تک موجود تھی، میں نے بھابی سے پوچھا کہ یہاں رات کب ہوتی ہے ؟ تو انہوں نے بتایا کہ ایک

گھنٹے کے لئے ہوتی ہے اور بس ایسی ہی ہوتی ہے جیسی نظر آ رہی ہے ان کی رات بھی صبح جیسی ہے اور ہماری صبحیں بھی راتوں جیسی کیوں ہیں ؟ اوسلو سے دو ڈھائی سو کلو میٹر کے فاصلے پر قطب شمالی کا وہ علاقہ شروع ہو جاتا ہے جہاں چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات ہوتی ہے۔ چنانچہ جولائی کے مہینے میں پوری دنیا کے سیاح آدھی رات کا سورج دیکھنے کے لئے وہاں جاتے ہیں۔ یہ وہی قطب شمالی ہے جس کے بارے میں ایک دل جلے شاعر نے کہا ہے۔

جی چاہتا ہے قطب شمالی میں جا بسیں

تنگ آ گئے ہیں روز کے شام و سحر سے ہم

میں روز کے شام و سحر سے تنگ آیا ہوا تو نہیں تھا مگر ایسے ہی جی چاہا کہ ذرا گھر سے نکلا جائے اور آدھی رات کو اوسلو کی سڑکیں ماپی جائیں۔ میں باہر نکلا تو ایک عجیب خوبصورت سی روشنی فضا میں پھیلی ہوئی تھی اور جون کے مہینے کے باوجود اچھی خاصی سردی بھی تھی۔ میں ڈھلوان سڑکوں کے نشیب و فراز اور اپنے خیالات میں گم کہیں کا کہیں نکل گیا۔ ان لمحوں میں شعیب بن عزیز بہت یاد آیا۔

اب اداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں

اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں

اور جب اداسی نے مجھے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا تو میں سڑک کے کنارے واقع انٹرنیشنل ٹیلی فون بوتھ میں داخل ہو گیا اور ٹیلی فون ڈائل کرنے لگا۔ بہت کم وقت میں، میں جتنا اوسلو دیکھ سکا، میرے خیال میں میری میلی نظریں اتنی خوبصورتی کی مستحق نہیں تھیں۔ یہ شہر نہیں اپنے خوبصورت مناظر کی وجہ سے جنت کا گوشہ لگتا ہے۔ اس شہر کی آبادی جھیلوں پر گھنے اور گہرے درختوں آبشاروں، پھولوں اور رنگ برنگے پرندوں کی چہکاروں پر مشتمل ہے اور انسان تو قدرت کے ان نظاروں کا صرف تماشائی ہے۔ اوسلو سے قدرے فاصلے پر ایک عجیب و غریب پہاڑ ہے جو انجنئیرنگ کا ایک محیرالعقول کارنامہ ہے۔ اس پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنے کے لئے پہار کے اندر ہی اندر راستہ بنایا گیا ہے اور پانچ سات منٹ کی اندرونی ڈرائیو کے بعد آپ پہار کی چوٹی پہ پہنچ جاتے ہیں جہاں ایک وسیع پارک آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔ اس چوٹی سے شہر کا نظارہ خصوصاً رات کے وقت انسان اور فطرت کی مشترکہ حسن گری کا ایک خوبصورت ثبوت پیش کرتا ہے۔ اوسلو میں مجسموں کا ایک باغ بھی بت تراش کر رکھے ہوئے ہیں جم میں بیشتر مرد کے برہنہ حسن کو پیش کرتے ہیں۔ یہ سنگ تراش یقیناً یونان سے ہجرت کر کے یہاں آیا ہو گا۔ علاوہ ازین اوسلو سے تقریباً سو کلو میٹر کے فاصلے پر دنیا کا آخری کنارہ بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے

آگے بحر منجمد شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر واقعی یوں لگتا ہے جیسے حقیقتاً دنیا یہاں ختم ہو گئی ہے۔ عجیب طرح کی نوکیلی چٹانیں اور ایک نامانوس قسم کی اداسی یہاں بلندی پر ایک دوربین لگائی گئی ہے اور اس دوربین میں سے جو کچھ نظر آتا ہے وہ یہی کہ ہے آگے کچھ نہیں۔

اوسلو کے یہ سب خوبصورت نظارے اپنی جگہ لیکن انسان یہاں بھی اپنے بنائے ہوئے نظام کے ہاتھوں بے بس ہے، ہزارہا بوڑھے لوگ اپنے پیاروں سے الگ ہیں۔ اور وہ اپنی موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کے سرہانوں پر ایک گھنٹی نصب کر دی گئی ہے تاکہ جب وہ مرنے لگیں اس گھنٹی پر انگلی رکھ دیں، جس سے متعلقہ اداروں کو اطلاع ہو جائے گی اور ان کی میت اٹھا کر لے جائیں گے۔ مجھے یہ جنت بھی منظور نہیں۔

اوسلو میں گزرے ہوئے یادگار لمحے

جب بھی ناروے کا ذکر آتا ہے، حضرت زیبا ناروی یاد آ جاتے ہیں۔ ایک دفعہ لاہور کے ریڈیو اسٹیشن پر ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے از راہ تفنن کہا زیبا ناروی صاحب اردو کے کیا کہنے ناروے تک جا پہنچتی ہے۔ یہ سن کر مرحوم نے کپوری سنجیدگی سی مری معلومات کی تصحیح کی اور مجھے بتایا کہ ان کا تعلق ناروے سے نہیں یوپی کے ایک گاؤن نارو سے ہے او وہ اسی حوالے سے ناروی کہلاتے ہیں۔ تاہم حقیقت یہی ہے کہ اردو ہی نہیں پنجابی، پشتو، بلوچی اور سندھی زبانیں بھی اب دنیا کے ہر خطے میں پہنچ چکی ہیں جہاں یہ زبانیں بولنے والے لوگ جا بسے ہیں چنانچہ ناروے میں بھی اردو اور دوسری پاکستانی زبانوں کے حوالے سے سال بھر ثقافتی سرگرمیوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ چند ماہ بیشتر جب احمد ندیم قاسمی، مظفر وارثی۔ امجد اسلام امجد، حسن رضوی۔ سعادت سعید اور راقم الحروف برطانیہ سے ہوتے ہوئے ناروے پہنچے تو اوسلو کی ایک تقریب میں احمد ندیم قاسمی نے ایک بہت مزے کی بات کہی۔ انہوں نے کہا کہ ناروے میں کھاریاں کے اتنے لوگ نظر آتے ہیں کہ اب ناروے کا نام کھاروے رکھ دینا چاہئے۔ اس کھاروے میں ہمارا قیام ایک ہفتے کا تھا جمشید مسرور، افتخار حسین، ارشد پرویز اور اپنے حضرت شاہ کی معیت میں یہ سات دن چٹکی بجانے میں بسر ہو گئے، حضرت شاہ ہماری ہی طرح جمشید مسرور کے مشاعرے میں شرکت کے،لئے برطانیہ سے اوسلو پہنچے تھے چنانچہ ان کی کمپنی مور اوور کے زمرے میں آتی تھی اور اس مور اوور نے اوسلو میں ہمیں بہت مزا دیا۔ سب سے پہلے مجھے چاہئے کہ میں آپ کا تعارف افتخار حسین سے کراؤں افتخار کا تعلق فیصل آباد سے ہے۔ موصوف اوسلو کی سیاسی، سماجی، ثقافتی اور ادبی حلقوں کی معروف شخصیت ہیں۔ ان کا ریستوران کا کاروبار ہے۔ پیزا اٹلی کی ایک مشہور ڈش ہے جو اب پوری دنیا کی طرح پاکستان میں بھی مقبول ہے۔ افتخار حسین کے

ریستوران میں بندے پہ بندہ چڑھ ہوتا ہے۔ افتخار ہمارے ایک شاعر اور نقاد دوست سید مسعود ہاشمی کے بہنوئی بھی ہیں اوسلو میں ان کا ایک ہمزاد ہے جس کا نام ارشد پرویز ہے۔ ارشد پرویز پنجابی کے خوبصورت شاعر ہیں۔ افتخار اور پرویز اتنے لازم و ملزوم ہیں کہ انہیں الگ الگ نام پکارنے کی بجائے بیک بیک وقت افتخار پرویز یا پرویز افتخار بھی کہا جا سکتا ہے بلکہ بہتر ہو کہ نام کی ترتیب وہ باہمی فیصلہ سے خود متعین کریں۔ اگر اوسلو میں ان دوستوں سے ملاقات نہ ہوتی تو اس شہر بلکہ پورے ملک کی خوبصورتی کے بارے میں جو کچھ سن رکھا تھا، اس کی حیثیت صرف شنید تک رہتی۔ میں نے اوسلو اور اس کے گرد و نواح کا بے حد حسین علاقے افتخار کی رفاقت میں دیکھا چنانچہ یہ شعر موصوف پر پوری طرح صادق آتا ہے۔

میں جا رہا تھا شہر نگاراں کو چھوڑ کر

اچھا ہوا کہ تم سے ملاقات ہو گئی

اوسلو واقعی شہر نگاراں ہے۔ یہ پہاڑوں مرغزاروں اور جھیلوں کا شہر ہے۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ پورا ناروے ایک انتہائی خوبصورت باغ ہے۔ جس میں سے سڑکیں گزرتی ہیں۔ افتخار نے مشاعرے میں شرکت کے لئے آئے ہوئے شعراء کو دنیا کا آخری کنارہ دکھانے کا پروگرام بنایا۔ یہ دنیا کا آخری کنارہ اوسلو سے تقریباً سو کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ جمشید مسرور، مظفر وارثی ، بلراج کومل، امجد اسلام امجد، ف۔ س۔ اعجاز، فاطمہ حسن، حسن رضوی، سعادت سعید، بلبل کاشمیری،حضرت شاہ اور دوسرے دوست دنیا کا آخری کنارہ دیکھنے کے لئے اوسلو سے روانہ ہوئے۔ سارا راستہ قدر حسین تھا کہ آنکھیں نظارے دیکھتے ہوئے ان کو اوجھل ہونے کے اندیشے میں مبتلا رہتی تھی۔ اس علاقے کو اللہ تعالی جو حسن بخشا ے اور یہاں کے لوگوں نے نفاست طبع سے اس میں نزاکت بھی بھر دی ہے۔ جب ہم لوگ دنا کے آخری کنارے پر پہنچے تو ہمارے سامنے ایک سمندر تھا جس کے ارد گرد ٹیلے اور عجیب نوکدار قسم کی چٹانیں تھیں۔ یہاں کی فضا میں یہ احساس رچا بسا تھا کہ واقعی یہ دنیا کا آخری کنارہ ہے۔ اس کے آگے بحر منجمد شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں ایک احساس یہ بھی ہوتا ہے جیسے دنیا بھی ابھی وجود میں آئی ہے اور ہم کسی دوسرے سیارے سے آئے ہوئے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس زمین پر پہلی دفعہ قدم رکھا ہے۔ افتخار حسین اپنے ساتھ ویڈیو کیمرہ بھی لائے تھے چنانچہ ہم نے یہاں جو وقت گزارا، انہوں نے اس کا ایک ایک لمحہ سلو لائیڈ پر منتقل کیا۔ اوسلو میں ہمارے میزبان جمشید مسرور نے اس شہر بے مثال میں ہمارے ہفتے کے قیام کو آرام دہ بنانے کے لئے اتنا مصروف رکھا کہ تقریباً ہر دن کسی استقبالئے اور ہر رات کسی عشائیے میں بسر ہوتی بلکہ وقت کی کمی کی وجہ سے اوسلو کی بہت سی تنظیموں اور سرکردہ شخصیتوں کو جمشید مسرور سے یہ گلہ بھی پیدا ہو ا کہ ان کے لئے گنجائش نہیں نکالی گئی حالانکہ اس سے زیادہ گنجائش نکالنا ممکن ہی نہیں تھا۔ البتہ افتخار حسین نے ایک دوپہر پر شب خون مارا اور مہمانوں کو اپنے ریستوران میں پیز کھلانے کے لئے لے گئے۔ میں دنیا

کے مختلف ملکوں میں پیز کھایا ہے۔ لیکن افتخار حسین نے اس ڈش کو مشرف بہ پاکستان کر کے اس کی عزت میں اتنا اضافہ کر دیا ہے کہ نارویجین اس پیزے کے عشق میں مبتلا ہو گئے ہیں چنانچہ ہم لوگ افتخار کے ریستوران میں پہنچے تو اس کے تھوڑی ہی دیر بعد لنچ ٹائم ہونے کی وجہ سے نارویجن جوق در جوق پیزا کھانے کے لئے اس ریستوران میں پہنچنا شروع ہو گئے مگر اس روز انہیں گیٹ ہی سے واپس جانا پڑا کیونکہ افتخار نے ہمارے اعزاز میں ڈھیر سارے مہمانوں کو مدعو کر لیا تھا اور اس ریستوران کی سبھی نشستیں پر ہو چکی تھیں۔ ۔ اسی طرح ایک روز افتخار مجھے، امجد اور حسن کو اغوا کر کے ساحل سمندر پر لے گئے جہاں ارشد پرویز نے باقاعدہ غسل آفتابی کیا اور ہم لوگ اپنے ساتھ لائی ہوئی دری پر بیٹھے کھابہ گیری کے ساتھ ساتھ ارشد پرویز اور دوسرے مشتاقان غسل آفتابی کو دیکھتے رہے۔ پاکستانی شعراء کے اعزاز میں ایک استقبالیہ پاکستانی تاجروں کی ایسو سی ایشن نیپا کی طرف سے بھی دیا گیا جس میں کثیر تعداد میں مہمانوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس تقریب میں جن لوگوں نے اظہار خیال کیا ان میں احمد ندیم قاسمی، مقامی کونسلر ساٹگور، شہ رگ کے ایڈیٹر مفتی عبدالغنی شاہ، کونسلر اطہر علی، انوارالحق، سعید ربانی، چودھری نذیر احمد اور قائد کے ایڈیٹر فضل حسین شامل تھے۔ نیپا کے صدر شیخ اورنگزیب اور اسٹیج سیکریٹری قیصر سعید نے بہت والہانہ انداز میں مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ انہوں نے یہاں اپنے بعض مسائل پر بھی اظہار خیال کیا۔ ان مسائل کی نوعیت ایسی تھی کہ موجود حکومت پہلے سے ان کے حل کے لئے خواہاں تھی چنانچہ مجھے حسن ظن ہے کہ آئندہ چند ماہ میں صنعتی اور تجارتی طبقے کے اکثر مسائل حل ہو جائیں گے یا کم از کم ان کے حل کی طرف پیش قدمی ضرور ہو گی۔ یہاں اوسلو کی دو سرگرم عمل شخصیتوں کا خصوصی تذکرہ کرنا ضروری ہے۔ ان میں ایک قیصر سعید اور دوسری چودھری نذیر احمد ہیں۔ قیصر سعید یہاں کی ثقافتی تقریبات کے رواح رواں ہیں اور آئے روز کوئی نے نہ کوئی محفل سجاتے رہتے ہیں ان کی کمپئیرنگ کا انداز بھی جوب ہے۔ جہاں تک چودھری نذیر احمد کا تعلق ہے ان کی صورت میں ایک :منی مسلم لیگ" چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ جناح کیپ ان کے سر پر اور "نوائے وقت" ان کی بغل میں ہوتا ہے۔ اس طرح کی وضع داریاں نبھانے والے اب کم ہی لوگ رہ گئے ہیں۔ متذکرہ استقبالیہ اوسلو کے "کراچی ریستران" میں منعقد ہوا جس کے مالک میزبانی کے پر خلوص پاکستانی انداز برتنا جانتے ہیں۔

مہمانوں کے اعزاز میں ایک عشائیہ معروف افاسنہ نگار ہرچرن چاولہ کی طرف سے بھی تھا۔ ہرچرن چاولہ نے مہمانوں کے رستے میں آنکھیں ہی نہیں بچھائیں بلکہ جس رستے انہوں گزرنا تھا اس میں گھی کے چراغ بھی روشن کئے۔ خصوصاً احمد ندیم قاسمی کے لئے ان کے استقبال میں جو والہانہ پن تھا۔ اس سے چاولہ صاحب کی قاسمی صاحب سے اس محبت کا اندازہ ہوتا تھا جو وہ ان کے شعر و ادب اور شخصیت کے حوالے سے اپنے دل میں دکھتے ہیں۔ اپنی استقبالیہ تقریری میں بھی انہوں نے قاسمی صاحب کو زندہ ادیبوں میں سے سب سے بڑا افسانہ نگار اور شاعر قرار دیا۔ اس تقریب میں پچاس سے زیادہ مہمان مدعو تھے اور دو قسم کے کھانوں کا اہتمام کیا گیا تھا، ہندو کھانے کا اور مسلم کھانے کا۔ ہندو کھانا سبزیوں اور مسلم کھانا حلال گوشت

کی مختلف اقسام پر مشتمل تھا۔ پروفیسر جگن ناتھ ایک دفعہ پاکستان آئے تو ان کے اعزاز میں ایک میزبان نے کھانے کا اہتمام کرتے ہوئے آزاد صاحب کے مذہب کو مد نظر رکھا چنانچہ کھانے کی میز پر حد نظر تک سبزیاں ہی سبزیاں اور دالیں ہی دالیں تھیں۔ آزاد منش آزاد صاحب نے بے چارگی سے یہ منظر دیکھا ا ور پھر میزبان سے کہا برادر اگر آپ پاکستان میں بھی اسی قسم کی چیزیں پکانا تھیں تو پھر آپ کو پاکستان بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ بہر حال چاولہ صاحب کی دعوت بہت پر رونق رہی کہ یہاں دوستوں سے کھل کر گپ شپ کا موقع بھی ملا۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد بھی اس محفل میں موجود تھے مگر جب اسے ان کا اقبالیات اور دوسرے موضوعات پر کیا گیا بہت سا تحریری کام جموں کے سیلاب کی نذر ہوا ہے وہ کچھ بجھے بجھے لگتے ہیں تاہم اس محفل میں وہ اپنے غم کو بھلا کر طوطی خوش مقال بنے رہے۔ اوسلو میں مہمانوں کے اعزاز میں جن دوسرے دوستوں نے عشائیوں اور ظہرانوں کا اہتمام کیا ان میں رضا خان، الطاف حسین، نجیب نقوی اور نعیم کھوکھر بھی شامل تھے۔ نعیم کھوکھر پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنماؤں میں سے ہیں اور ایک عرصے سے ناروے میں مقیم ہیں۔ رضا خان کے گھر میں ہونے والی دعوت میں فیملیز بھی شریک ہوئیں اور یوں کچھ ایسے لگتا تھا جیسے کوئی شادی کی تقریب ہو رہی ہے۔ ان تمام تقریبات کے "دولہا" جمشید مسرور تھے۔ انہیں ہر استقبالیئے اور عشائیے میں دولہا کی طرح رسیو کیا جاتا تھا۔ ان کے ساتھ ان کی بیگم روبینہ جمشید بھی گھر کے سب کام کاج چھوڑ کر ان تقریبات میں پیش پیش ہوتیں، ثقافتی سرداریوں کا سہرا باندھنے کے لئے یہ قربانیاں تو دینا پڑتی ہیں۔ اوسلو اورا سکے گرد نواح میں دو مقامات بطور خاص قابل دید ہے۔ ان میں سے ایک درامن شہر کی پہاڑی پیرالن ہے جہاں ہم جمشید مسرور کی معیت میں گئے۔ اس پہاڑی کے ضمن میں انجنئیرنگ کا کارنامہ یہ دکھایا گیا ہے کہ اس کی چوٹی تک پہنچنے کے لئے پہاڑی کے اندر ہی ایک کشادہ شرک بنائی گئی ہے۔ جس پر ڈرائیو کرتے کرتے آپ اچانک اس کی چوٹی پر پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں ایک خوش نما پارک آپ کا منتظر ہے اور جہاں سے درامن شہر کا نہایت خوبصورت نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ عجوبہ آج سے تقریباً ایک سو برس بیشتر تعمیر کیا گیا تھا۔ اوسلو میں فرد گز پار کبھی سیاحوں کے لئے بہت کشش رکھتا ہے۔ یہاں سینکڑوں کی تعداد میں انسانی مجسمے بنائے گئے ہیں اور مجسموں کا یہ شہر تعمیر کرنے والا ایک ہی سنگ تراش ہے جس کا نام ورجیلان تھا۔ ان تمام تقریبات، عشائیوں اور سیاحت کے علاوہ خالص بے مقصد آوارہ گردی ہم نے ممتاز آوارہ گرد حضرت شاہ کے ساتھ کی۔ حضرت شاہ اللہ تعالی کے ان بندوں میں سے ہے جہنیں بناتے ہوئے صرف خلوص کا میٹریل استعمال کیا گیا ہے۔ وہ اندر سے اتنا خوبصورت انسان ہے کہ اوسلو میں اس کے ساتھ گھومتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ وہ اوسلو کی خوبصورتیاں دیکھ رہا ہے اور اوسلو کی خوبصورتیاں اسے دیکھ رہی ہیں۔

ٹچکریاں کھرا اور گتاوا کیا ہوتا ہے ؟

جدا تو انسان کو ہونا ہی ہوتا ہے، جسم سے روح اور پھول سے خوشبو بھی تو جدا ہو جاتی ہے۔ اوسلو پر تو ہمارا حق بھی کوئی نہیں تھا اور اس نگر نے اپنے مہمان کے دسترخوان پر اپنے سارے مرغزار، جھیلیں اور پھول سجا دیئے تھے چنانچہ یہ مسافر جمشید مسرور کے ساتھ معانقہ کر کے اعجاز کی اسٹیشن ویگن میں اپنی اپنی نشستوں پر براجمان ہو گئے مگر جمشید ہمیں بھٹکنے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ہمیں منزل پر ڈال کر آنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے اپنی گاڑی ہمارے آگے لگا لی اور پھر اوسلو کے گلی کوچوں اور اس کے مکینوں سے اپنی آنکھیں سیراب کرتے ہوئے قریب پون گھنٹے میں ہم لوگ یورپ کو جانے والی ہائی وے پر کھڑے تھے۔ جمشید سے ہم نے ایک بار پھر معانقہ کیا اور پھر یہ مسافر ہائی وے کی تیز رفتار ٹریفک میں گم ہو گئے۔

کہاں چلا جائے ؟ اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے صدیق نے یورپ کا نقشہ اپنے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔ داہنے ہاتھ چلا جائے۔ ابرار مسلسل کیپ رائٹ والی ڈیوٹی نبھائے جا رہا تھا آجر جان کسے عزیزی نہیں ہوتی۔ وہ تو ٹھیک ہے اعجاز نے جھنجھلا کر کہا مقصد یہ ہے کہ واپس لندن پہنچنے کے لئے کون سا روٹ اختیار کیا جائے ؟ کچے روٹ کے علاوہ سب روٹ ٹھیک ہیں۔ حسن نے سیب کھاتے ہوئے کہا جو اس نے ابھی ابھی ابرار کے خوراک کے خفیہ ٹھیلے میں سے نکالا تھا۔

یار تم لوگ خدا کے لئے کبھی سیریس بھی ہو جاؤ بخش لائل پوری کی اونگھتی ہوئی آواز سنائی دیل پہلے طے کر لو کہاں جانا ہے یہ ٹچکریاں بعد میں کر لینا۔ بخش بھائی یہ ٹچکریاں کیا ہوتا ہے ؟ اطہر راز نے اپنی شخصیت کی پوری معصومیت سے پوچھا۔ اتے بڑے ہو گئے ہو اور تمہیں ابھی تک ٹچکریاں کا نہیں پتہ؟ تمہیں اپنی زندگی پر شرم آنی چاہئے ابرار کو تو ایسا موقع خدا دے۔ ابرار بھائی میں تو اپنی زندگی پر پہلے ہی شرمندہ ہوں اطہر راز نے بھولپن سے کہا، چنانچہ اگر آپ نے مجھے ٹچکریوں کا مطلب نہ بتایا تو خواہ مخواہ مزید شرمندہ ہو گا۔
مسئلہ سیریس تھا چنانچہ ہم تمام پنجابی کے اہل زبان سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور اس مسئلے پر غور و فکر شروع ہو گیا۔ یوں لگتا تھا پنجابی ادبی بورڈ کا اجلاس ہو رہا ہے بلآخر یہ بورڈ خاصی بحث و تمحیص کے بعد ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ ابرار نے فیصلے کا اعلان کیا، ٹچکریاں کا ایگزیکٹ مطلب تو ہمیں علم نہیں البتہ اس لفظ کو خوش فعلیاں سے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اب تم مزید سوال نہیں کرو گے ورنہ تم ہم سے کھرے کا مطلب بھی پوچھو گے۔ خدا کے واسطے مجھے بتائیں یہ کیا ہوتا ہے ؟ اطہر راز نے کچھ اتنی لجاجت سے یہ بات کہی کہ میری ہنسی نکل گئی۔

اطہر بھائی میں آپ کو بتاتا ہوں میں اس ساری گفتگو میں پہلی دفعہ داخل دیتے ہوئے بلکہ دخل در معقولات دیتے ہوئے کہا کھرا گھر کے صحن میں بنی ہوئی اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کپڑے وغیرہ دھوئے جاتے ہیں اب آپ یہ بتائیں اسے اردو میں کیا کہتے ہیں؟ چوبچہ اطہر راز نے ماسٹر سے اجازت لینے کے انداز میں ہاتھ کھڑا کرتے ہوئے کہا۔ اوئے گھوڑے کے بچے ابرار کو پھر موقع مل گیا چوبچہ تو وہ جگہ ہوتی ہے جہاں جانور پانی پیتے ہین< کھرلی اطہر راز نے کھرے کا ایک اور متبادل تجویز

کیا۔ خدا کے لئے چوپالیوں کی برادری سے نکل آؤ ابرار موقع سے پورا پورا فائدہ اتھا رہا تھا کھرلی تو وہ جگہ ہوتی ہے جہاں گائے بھینس گتاوا کھاتی ہیں ابرار بھائی یہ گتاوا کیا ہوتا ہے ؟ یہ تو تم نے بہت آسان بات پوچھی ہے۔ ابرار نے ہنستے ہوئے کہا، دوپہر کو جب ہم دسترجوان پر بیٹھیں گے تو دیکھنے والے ہمارے بارے میں کہیں گے ہم کھانا کھا رہے ہیں مگر تمہارے بارے میں کہا جائے گا اطہر راز صاحب گراوا فرما رہے ہیں .

ٹچکریاں کھرا اور گتا واکیا ہوتا ہے ؟

یار ابرار صاحب اپ تو ہر وقت اطہر بھائی پر چڑھائی کی فکر میں رہتے ہیں اپ نے انہیں نئے چکر میں ڈال دیا ہے، اطہر بھائی آپ اس چکر میں نہ آئیں، ہمیں تو آپ یہ بتائیں کہ اردو میں کھرے کے لئے کیا لفظ ہے۔ آپ سب لوگ بھاڑ میں جائیں اور میں اس موقع پر جو ایک اہم اعلان کرنا چاہتا ہوں صرف وہ غور سے سنیں۔ اطہر راز نے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

ارشاد ہم سب ہم تن گوش ہیں، حسن نے سیب کھانے دوران پیدا ہونے والی کچر کچر کی آواز کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ کہاں ہیں خواتین؟ حسن نے بڑ بڑا کر پوچھا۔ اور خواتین و حضرات اطہر راز نے حسن کو لفٹ نہ کراتے ہوئے کہا وہ اعلان یہ ہے کہ اردو میں کھرا ہوتا ہی نہیں ہے۔ آپ نے جو کرنا ہے کر لیں وما علینا الا البلاغ۔

اعجاز کی آواز آئی۔ آپ حضرات کو علم ہے کہ آپ کو ان خوش فعلیوں ---ٹچکریوں-- اطہر نے اصلاح کی۔ اعجاز کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ہاں ٹچکریوں کی وجہ سے ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہو پایا کہ ہم نے واپسی کے لئے روٹ کون سا اختیار کرنا ہے۔ چنانچہ فی الحال میں اللہ توکل چلے جا رہا ہوں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ہالینڈ کی طرف سے چلا جائے کیونکہ آتے ہوئے ہم ایمسٹرڈیم کو پرے چھوڑ کر گزر گئے تھے میں نے تجویز پیش کی۔ سب نے اس تجویز کو پسند کیا چنانچہ اب ہم اایمسٹردم کی طرف رواں دواں تھے اگرچہ گزرنا ہمیں مغربی جرمنی ہی سے تھا۔

اب پھر وہی ہائی وے تھی۔ شاں شاں کرتی ہوئی ٹریفک تھی، ہر تیس چالیس میل کے بعد سرائے تھی جسے سروس کہا جاتا ہے۔ اور جہاں خوبصورت ریستوران، جنرل اسٹور، پٹرول پمپ، صاف ستھرے باتھ رومز اور قطار اندر قطار انٹرنیشنل ٹیلیفون کی سہولت دستیاب ہوتی ہے۔ سوائے شراب کے کہ یورپین اقوام نے ہر اچھے برے کام کے لئے گنجائش نکالی ہے مگر اس کے کچھ آداب مقرر کر دیئے ہیں چنانچہ ہائی وے پر شراب فروخت نہیں کی جاتی تا کہ ڈرائیور حضرات غالب کا یہ شعر پڑھتے ہوئے کہیں غالب ہی سے نہ جا ملیں۔

نے ہاتھ باگ پر ہے نے پا ہے رکاب میں

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

دراصل مغرب میں نشے کی حالت میں ڈرائیونگ ایک سنگین جرم ہے یا یوں کہ لیں کہ نشے کی حالت میں اپنی کسی ٹریفک کی غلطی کی وجہ سے پکڑے جانا کوئی نیگ شگون نہیں چنانچہ شرابی حضرات کوشش کرتے ہیں کہ دوہری غلطی نہ کریں یعنی شراب نوشی کے دوران دوسری کاروں سے متھا نہ لگاتے پھریں۔ مگر کوشش تو صرف کوشش ہوتی ہے۔ ضروری تو نہیں کہ اس میں کامیابی بھی ہو کیونکہ یہ رند اپنی اس کوشش میں اگر اتنے کامیاب ہوتے تو ہر سال کرسمس اور نیو ایئر ایو پر سینکڑوں لوگ سڑکوں پر شراب نوشی کی بھینٹ نہ چڑھتے۔

یہ ہالینڈ ہے

مغربی جرمنی کی حدود سے نکلنے کے بعد اب ہم ہالینڈ کی حدود میں داخل ہو رہے تھے۔ یہاں سفید فام مسافر تھوڑی دیر کے لئے بریک لگاتے اور پھر امگریشن والوں کو ویو کرتے ہوئے گزر جاتے مگر ہم "کالو" کو روک لیا گیا۔ میرے اور حسن کے علاوہ باقی سب کے پاس برٹش پاسپورٹ تھے مگر انہیں بھی خوردبین لگا کر چیک کیا گیا۔ آپ دونوں حضرات نیچے اتر آئیں۔ امگریشن آفیسر نے بناوٹی خوش اخلاقی کی ضرورت بھی محسوس نہ کی اور مجھے اور حسن رضوی کو کھردرے لہجے میں اپنے پیچھے پیچھے آنے کو کہا۔ تھوڑی دیر بعد ہم اس کے آفس میں تھے بلکہ آفس میں تو وہ تھا، ہم شیشوں والی کھڑکی کے باہر اس کے سامنے مجرموں کی طرح کھڑے تھے۔ نیدر لینڈ،"ہالینڈ" میں تہماری انٹری غیر قانونی ہے۔ اس نے فرد جرم سناتے ہوئے کہا۔ وہ کیسے ؟ وہ ایسے

اس نے اپنے قانونی نکتے کی وضاحت کی، وہ غلط کہہ رہا تھا، میں نے اس غلطی کی نشاندہی کی تو اس نے کمپیوٹر پر انگلیاں مارنا شروع کر دیں وہ غالباً معلومات حاصل کر رہا تھا۔ اب کیا ہو گا ؟ حسن نے رندھی رندھی آواز میں پوچھا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں، خدا کو یہی منظور ہے کہ جو شخص ہمارے راستے میں کانٹے بو رہا ہے،اس کا منہ کالا ہو۔ تھوڑی دیر بعد پھر اس گورے منہ والے نے ہم دونوں کو مخاطب کیا مجھے افسوس ہے جنٹلمین تم نیدر لینڈ میں داخل نہیں ہو سکتے۔ تم لوگوں کو واپس جانا ہو گا، یہ کہتے ہوئے اس نے گہری نظروں سے ہم دونوں کا جائزہ لیا وہ یقیناً ان لائنو ں پر سوچ رہا تھا کہ یہ ہیروئن کے کوئی بین الاقوامی اسمگلر ہیں۔ ٹین ٹین حسن کی جیب سے ایک سگنل سنائی دیا امگریشن افسر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ یہ دراصل میوزک والا وہ "کی چین" تھا جو حسن نے لندن سے خریدا تھا ور اب جس پر غلطی سے حسن کا ہاتھ جا لگا تھا۔ لیکن ہم دونوں کے چہروں پر کوئی رد عمل نہ دیکھ کر اس نے غالباً یہ سمجھا کہ اسے کوئی آواز سنائی نہیں دی بلکہ یہ اس کا وہم ہے۔ میں نے ایک دفعہ پھر امگریشن افسر کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ قانونی موشگافیوں میں پڑ کر ہمارا وقت ضائع نہ کرے کیونکہ وہ سراسر زیادتی کر رہا ہے۔ اس پر اس نے ٹیلیفون اٹھایا اور اپنی زبان میں غالباً اپنے کسی افسر سے بات کرنے لگا تھوڑی دیر بعد اس نے فون رکھا اور ہم دونوں کے پاسپورٹ ہاتھ میں لئے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اب حسن کے علاوہ مجھے بھی گھبراہٹ شروع ہو گئی۔ وہ واپس آیا تو اس کے چہرے پر موٹے موٹے لفظو ں میں نو لکھا ہوا تھاوہ پاسپورٹ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے اس نے یہ لفظ زبان سے بھی ادا کر دیا البتہ از راہ عنایت فرما کہ میں تمہارے

پاسپورٹ منفی ریمارکس سے خراب نہیں کر رہا۔ بس اب تم لوگ شرافت سے اسی طرف لوٹ جاؤ جہاں سے اور ہے ہو۔

ہر پاکستانی ہیروئن کا اسمگلر نہیں

میں بہت ٹھنڈے دل و دماغ کا آدمی ہوں لیکن جب کبھی پارہ چڑھتا ہے تو پھر "طیش میں خوف خدا نے رہا" والی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، سو ان لمحات میں مجھ پر یہ کیفیت طاری ہو گئی چنانچہ میں نے نتائج کی پروا کئے بغیر اس پر چڑھائی کر دی۔

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تم سفید فام لوگ ہم لوگوں کو حقیر سمجھتے ہو اور ہمارے ساتھ تعصب کا مظاہرہ کرتے ہو۔ اپنے پریس کے پروپیگنڈے کے زیر اثر تم ہمیں بھی ہیروئن کے کوئی اسمگلر سمجھ رہے تو گے یا یہ کہ ہم اپنا وطن چھوڑ کر تمہارے ملک میں آباد ہونے کی نیت سے یہاں آئے ہیں، تمہارے یہ دونوں اندازے درست نہیں ہیں۔ ہر پاکستانی ہیروئن کا اسمگلر نہیں ہے۔ تھوڑی دیر پہلے سفید فاموں کی جو بس تمہیں ویو کرتے ہوئے گزری ہے ممکن ہے ان میں سے کچھ جرائم پیشہ لوگ ہوں مگر تم نے ان کے پاسپورٹ دیکھنے تک کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ہم دونوں کے لئے تمہارے لینڈ میں کوئی کشش نہیں ہے۔ ہم اپنے ملک میں لٹریچر کے پروفیسر ہیں، شاعر ہیں، ادیب ہیں آدھی سے زیادہ دنیا گھوم چکے ہیں۔ میں آج سے انیس برس پہلے بھی تمہارے ہالینڈ میں بھی آ چکا ہوں، میں نے تو عالم شباب میں بھی یہاں آباد ہونے کے بارے میں نہیں سوچا تھا، اب مجھے یہاں سے کیا لینا ہے۔ ہم تو روٹ بدل کر صرف ایمسٹرڈیم میں ایک رات بسر کرنے کے لئے ادھر سے گزرے تھے کہ چلو اس شہر سے تجدید ملاقات ہو جائے گی۔ لیکن اگر تمہیں ہم لوگوں سے اتنی ہی نفرت ہے تو پھر ہمیں بھی تم سے کوئی محبت نہیں۔ مغرب سے تعلقات کی وجہ سے ہمارے ملک پر مغربی استعمار کے حاشیہ برادر ہونے کا الزام بھی لگ گیا اور اس کے بدلے میں تمہاری طرف سے ہماری عزت افزائی کا یہ عالم ہے کہ ہمارے قانونی حق میں بھی کیڑے ڈال رہے ہو۔ ہمارے پاسپورٹ ادھر لاؤ، ہم زندگی بھر تمہارے ملک کا رخ نہیں کریں گے۔
میری اس تقریر کے دوران امگریشن افسر کے چہرے کے تاثرات بدلتے رہے، میں جانتا تھا کہ اب کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ میری اف گوئی کا مثبت اثر ہوا ہے اور نہ صرف یہ کہ ہمارے بارے میں اس کے تمام خدشات رفع ہو چکے ہیں۔ بلکہ وہ اپنے روئے پر تھوڑا بہت نادم بھی ہے۔ مغرب والوں کی جو ادائیں بہت اچھی ہیں، ان میں سے ایکیہ بھی ہے کہ وہ عموماً اپنے غلط موقف کا احساس ہونے پر اڑتے نہیں اور تلخ بیانی بھی برداشت کر لیتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں ایسے مواقع پر اس طرح بولنے والے کو "چھتر" بھی لگوائے جا سکتے ہیں۔

مجھے تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ تم لوگ پروفیسر، شاعر اور ادیب ہو، اب اس کے لہجے میں ملائمت تھی۔ ، ہم لوگ اہل علم کی قدر کرتے ہیں۔ باقی سفید فاموں کے بارے میں تمہاری رائے اسی طرح صحیح نہیں ہے۔ جس طرح میری وہ رائے صحیح نہیں تھی جو میں نے تم لوگوں کے بارے میں قائم کی تھی۔ حسن کے چہرے پر اس تمام عرصے میں پہلی دفعہ وہ مسکراہٹ نمودار ہوئی جس میں خوف کی جھلک نہیں تھی۔ میں نے بھی صورتحال کو نارمل کرنے کی غرض سے سے پاسپورٹ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا خدا کا شکر ہے کہ ہم دونوں غلط تھے۔

مگر میں پوری طرح غلط نہیں تھا۔ امگریشن افسر نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا تمہاری انٹری میں واقعی قانونی سقم ہے مگر تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میرے پاس ویزا لگانے کا اختیار ہے وہ میں لگا رہا ہوں اور ایک کام یہ بھی کر رہا ہوں کہ تم لوگوں سے ویزا فیس بھی وصول نہیں کر رہا۔ یہ میری طرف سے خیر سگالی کا ایک اظہار ہے۔

میں نے سوچا اب بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ویسے بھی بزرگوں کنے کہا ہے کہ انسان کو آم کھانے سے غرض ہونا چاہئے پیڑ گننے سے نہیں چنانچہ میں نے نہ صرف یہ کہ خاموشی اختیار کر لی بلکہ پاسپورٹ وصول کرتے ہوئے اس کے اس پر جوش مصافحے کو جواب اتنے پر جوش طریقے سے دیا کہ اس کا گٹ اترنے کا خدشہ پیا ہو گیا، غالباً لاشعور میں میرا غصہ قائم تھا۔

میں اور حسن واپس کار کی طرف آئے تو دوستوں کے اترے ہوئے چہروں پر رونق آ گئی۔ بخش نے پیار سے کہا، سی کھتے مر گئے سی جے ؟ بخش اور باقی دوستوں کے اطمینان کے لئے میں نے سارا قصہ تفصیل کے ساتھ سنایا۔ اس دوران اعجاز نے گاری کا رخ ایمسٹرڈیم کی طرف موڈ دیا تھا۔

انسان کمینہ ہے

عطا بھائی آپ کا انسان کے بارے میں کیا خیال ہے ؟ اعجاز نے ڈیش بورڈ میں سے اپنی پسندیدہ سرخ پی کیپ نکال کر پہنتے ہوئے پوچھا۔ یہ سوال غالباً ٹائم پاس کرنے کے لئے تھا کیونکہ ایمسٹرڈیم ابھی دور تھا۔ میں نے یہ لطیفہ اعجاز کو سنیاتو اس نے ہنستے ہوئے کہا مقصد یقیناً ائم پس کرن ابھی ہے لیکن میں انسان کے بارے میں آپ کے خیالات جاننا بھی چاہتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ اس بارے میں آپ میرے ہم خیال ہوں۔ مجھے خدشہ ہے کہ انسان کے بارے میں تمہیں میرے خیالات پسند نہیں آئیں گے۔ میں نے کہا کیونکہ میرے نزدیک انسان کے اندر انسانیت کا عنصر خاصا کم ہے۔

آپ تو میرے ہم خیال نکلے، اعجاز کی مسرت بھری آواز سنائی دی، کیونکہ انسان کے بارے میں خود میری رائے بھی یہی ہے۔ چلو شکر ہے کہ کم از کم ہم دو انسان تو خود احتسابی پر مائل ہیں۔ میں نے کہا لیکن پہلے تم بتاؤ کہ تم انسان سے اتنے بد ظن کیوں ہو؟

اعجاز تو جیسے بھرا بیٹھا تھا چنانچہ وہ شروع ہو گیا۔ آج کے مہذب انسان کے اندر غاروں میں رہنے والا وہ جنگلی انسان آج بھی مکمل صورت میں موجود ہے جس کی ساری جدو جہد صرف اپنی بقا کے لئے تھی چنانچہ انسان کو آج بھی اپنی ذات سے زیادہ دنیا کی کوئی چیز عزیز نہیں ہے، وہ آپ کو جتنا اچھا نظر آتا ہے صرف اپنے شعور کی وجہ سے ہے لیکن جب وہ لاشعور ی طور پر اپنی سائیڈ بچانے کی کوشش کرتا ہے خواہ گاڑی کی دوسری سائیڈ کی طرف اس کے اہل خانہ ہی کیوں نہ بیٹھے ہون یہی وجہ ہے کہ لاہور کے بلال گنج میں گاڑی کے بائیں ہاتھ کے سپئیر پارٹس بمشکل دستیاب ہوتے ہیں کیونکہ وہ حصہ حادثہ کی صورت میں اکثر تباہ ہو جاتا ہے۔

میں نے اطہر راز سے گذارش کی کہ وہ میری سیٹ پر بیٹھ جائے تا کہ میں اعجاز کے عقب میں واقع سیٹ پر بیٹل کر اس کے لاشعور پر مسلسل نظر رکھ سکوں۔ یہ بات ہنسی میں اڑانے والی نہیں ہے، اعجاز سنجیدہ نظر آ رہا تھا، انسان کے لاشعور کے کرشمے دیکھنے ہوں تو کبھی اس کے خوابوں کا تجزیہ بھی کر کے دیکھیں۔ وہ اپنے خوابوں میں ان تمام نا آسودہ وحشی خواہشوں کی تسکین کرتا ہے جن خواہشوں پر مہذب معاشرے نے پابندیاں عائد کر رکھی ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے۔ پاگل پن کی پہلی نشانی یہ ہوتی ہے کہ انسان کو خواب نظر آنا بند ہو جاتے ہیں، جس سے اس کے کتھارسز کا عمل رک جاتا ہے اور یوں وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے۔

ویسے شعوری طور پر بھی انسان کم گھٹیا نہیں ہے۔ میں نے اعجاز کی بات کو اسپورٹ کرتے ہوئے کہا، ہمارے درمیان کچھ انسان ایسے ہیں جو تہذیب کا جا اتار پھینکتے ہیں اور اس کے بعد کھل کر وہ کام کرتے ہیں جو شاید بھیڑیئے بھی نہ کرتے ہون یہی کام قومیں اجتماعی طور پر بھی کرتی ہیں چنانچہ مہذب ہونے کے بعد سے اب تک انسان اپنے ہاتھوں سے کروڑوں انسانوں کو قتل کر چکا کے۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ بہت کم تعداد میں اپنی یہ جبلت پوری کرنے پر قادر تھا۔ ہم میں سے جو بھلے مانس ہیں یعنی کسی کو قتل کرنا افورڈ نہیں کر سکتے، وہ قتل و غارت گری پر مشتمل فلمیں دیکھ کر اپنی اپنی جبلت کو تسکین دیتے ہیں۔ اس وقت پوری دنیا میں تشدد اور مار دھاڑ سے بھر پور فلموں کا جو طوفان آیا ہوا ہے، وہ انسان کی اس دبی ہوئی خواہش کی تسکین ہی کے لئے تو ہے۔

ایک بات اور میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا انسان نے سر پر قراقلی ٹوپی پہنی ہو تو وہ کتنا معزز اور نیک دل لگتا ہے مگر یہ قراقلی ٹوپی حاملہ بکری کا پیٹ چاک کر کے اس میمنے کی کھال سے بنائی جاتی ہے جس بیچارے نے ابھی اس دنیا میں آنا ہوتا ہے۔ اسی طرح مختلف جانوروں کی کھال کھینچ کر اس سے ہم اپنے پاؤں

کی جوتیاں بناتے ہیں۔ گائے کے تھنوں میں جو دودھ ہوتا ہے وہ اس کے بچھڑے کے لئے ہوتا ہے چنانچہ ہم بچھڑے کو آگے کرتے ہیں جس کے نتیجے میں گائے فوراً اپنا دودھ تھنو ں میں اتار دیتی ہے جس پر بچھڑے کو گردن سے پکڑ کر پرے ہٹا دیا جاتا ہے اور اس کا دودھ "چو" کر ہم خود پی جاتے ہیں۔ مرغی نے اپنے انڈوں سے بچے نکالنا ہوتے ہیں۔ مگر ہم اس کے انڈے کھا جاتے ہیں۔ قصائی کی دکان پر لٹکے ہوئے بکرے کے مختلف حصوں کو ہم اترواتے ہیں اور اپنے سامنے اس کی بوٹیاں کروا کے گھر لے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ غالباً حیات انسانی کے لئے ضروری ہے مگر اس سے یہ بات تو بہر حال ثابت ہوتی ہے کہ اسنان کی تمام قدریں اس کی ضرورت اور ذات کے تابع ہیں۔

اور یہ جو ہم نے چڑیا گھر بنائے ہوئے ہیں، یہ کہاں کی شرافت ہے، اعجاز نے خود پر غصہ اتارتے ہوئے کہا ہم محض تفریح طبع کے لئے جانوروں کو کھلی فضاؤں سے محروم کر کے انہیں پنجروں میں بند کر دیتے ہیں اور ان قیدیوں کی بے بسی پر خوش ہوتے ہیں۔ گھروں کے ڈرائنگ روم میں جانوروں کی کھالوں میں بھس بھر کر انہیں ڈیکوریشن پیس کے طور پر سجاتے ہیں۔ کتے کو وفادار جانور کہتے ہیں کہ وہ ہماری غلامی کو قبول کر لیتا ہے اور طوطے کو طوطا چشم کہ وہ پنجرے میں مقید ہو کر ہماری عنایت کردہ چوری کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے آزاد فضا میں کسی درخت پر بیٹھ کر امرود کترنے کو ترجیح دیتا ہے۔ انسان سب اصول اپنی غرض کے مطابق وضع کرتا ہے، اپنی فصلوں کے لئے جن جانوروں کی اسے ضرورت ہے وائلڈ لائف والے ان جانوروں کے لئے رحم اور محبت کے جذبات بیدار کرنے کے لئے پبلسٹی مہم چلاتے ہیں۔ اور جو جانورو فصلوں کے لئے مفید نہیں ہیں۔ محکمہ زراعت والے انہیں تباہ و برباد کرنے کی مہم چلانے میں لگے رہتے ہیں۔ محکمہ جنگلات والے ان درختوں کی مدح میں قصیدے پڑھتے ہیں جن کی انسانوں کو ضرورت ہے اور ضرورت سے زائد درختوں کو تہہ تیغ کر کے ان کی میزیں اور کرسیاں بنائی جاتی ہیں۔ انسان کی محبت اور اس کی نفرت دونوں میں خود غرضی موجود ہے۔ محبت میں تو یقیناً موجود ہے،اطہر راز نے اعجاز کو لقمہ دیتے ہوئے کہا اور مجھے احساس ہوا کہ ہم تینو ایک ہی نکتے پر متفق ہیں، یہ جو کسی ریستوران کے نیم تاریک گوشے میں شیریں فرہاد اور لیلی مجنوں بیٹھے نظر آتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے محبت کا دعوی کرتے ہیں۔ یہ بھی دراصل صرف اپنی ذات عشق میں مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ کیسے ؟ میں نے چونک کر پوچھا کہ یہ بات میرے لئے بھی حیران کن تھی۔ وہ ایسے کہ اگر آپ کسی سے واقعی محبت کرتے ہیں۔ تو اس کے لئے قطعاً ضروری نہیں کہ وہ بھی آپ سے محبت کرے لیکن ہر عاشق کا ہر دوسرا فقرہ یہی ہوتا ہے کہ کیا تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے ؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ انسان دراصل خود سے محبت کرتا ہے۔ جہاں دو طرفہ محبت نہ ہو، وہ سلسلہ یا تو کہیں درمیان ہی میں بریک ہو جاتا ہے اور اگر بے وفائی سے کسی کی انا زیادہ مجروح ہو جائے تو وہ عمر بھر ایک عذاب میں مبتلا رہتا ہے جسے وہ محبت کا نتیجہ سمجھتا ہے حالانکہ اس کی وجہ صرف وہ کرب ہوتا ہے جو محبت آپ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ آپ کی بجائے کسی اور کو کیوں مل گئی ہے ؟ ہجر و فراق کی ساری کہانیاں شاعروں، خوبصورت غزلیں، موسیقاروں کے

لازوال نغمے، مصوروں کی بنائی ہوئی حزینہ تصویریں، یہ سب کی سب محبت میں احساس شکست کا نتیجہ ہیں اور یوں خالص خود غرضی پر مبنی ایک انسانی جذبے کو انسان کتنا پوتر بنا کر پیش کرتا ہے۔ یہ بھی انسان ہی کا کمال ہے کیا خیال ہے ؟
چھوڑیں اطہر بھائی آپ نے تو محبت کا تجزیہ کر کے اس کی ساری خوبصورتی کو تباہ و برباد کر دیا کہیں آپ ناکام عاشق تو نہیں ؟ میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ نہیں میں کتابی علم کے مطابق ایک سچا عاشق ہوں اپنی محبت کو خالص محبت سمجھنے والا ٹھنڈی آہیں بھرنے والا فراقیہ شاعری کرنے والا مگر چونکہ مجھے انسان کی کمینگی وہاں بھی نظر آئی جہاں ہر گز نہیں ہونا چاہئے تھی لہذا بادل نخواستہ اس کی نشاندہی بھی کر دی مگر ابھی میری بات ختم کہاں ہوئی ہے۔ تو کیا بچارے انسان پر ابھی کچھ الزامات باقی ہیں ؟ ڈرائیونگ سیٹ سے اعجاز کی آواز سائی لگتا تھا۔ انسانی برادری کا فرد ہونے کے حوالے سے ان توہین آمیز الزامات کی وجہ سے اب اس کی انا کو ٹھیس لگنے لگی ہے۔ یہ داستان تو اعجاز بھائی بہت طویل ہے بے بی گلیکسو جیسے اطہر راز نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا"انسان تو اولاد نرینہ کی خواہش بھی اس لئے کرتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی لوگ اسے یاد رکھیں کہ یہ اللہ بخش کا پڑ پوتا ہے یہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بس اطہر بھائی بس میں نے ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے کہا انان کی بجو بہت ہو چکی اب اس کا قصیدہ بھی ہونا چاہئے اور یہ کام بھی مجھی کو کرنا پڑے گا۔ ارشاد اطہر راز نے بخش لائل پوری، ابرار ترمذی، حسن رضوی اور صدیق کی طرف اشارہ کر کے کہا جو دن بھر کی تھکن کی وجہ سے ہماری گفتگو کے دوران ہی کہیں سو گئے تھے۔ بس میں اور اعجاز ہمہ تن گوش ہیں باقی تو خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم اتنی دیر سے انسان کی نرگسیت کے حوالے سے جو گفتگو کر رہے ہیں تصویر کائنات میں رنگ بھی اسی نرگسیت کی وجہ سے ہے۔

وہ کیسے ؟ وہ ایسے کہ اپنی ذات کی محبت کے اسیر ہونے ہی کی وجہ سے انسان نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں تا کہ وہ مرنے کے بعد لازوال ٹھرے چنانچہ فنون لطیفہ اور سائنس کے سبھی شاہکار انسان کی اسی شعوری یا لاشعوری خواہش کا نتیجہ ہیں۔ دوسرے یہ کہ انسان صرف تشدد کا رسیا نہیں بلکہ محبت، رحم، قربانی ایثار اور اس طرح کے بہت سے دوسرے خوبصورت جذبے بھی قدرت نے اسے ددیعت کئے ہیں، اس خوبصورت دنیا کو مزید خوبصورت بنانے والا بھی انسا ن ہی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کبھی انسان کا لاشعور اس کے شعور کے تابع ہو جائے ؟ کروڑوں سالوں میں تو ہوا نہیں تاہم انبیاء اور مصلحین کی مسلسل کوششیں اسے انسانیت کے درجے قریب لانے میں مددگار ثابت ہوتی رہیں ہیں۔ اگر انسان وجود احتسابی سے کام لیتا رہے تو کبھی نہ کبھی یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اس کا لاشعور اس کے شعور کے تابع ہو جائے۔ ویسے یہی فرائڈ سے بھی کہا گیا تھا اس نے مترادف ہے کہ جتنی دیر میں آتا پیسا جائے گا اتنی دیر میں بھوکا بھوک سے مزید نڈھال ہو جائے گا ویسے اس سلسلے میں کولن کی کتاب "انسان مجرمانہ تاریخ:" بھی انسان کو ضرور پڑھنی چاہئے۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے انسان کے بارے میں جو سوال کای تھا وہ میں واپس لیتا ہوں اعجاز نے ہنستے ہوئے کہا مجھے اگر علم ہوتا کہ آپ لوگوں نے انسانی کی اتنی بے عزتی کرنی ہے تو میں یہ غلطی ہر گز نہ کرتا بہر حال اس گفتگو

کا فائدہ یہ ہوا کہ انسان اشرف انسانیت کے قریب پہنچتے نہ پہنچے ہم ایمسٹردیم کے قریب ضرور پہنچ گئے ہیں۔ ایمسٹرڈیم اب یہاں سے صرف چالیس کلو میٹر دور ہے۔

ایمسٹرڈم میں نیند کے ماروں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے اعجاز احمد اعجاز نے ریڈیو پورے والیم سے آن کر دیا جہاں سے ولندیزی زبان میں خبریں نشر ہو رہی تھی۔ نیوز ریڈر کا کا لہجہ خوفناک تھا یا خبریں خوفناک تھیں کہ سب ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھے مجھے ان لمحوں میں اجمل نیازی کا یہ شعر بہت یاد آیا

عہد غفلت میں مجھے مثل سحر بھیجا گیا

دیر تک سوئے ہوئے لوگوں کے گھر بھیجا گیا

اعجاز احمد اعجاز نے اس وقت کچھ اسی قسم کا رول ادا کیا تھا۔ یہ سحر اگر چہ ذرا مختلف قسم کی تھی مگر آج کل جو سحر طلوع ہوتی ہے وہ کچھ اسی طرح ڈرانے والی ہوتی ہے۔ ایمسٹرڈیم میں رات کہاں بسر ہو گی؟ اطہر راز نے پوچھا۔ کار میں بسر ہو گی۔ ابراز ترمذی نے ترت جواب دیا۔ سوال ہی پیدا ہیں ہوتا اطہر راز نے کہا پیرس میں پہلے ہی ہمارے ساتھ کاری بری ہوچکی ہے۔ وہاں چھوکریاں بھی ہمیں رنگ کرتی رہی ہیں۔ اسی امید پر تو یہاں بھی کار میں سونے کا پروگرام ہے ابراز کی آواز سنائی دی۔

بھلا دو محبت میں ہم تم ملے تھے، اطہر راز نے گنگنانا شروع کر دیا۔ لو جی مسئلہ حل ہو گیا۔ ابرار نے مسرت سے بھری آواز میں کہا ایمسٹردیم میں نوید شاہ رہتا ہے۔ وہ بخش صاحب اور حسن رضوی بہت قریبی دوست ہے اور ہم سے بھی اس کے مراسم بہت اچھے ہیں ایک رات ہی مسئلہ ہے اس کے ڈرائنگ روم میں سو جائیں گے۔ نوید شاہ سے میری دوستی تو نہیں لیکن گذشتہ پندرہ برس سے اس کے ساتھ بہت اچھی رسم و راہ ہے۔ مجھے یاد ہی نہیں تھا کہ وہ ایمسٹرڈیم میں رہتا ہے، ابرار سے پتہ چلا تو ایک عجیب طرح کی خوشی محسوس ہوئی۔ کسی اپنے سے دیار غیر میں ملاقات کا مزا کچھ اور ہوتا ہے تاہم میرے نزدیک بلائے ناگہانی بن کر اس کی طرف جانا مناسب نہیں تھا۔

میرے خیال میں ست افراد کا کسی کے ہاں جا کر مہمان بنا اچھی بات نہیں خصوصاً جب وہ یورپ میں رہتا ہو اور اس کی بیوی بھی یورپین ہو ہم ایمسٹرڈیم میں کسی ہوٹل میں قیام ں گے وہاں سے فون کر کے اسے اپنے پاس بلائیں گے یا س سے ملنے اس کے ہاں چلے جائیں گے، میں نے اپنی رائے کا اظہار کای۔ ہم اس کی طرف ٹھریں گے نہیں، مگر یہاں سے اسے فون کر دیتے ہیں کہ ہم لوگ ایمسٹرڈیم پہنچ رہے ہیں بخش لائل پوری نے کہا۔ ہم ویسے ہی آدھے گھنٹے تک انشاء اللہ ایمسڑڈیم میں ہوں گے، وہاں کسی ہوٹل میں کمرہ لینے کے بعد باعزت طور پر اسے فون کریں گے۔ یہاں سے فون کرنے میں "حسن طلب" کا شائبہ محسوس ہوتا ہے۔ میں نے اپنی رائے کا مکرر اظہار کیا۔

مگر اعجاز نے دوستوں کے اصرار پر گاڑی ایک سروس کے پاس کھڑی کر دی۔ حسن رضوی نے جیب میں سے نوید شاہ کا نمبر نکالا اور ٹیلی فون بوتھ میں گھس گیا، ابرار شاہ اور بخش لائل پوری نے بھی بوتھ میں اپنی جگہ بنالی۔ حسن کو انگریزی بولنا پڑ رہی تھی اور وہ اس پل صراط پر سے بہر حال گزر گیا لیکن جب بوتھ سے باہر نکلا تو اس کا موڈ سخت آف تھا۔ کیا بات ہے ؟ اعجاز نے پوچھا۔ بتاتا ہوں گاڑی چلاؤ، حسن نے بیزاری سے کہا اعجاز نے گاڑی ایک دفعہ پھر سڑک پر ڈال دی۔ نوید شاہ بہت غلط آدمی نکلا ہے، حسن نے فون کی روائداد سنائی،، میں نے فون کیا تو اس نے خود اٹھایا مگر میری آواز سنتے ہی رسیور اپنے بیٹے کو تھما دیا۔ میں نے اس کے بیٹے سے کہا کہ میں حسن رضوی ہوں نوید شاہ سے بات کرنا ہے۔ پھر مجھے اس کی اور اس کے بیٹے کی سرگوشی سنائی دی جو وہ ایک دوسرے سے کر رہے تھے۔ نوید شاہ نے آہستہ سے اپنے بیٹے سے کہا کہ اسے کہو فادر بیلجیم گئے ہوئے ہیں اور ایک ہفتے بعد واپس آئیں گے۔ بیٹے نے یہی بات دہرا دی۔ پھر ؟ میں نے پوچھا۔ پھر میں نے فون بند کر دیا اور کیا کرتا؟ حسن نے کہا۔

اس میں زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ اسے علم نہیں کہ ہم سات افراد ہیں اور اس کی طرف ٹھہرنا چاہتے ہیں بلکہ اسے تو یہ تک پتہ نہیں کہ میں کس ملک سے بول رہا ہوں، حالانکہ جب یہ شخص پاکستان آیا تھا تو میں نے اس کی بہت آؤ بھگت کی تھی۔ اس کا طویل انٹرویو شائع کیا اور یہ جاتے ہوئے مجھے بہت لمبی چوڑی دعوتیں دے کر گیا تھا مگر یہاں اس نے فون پر بات کرنا بھی پسند نہیں کیا۔ اس کی سزا یہ ہے کہ اب ہر صورت میں اس کی طرف ٹھہرا جائے، ابرار ترمذی نے اپنا فیصلہ سنایا۔ مگر وہ ایک ہفتے کے لئے بیلجیم گیا ہوا ہے ؟ وہ ایک منت میں آپ کو ایمسٹرڈیم ہی میں ملے گا مگر اس دفعہ اپنا نام علی صدیقی بتایا جائے، علی صدیقی نے اسے عالمی اردو کانفرنس میں دہلی مدعو کیا تھا ور نوید شاہ دوسری دفعہ بھی اس کانفرنس میں شامل ہونا پسند کرے گا۔

چنانچہ کار ایک دفعہ پھر سروس پر روکی گئی۔ بخش لائل پوری اور حسن رضوی ایک ٹیلی فون بوتھ پر داخل ہوئے۔ فون میں سکہ ڈالا اور دوسری طرف سے نوید شاہ کی یورپین بیوی نے فون اٹھایا۔ میں دہلی سے علی صدیقی بول رہا ہوں۔ نوید شاہ سے بات کرنا ہے۔ بخش نے آواز بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ پلیز ہولڈ آن ہی ازجسٹ کمنگ۔

تھوڑی دیر بعد نوید شاہ فون پر تھا۔ آداب صدیقی صاحب آداب مگر اسی وقت حسن نے بخش سے ریسور چھین لیا اور پھر اس نے نوید شاہ کو بے نقط سنانا شروع کر دیں۔ بیچارے نوید شاہ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اپنی صفائی میں کیا کہے اور ظاہر ہے اس کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ دو تین تک مغلظات سنانے کے بعد حسن نے فون بند کر دیا۔

اب ہم پھر کار میں تھے، سب کا موڈ آف ہو چکا تھا۔ مجھے ایمسٹرڈیم سے ڈیڑھ سو کلر میٹر واقع ایک قصبے آپل داران کی وہ شام یاد آ گئی جب میں امریکہ سے واپسی

پر ایک طویل سفر طے کر کے صرف اپنے بچپن کے ایک دوست کو ملنے اس کے گھر پہنچا، اس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے۔ میں نے گھنٹی بجائی تو میرا دوست آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا ور مجھے اچانک اپنے سامنے پاکر فرط مسرت سے مجھ سے لپٹ گیا مگر یہ خوشی ہم دونوں کو بہت مہنگی پڑی کیونکہ اس کی ولندیزی بیوی یہ کہہ کر رات ہی کو اپنے والدین کے گھر شفٹ ہو گئی کہ یہ وقت کسی کے ہاں جا کر مہمان بننے کا نہیں، تمہارے دوست نے اس وقت آ کر میرے آرام میں خلل ڈالا ہے۔

ایمسٹرڈیم نے اپنے مہمانوں کے ساتھ یہ سلوک ایک بار پھر دہرایا تھا۔ اس دوران ہماری گاڑی شہر میں داخل ہو چکی تھی۔ یورپ کے عام شہروں جیسا ایک شہر بلکہ یہاں صفائی کا وہ معیار بھی برقرار نہیں جو عموی طور پر یورپین شہروں میں رکھا جاتا ہے۔ یہاں چرس، افیم، گانجا، اور دوسرے نشے عام فروخت ہوتے ہیں۔ شہر سیاحوں سے بھرا ہوا ہے جو مختلف چوکوں میں اپنا منڈلیاں جمائے بیٹھے ہیں۔ یورپ کی یہ نسل بہت عجیب نسل ہے، ہم آسائشوں کے متلاشی ہیں، یہ آسائشوں سے تنگ آئے ہوئے اور کھردری زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ مسئلہ پھر ہوٹل کی تلاش کا ہے، اور مقامی زبان سے نا آشنائی کی بنا پر ہم دربدر ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ ایک جگہ ہوٹلوں کی ایک قطار نظر آتی ہے۔ مگر کسی ہوٹل میں کوئی جگہ نہیں۔ مکالمہ اب کیا کیا جائے ؟

تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر۔

مگر یہاں تو پہاڑ نہیں ہیں ؟

اور تم کون سے شاہیں ہو؟

کیا خیال ہے ان بیسواؤں کے ساتھ کسی چوک میں رات بسر نہ کی جائے موسیقی کی تال پر ناچ رہے ہیں یہ مجرا رات بھر مفت میں دیکھ سکتے ہیں۔

تو پھر کہیں سے موتئے کے بار بھی خریدتے ہیں۔ اور روپے روپے نئے نوٹو ں کی گڈی بھی۔

یہاں پان دکان بھی کہیں قریب ہی ہو گی۔ اس کے بعد تم سری پائے کی دکان بھی تلاش کرو گے لہذا اب یہ بک بک بند کرو اور سیدھی طرح کسی ہوٹل کی راہ لو۔ اور ہوٹل کی راہ لینے کے لئے ہماری کار شہر میں سے گزرنے والی نہروں کے کنارے کنارے رینگتی رہی تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک پل آ جاتا تھا جو اس شہر کو ایک نئے رنگ سے ہمکنار کرتا تھا۔

سانوں نہر والے پل تے بلا کے حسن گلوکاری کے موڈ میں تھا۔

بلآخر اعجاز نے ایک وسیع و عریض چوک میں روک دی جس کے درمیان میں ایک مجسمہ نصب تھا اور سڑک کے کنارے فٹ پاتھوں پر تنے رنگین سائبانوں والے ریستوران تھے جن میں ولندیزی جوان، بوڑھے اور عورتیں مشروبات سے دل بہلا

رہے تھے برابر والی سڑک پر ایک خوبصورت ٹرام گزری رہی تھی۔ میں انیس سال پیچھے چلا گیا۔ ارے یہ تو کا علاقہ ہے۔ یہ سامنے دو تین ہوٹل ہیں آپ میں سے کوئی ایک جا کر کمرے کا پتہ کرے۔ اس خدمت کے لئے میں نے خود کو رضا کارانہ طور پر پیش کیا۔ ہوٹل کے منیجر نے میرا پاسپورٹ دیکھ کر مسرت سے کہا اوہ پاکستان۔ اپنے پاسپورٹ کی یہ عزت افزائی دیکھ کر مجھ پر رقت سی طاری ہو گئی یورپ میں غریب ملکوں کے پاسپورٹ کو اتنی عزت کہاں نصیب ہوتی ہے۔

عطا الحق قاسمی اس نے پاسپورٹ پر سے میر انام پڑھا، یورپ میں میرا نام بھی اتنے صحیح تلفظ کے ساتھ کسی نے پہلی دفعہ ادا کیا تھا، ورنہ یہاں تو بعض مسافر نواز قاسمی کو بھی کسمی کہتے ہیں۔ تم یقیناً مسلمان ہو؟ الحمد اللہ۔ میں بھی مسلمان ہوں میرا نام مصطفی ہے میں مصری ہوں۔ اس وقت یہ مصری مجھے مصری کی ڈالی محسوس ہوا۔ کتنے کمرے چاہیئے؟ دو کمرے جس میں چھ لوگ سما سکیں۔ اعجاز کو میں نے نہیں گنا تھا کہ میں جانتا تھا کہ وہ اپنی کار اکیلی نہیں چھوڑے گا۔ یہ لو چابیاں کسی قسم کی تکلیف ہو تو بتانا۔ میں تمہاری خدمت کے لئے حاضر ہوں تم میرے مسلمان بھائی ہو۔ ہم لوگ کچھ ہی دیر بعد تقریب تقسیم کمرہ جات سے فارغ ہو گئے۔ میں بخش اور حسن ایک کمرے میں، ابرار، اطہر راز اور صدیقی دوسرے کمرے میں اور شاعر خوش نواء اعجاز احمد اعجاز اپنی کار میں۔

اس وقت ایمسٹرڈیم پر رات کی تاریکی غالب آ چکی تھی، شہر کے میوزیمز کشتی رانی کے مراکز اور دیگر قابل دید مقامات دیکھنے کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ ویسے بھی ایمسٹرڈیم کی تقریباً یہ سب رونقیں میں ایک بار دیکھ چکا تھا۔ اگرچہ یہ سب کچھ دوسری بار دیکھنے کی ہوس تھی مگر یہ ممکن نہیں تھا کہ صبح واپس اپنے وطن لندن کے لئے روانہ ہونا تھا۔ سو اب اگر ادیکھنے کے لئے کچھ تھا تو وہ خالی سڑکیں اور بھرے ہوئے نائٹ کلب اور ریستوران ہی تھے۔

ایمسٹرڈم میں

بخش صاحب کیا پروگرام ہے ؟ میں نے پوچھا۔ میں نے نوید شاہ کو فون کیا ہے وہ یہاں آ رہا ہے، اس کے آنے سے شام اچھی گزر جائے گی۔ کمرے میں بیٹھے بیٹھے ؟ نہیں جب تھک جاؤں گا تو تھوڑی دیر کے لئے لیٹ بھی جاؤں گا۔ میرے اس زندہ دل بزرگ دوست نے کہا ویسے تم لوگوں کے کیا ارادے ہیں ؟ ہم شریف لوگ ہیں، ساری رات سڑکوں پر مٹر گشت کریں گے۔ مٹر گوشت، ؟بخش کے من میں پانی بھر آیا۔ مٹر گوشت تو اب اپنے گھروں کو لوٹ کر ہی کھائیں گے۔ ، ویسے قبلہ آپ کیوں ہمیں گھر یاد دلا رہے ہیں کچھ خدا کا خوف کریں۔

جب ہم غیبان شہر ہوٹل کی سیڑھیاں اتر کر نیچے سڑک پر پہنچے تو سامنے نوید شاہ کھڑا تھا، اس نے بغل میں کوئی چیز دبائی ہوئی تھی، اس کے چہرے سے ندامت ٹپک رہی تھا، وہ جھینپتا ہوا ہماری طرف بڑھا ہم سب سے پر جوش مصافحے کے بعد جب وہ حسن سے مصافحے کے لئے آگے بڑھا تو حسن پیچھے ہٹ گیا میں تم سے معانقہ تو کیا ہاتھ ملانے کا روادار بھی نہیں ہوں تم گھٹیا آدمی ہو۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے تم میری پوری بات تو سنو نوید شاہ نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ تم اپنی صفائی میں کیا کہو گے نوید شاہ تو بلجیم میں ہے۔ تم پتہ نہیں کون ہو؟ اچھا یار اب غصہ تھوک دو اور میری بات پورے تحمل سے سنو۔ میں نہیں سمجھتا کہ تمہارے پاس کہنے کے لئے کچھ ہے لہذا ہمارا وقت ضائع نہ کرو۔ اگر یہی بات ہے تو پھر تم بھی اس قابل نہیں ہو کہ تمہارے سامنے صفائی پیش کی جائے میں تم پر اور تمہاری دوستی پر لعنت بھیجتا ہوں۔

نوید شاہ غصے میں آگیا تھا اور اس عالم میں وہ جو کچھ کہہ رہا تھا میں نے یہاں اس صرف سلیس اور مہذب ترجمہ عرض کیا ہے بالکل اسی طرح جس طرح حسن کی گفتگو کو میں نے قابل اشاعت بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور پھر نوید شاہ پاؤں پٹختا ہوا ہوٹل کی سیڑھیوں کی طرف چلا گیا جہاں بخش لائل پوری اپنے کمرے میں اس کے انتظار میں جمائیاں لے رہے تھے۔

صدیق ہمیں لندن سے اس بات کا یقین دلاتا چلا آ رہا تھا کہ وہ اتنا لندن کے بارے میں نہیں جانتا جتنا ایمسٹرڈیم کے بارے میں جانتا ہے کیونکہ یہاں بہت تواتر سے اس کا آنا جانا رہتا ہے چنانچہ ہم نے پیرس، ہیمبرگ، کوپن ہیگن اور اوسلو میں اسے کسی قسم کی زحمت نہ دی کہ رہنمائی کا سارا بوجھ اس پر ایمسٹرڈیم ہی میں ڈالیں گے۔ اب ہم ایمسٹردیم میں تھے لیکن صدیقی ایمسٹرڈیم میں نہیں تھا۔ وہ کھوئی کھوئی آنکھوں سے اس شہر کی روشنیوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سڑک پر نظر آنے والے کسی اکا دکا راہ گیر کو روکتا اور کسی علاقے کا نام لے کر اس کا حدود اربعہ معلوم کرتا اور نفی میں

جواب ملنے پر دوبارہ کھوئی کھوئی آنکھوں سے کبھی اس راہ گیر کو اور کبھی ہم کو دیکھنے لگتا۔ ہم اس سے پوچھتے کہ عزیزی تم جس مقام کی تلاش میں ہو کیا وہ کبھی تمہیں ملے گا؟ نیز ہمیں بھی بتاؤ کہ وہ کون سی ایسی جگہ ہے جس کے وصال کے لئے تم اتنے بے چین ہو کہ دوسری جگہ کے بارے میں پوچھتے ہی نہیں ہو۔ مگر وہ ہماری کسی بات کو لفٹ نہ کراتا۔ بس ہمارے سوالات سن کر موٹے شیشوں والی عینک میں سے آنکھیں جھپکانے لگتا۔

یورپ کے شہر میں رات کے وقت پیدل چلنا کچھ اتنا مہفوظ بھی نہیں اور بڑے شہروں میں تو خصوصاً یہ آوارہ گردی، روز بروز خطرناک سے خطرناک تر ہوتی جا رہی ہے، نیو یارک، شکاگو، پیرس لندن واشنگٹن سب غنڈوں کی دسترس میں ہوتے ہیں۔ امریکہ کے شہروں میں تو پولیس جود شہریوں کو یہ مشورہ دیتی ہے کہ گھرو سے نکلتے وقت جیب میں چالیس پچاس ڈالر ضرو رکھیں تا کہ اگر کوئی لٹیرا آپ پر پستول تانے تو آپ کی جیب میں کچھ نہ نکلنے پر کہیں وہ آپ کو اپنی توہین پر گولی نہ مار دے۔ ایمسٹردیم بھی دنیا کے ان شہروں میں سے ایک ہے جہاں سورج غروب ہونے کے بعد جان و مال اور آبرو غیر محفوظ ہو جاتی ہے۔ ان مہذب معاشروں سے تو سعودی عرب، ابوظہبی اور قطر وغیرہ کے غیر مہذب معاشرے بہتر ہیں جہاں آپ آدھی رات کو جنگل بیابان میں سونا ہوا میں اچھالتے ہوئے گزر جائیں مگر کوئی آپ کو میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرت نہیں کرے گا۔ میں ایک دفعہ رات کو ڈیڑھ بجے کے قریب دوبئی سے ابو ظہبی کی طرف جا رہا تھا۔ میرے ساتھ مزاح نگار کبیر خان بھی تھے لق و دق صحرا میں گزرتے ہوئے پٹھان ٹیکسی ڈرائیور نے ہمارے کہنے پر گاڑی ایک سر راہے قسم کے ریستوران پر روک دی۔ ہم اتر کر ریستوران کی طرف جانے لگے تو دیکھا کہ خان صاحب اپنی سیٹ پر ہی براجمان ہیں ہمارے ساتھ کچھ سامان بھی تھا جو ہم نے دوبئی خریدا تھا، چنانچہ موصوف کا گاڑی میں بیٹھے رہنا سامان کی صحت کے لئے چنداں مفید نہیں تھا، لہذا میں نے خان صاحب سے کہا آپ بھی ہمارے ساتھ اندر چلیں تا کہ ہم تینو ں پاکستانی بھائی اکٹھے بیٹھ کر چائے پیئیں۔ یہ سن کر خان صاحب ہنسنے اور کہا آپ کی اس میزبانی اور مہربانی کا شکریہ مگر آپ کی اس مہربانی اور میزبانی کے پیچھے اصل خوف ہے وہ بے بنیاد ہے آپ آرام سے چائے پی کر واپس آئیں میں آپ کو سامان سمیت اسی طرح اپنی سیٹ پر بیٹھا ملوں گا۔

سو یہ وہی خوف تھا جو اس وقت قدرے ویران سڑکوں پر گھومتے ہوئے مجھے محسوس ہو رہا تھا چنانچہ میں نے بہتر سمجھا کہ فٹ پاتھ کے ستھ ساتھ بے ہوئے ان خوبصورت ریستورانوں میں بیٹھ کر چائے پی جائے جنکے رنگ برنگے سائبان اور بیٹھے رہیں تصور جانا کئے ہوئے قسم کی کیفیت مجھے ہمیشہ ہانٹ کرتی ہے چنانچہ ہم سر پر تنے سائبنا کے نیچے فٹ پاتھ پر بچھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اندر جا کر کیون نہ بیٹھا جائے ؟ صدیق نے تجویز پیش کی۔ اندر تو ہم ہمیشہ بیٹھے ہیں اور آئندہ بھی بیٹھتے رہیں گے مگر یہ عیاشی ہمیں اپنے وطن میں نصیب نہیں ہو گی کہ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر ہم جو چائے پیئیں گے اس میں صرف دودھ اور چینی ہو گی ایک چھٹانک گرد و غبار اور ایک چھٹانک گوبر اس میں شامل نہیں ہو گا میں نے عرض کیا۔

یہاں قطار اندر قطار ولندیزی مرد اور عورتیں پورے سکون اور اطمینان کے ساتھ بیٹھے خورد و نوش میں مشغول تھے مجھے اپنے وزیر آباد کا زمانہ یاد آگیا جب ہم لوگ ہم قسم کے تفکرات سے بے نیاز اپنے گھروں کے تھڑوں پر دوتوں کی محفلیں جمایا کرتے تھے۔ یہ تجربہ میں نے امریکہ کے صنعتی شہر سینٹ لوئیس میں بھی کرنے کی کوشش کی یعنی اپنے فلیٹ کے باہر اپنے پاکستانی دوستوں کی منڈلی جمائی لیکن ابھی جی کھول کر دو چار قہقہے ہی لگائے تھے کہ سائرن بجاتی ہوئی پولیس کی گاڑی ہمارے سروں پر آن پہنچی جس میں پولیس والے پوری سرعت سے باہر نکلے اور پر پستول تان کر ہمارے ہینڈز اپ کرا دیے۔ ہماری پوری طرح تلاشی لینے کے باوجود جب ہم میں سے کسی کے نیفے میں سے بم بر آند بہ ہوا تو انہیں خاصی مایوسی ہوئی اور پھر ہمارے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ دراصل ابھی ایک فلیٹ میں سے ایک بوڑھی عورت نے فون کیا تھا کہ اس کے گھر کے سامنے کچھ غنڈے جمع ہیں جو اونچی آواز میں ہنس رہے ہیں اور جن کے عزائم کچھ اچھے نہیں لگتے لاحول ولا قوہ میں نے اسی روز امریکہ کو خیر باد کہہ کر واپس پاکستان آنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اپنے ہاں کم از کم ہنسنے اور رونے پر تو کوئی پابندی نہیں ہے۔

صاف ستھرے برتنوں میں چائے پینے کے بعد ہم ایک دفعہ پھر صدیق کی سرکردگی میں ایمسٹرڈیم کی سڑکوں پر تھے۔ ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ صدیق کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی اور اس نے خوشی سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا یہی ہے، یہی ہے وہ جگہ، اس کے اندازے سے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ صدیق نہیں کولمبس ہے جس نے امریکہ دریافت کر لیا ہے۔

کون سی جگہ ہے یہ بھائی صاحب؟ ابرار نے پوچھا

وہی جگہ جو میں اتنی دیر سے ڈھونڈ رہا تھا۔ صدیق نے جواب دیا۔ یہ انتہائی گندہ علاقہ تھا، تنگ و تاریک سی کچھ گلیاں تھیں جن کے دونوں جانب کھدائی ہو رہی تھی اور یوں مٹی کی اونچی اونچی ڈھیریوں نے گزرنے کے راستے کو مزید محدود کر دیا تھا کچھ ہی دیر کے بعد ہمیں صدیق سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہ رہی کہ یہ کون سا علاقہ ہے کیونکہ ہمیں علاقے کی سمجھ آ گئی تھی۔ یہ وہی علاقے تھے جہاں عورت کا کچا گوشت فروخت ہوتا ہے۔ وہ شیشے کے پنجرہ نما کیبنوں میں مدھم روشنیاں آن کئے نیم عریاں حالت میں بیٹھی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں انتظار تھا، ہوس کے خریداروں کا، ان خریداروں کا جو ان کی اشیاء کے حصول کی وہ حسرتیں پوری کر دیں جو نئی نئی مصنوعات کے دلفریب اشتہاروں نے دلوں میں اتنی شدت کے ساتھ پیدا کر دی ہیں کہ یہ عورتیں اس کے لئے جامے سے باہر ہو گئی ہیں اور ایک تماشا بن کر پنجرہ میں بیٹھ گئی ہیں چنانچہ کچھ تماشائی ان کی بے بسی کا تماشا باہر سے کرتے تھے اور کچھ پنجرے کا دروازہ کھول کر اندر چلے جاتے تھے۔ ان گلیوں سے وہ مخصوص سڑاند اٹھ رہی تھی جو دراصل ان علاقوں کے باطن میں بسی ہوتی ہے اور صرف انہی افراد کو محسوس ہوتی ہے جو پوری دنیا کو خوشبو سے معطر دیکھنا

چاہتے ہیں۔ مجھے اور میرے دوستوں کو یہ سڑاند تنگ کر رہی تھی چنانچہ ہم ناک پر رومال رکھے اس "بکر منڈی" سے باہر نکل آئے۔

میرے دوستوں میری طرف دیکھو اور بتاؤ میں کیسا ہوں ؟ ایک ہینڈ سم نوجوان نے گلی کی نکڑ پر ہمارا راستہ روکتے ہوئے نامانوس سے انگریزی لہجے میں کہا۔ تم یقیناً مردانہ وجاہت کا ایک خوبصورت نمونہ ہو۔ میں نے اس کی چوڑی چکلی چھاتی اور بھرے بھرے بازوؤں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں اس نے مسکرا کر سامنے والی عمارت کی طرف اشارہ کیا اور کہا میں چند منٹوں بعد اس کلب میں اپنی مردانگی کا مظاہرہ اسٹیج پر کروں گا میں اگر مردانہ وجاہت کا نمونہ ہوں تو میری پارٹنرز نسوانی حسن کا اعلی ترین نمونہ ہے، اسٹیج ہمارا بیڈ روم ہو گا اور تم لوگ اس یاد گار شو کے تماشائی صرف چند ٹکٹیں باقی رہ گئی ہیں جلدی کرو ورنہ دوسرے شو کے لئے دو گھنٹے انتظار کرنا پڑے گا۔

اوے بے غیرت انسان لعنت ہے تم پر میں نے اردو میں کہا جس پر باقی دوستو کی بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔ مردانہ وجاہت کے اس نمونے کو اپنے فن کی بے حرمتی پر یقیناً غصہ آیا ہو گا لیکن جتنی دیر میں اس کا غصہ کوئی عملی شکل اختیار کرتا ہم آگے نکل چکے تھے۔

جائے اماں کی تلاش میں

یار ایک بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔

ایمسٹرڈیم کی "گندی گلیوں " سے باہر نکلتے ہوئے حسن نے کہا ہمارے ہاں تو طوائف الملوکی کی وجہ یہ ہے کہ آزادانہ جنسی اختلاط ہمارے اخلاقی معیاروں کے منافی ہے چنانچہ لوگ رات کے اندھیروں میں اپنی ہوس کی آگ بجھانے کے لئے اس نوع کے گلی کوچوں کا رخ کرتے ہیں جبکہ مغرب میں تو حکومت یا معاشرے کی طرف سے جنس پر کوئی پابندی نہیں، پھر ان علاقوں میں یہ قحبہ خانے کیوں موجود ہیں ؟

تم ٹھیک کہتے ہو بظاہر یہ واقعی ناقابل رحم بات ہے،۔ میں نے کہا، لیکن چونکہ مجھے مغربی معاشرے میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے اور یوں میں نے مغرب کے باشندوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے چنانچہ میرے خیال میں ان قحبہ خانوں کی موجودگی کی کئی وجود ہیں۔ مثلاً ایک وجہ تو یہی ہے کہ یہ ننگ انسانیت کاروبار دنیا کے ہر حصے میں آج سے نہیں بلکہ ہزاروں برسوں سے پورے تواتر کے ساتھ موجود رہا ہے حتی کہ نظریاتی ریاستوں میں بھی اس کا مکمل قلع قمع نہیں کیا جا سکا۔ سو ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ ماضی کا وہ دماغ ہے جو انسان کو تاریخی ورثے کے طور پر ملتا چلا آ رہا ہے اور یہ ورثہ شاید آنے والے اوور میں بھی کسی نہ کسی صورت موجود رہے

گا، دوسری وجہ مغرب میں اس کاروبار کی یہ ہے کہ دوسرے شہروں سے اپنے کاروبار وغیرہ کے سلسلے میں آنے والے لوگ وقت کی کمی کی وجہ سے دوست تلاش کرنے کی بجائے سیدھا ان گلیوں کا رخ کرتے ہیں۔ تیسری وجہ یہ کہ مغرب میں بھی شرمیلے لوگ کافی تعداد میں موجود ہیں جو کسی نا محرم خاتون سے بات کرتے ہیں تو ان کے کان کی لویں سرخ ہو جاتی ہیں یہ بے شرم علاقے ان شرمیلے لوگوں کی آخری امید گاہ ہیں۔ مغرب میں ان علاقوں کی موجودگی کی چوتھی وجہ ملکی سیاح بھی ہیں جہنیں یہ سہولت فراہم کرنے سے زر مبادلہ بھی حاصل ہوتا ہے اور میرے نزدیک مغرب میں اس مذموم کاروبار کے جاری رہنے کی آخری اور سب سے مضبوط وجہ جنس کی افراط ہے جس کے نتیجے میں صحت مند جنسی رویہ ذہنی کجی میں تبدیل ہو گیا ہے۔

طوائف کا وجود محرومی یا ذہنی بیماری کی علامت ہے۔ ہم لوگ بھی جنسی طور پر بیمار قوم کے افراد ہیں، ہمارے ہاں اس کی وجہ تفریط اور مغرب میں اس کی وجہ افراط ہے۔

بہت بہت شکریہ، گول مٹول سے اطہر راز کی آواز آئی۔ آپ نے تو حسن کے علاوہ میرا مسئلہ بھی حل کر دیا۔ مغرب کے قحبہ خانوں کی موجودگی خود میرے لئے بھی باعث حیرت ہوا کرتی تھی۔ اب ایک مسئلہ اور حل کریں۔

وہ کیا؟ میں نے خود کو بزرجمر سمجھتے ہوئے پھلو کر کہا۔

اور وہ مسئلہ اس پاپی پیٹ کا ہے، اطہر راز نے پیٹ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا سخت بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ ہی دور چلنے کے بعد فاسٹ فوڈ کے ایک ریستوران پر نظر پڑی، ہم اندر داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر ہمارے چہروں پر رونق آ گئی کہ کائنٹر کے پیچھے پاکستانی خدوخال کا حامل ایک نوجوان کھڑا تھا، اور گفتگو سے پتہ چلا کہ وہ واقعی ہمارا پاکستانی بھائی ہے۔ اس کا تعلق کراچی سے تھا اور وہ اس ریستوران کا مالک تھا۔ اس نے ہمارے لئے حلال گوشت کے برگر تیار کئے جو ہم نے وہیں کھڑے کھڑے کھانا شروع کر دیئے۔

رات گہری ہوتی جا رہی تھی اور ہم نے ابھی اپنے ہوٹل تک پیدل جانے کا رسک لینا تھا۔ ہمارا پاکستانی دوست ہم سے پاکستان کے مستقبل کے بارے میں بہت بے چینی سے پے درپے سوال پوچھتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک گفتگو کرتے کرتے وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کی نظر ریستوران میں داخل ہونے والے ان چار نوجوانوں پر پڑی جو اپنی چال ڈھال سے کچھ اچھے لوگ نہیں لگتے تھے۔ اور اس کا خدشہ درست ثابت ہوا، ان ڈچ نوجوانوں نے کھانے کا آرڈر وصول کرنے کے بعد پیسو ں کے لین دین پر اس سے جھگڑنا شروع کر دیا۔

آپ لوگ فوراً یہاں سے کھسک جائیں ہمارے پاکستانی دوست نے ہمیں مخاطب کیا۔ یہ تھوڑی دیر میں یہاں بڑا ہنگامہ کرنے والے ہیں۔ ہم آپ کو ان بدمعاشوں کے رحم کرم پر چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ آپ جذباتی نہ بنیں۔ میں نہیں چاہتا کہ پردیس میں اپ کسی

مصیبت میں پھنسیں، یوں بھی آپ نہتے ہیں جبکہ یہ چاروں مسلح ہیں۔ آپ کی موجودگی سے نہ آپ کو کوئی فائدہ پہنچے گا اور نہ مجھے لہذا اپ فوراً یہاں سے چلے جائیں۔ آپ اپنی حفاظت کے لئے کیا کریں گے ؟

میرا یہ روز کا کام ہے میں ان لوگوں سے نمٹنا جانتا ہوں۔ اچھا اب آپ جائیں خدا حافظ۔

ہم باہر نکلے تو بلکی بلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ دل کچھ اداس سا ہو گیا تھا۔ دھیان بار بار اپنے اس پاکساتانی دوست کی طرف جاتا تھا جو آرام دہ او پر سکون زندگی کی تلاش میں اپنا وطن چھوڑ کر اس جائے اماں میں آبسا تھا مگر یہاں مختلف قسم کے خوف اس کی گھات میں تھے، جان کاشمیری کا مصرعہ ہے

اماں تھی ملتی نہیں جائے اماں تبدیل کرنے سے

تو پھر در بدر کی ٹھوکریں کھانے کی بجائے اپنے وطن ہی کو جنت کا ٹکڑا بنانے کی کوشش کیوں نہ کی جائے ؟ ہمارا دھیان اپنے اعجاز احمد اعجاز کی طرف بھی تھا جو کار کی حفاظت کی غرض سے پہلے کوئی محفوظ پارکنگ تلاش کر تا رہا اور اب وہ کار ہی میں بیٹھا تھا کہ اگر یہ کار چوری ہو گئی تو انشورنس کی سہولت کے باوجود سفر کا شیڈول متاثر ہو گا۔ ہم بارش میں بھیگتے بھاگتے اپنے ہوٹل کے قریب و جوار میں پہنے جہاں اعجاز کی کار کھڑی تھی۔ اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اعجاز نے کار کے شیشے چڑھائے ہوئے تھے۔ اس نے سیٹ کو اگرچہ پیچھے کیا تھا مگر وہ جاگ رہا تھا اور خاصا پریشان لگتا تھا۔ میں نے کار کا شیشہ ناک کیا تو وہ سخت خوفزدہ ہو کر سیدھا بیٹھ گیا لیکن ہم پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔

خدا کا شکر ہے تم لوگ آ گئے اس نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کرتے ہوئے کہا، کیا ہوا خیریت تو ہے ؟ یار یہ تو لٹیروں کا شہر ہے۔ اعجاز نے سراسیمگی کے عالم میں کہا۔ تم لوگوں کے آنے سے کوئی ایک گھنٹہ قبل میری آنکھ لگ گئی تھی۔ اچانک مجھے کھٹکا سا محسوس ہوا تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا تین چار نوجوان گاڑی کے پاس کھڑے تھے اور ان میں سے ایک میری کار کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ اتنے دیدہ دلیر ہیں کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ مالک کار کے اندر موجود ہے، اپنی واردات میں مشغول رہے۔ میں نے لپک کر ڈیش بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھایا جیسے میں پستول نکالنے لگا ہوں اس پر وہ ڈر کر بھاگ گئے۔

میرا مشورہ یہ ہے کہ تم کار کی حفاظت کا خیال چھوڑ دو اور ہمارے ساتھ ہوٹل میں رات بسر کرو میں نے کہا۔ اب وہ دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کریں گے تم بے فکر رہو۔ وہ تو نہیں کریں گے لیکن اچکو کا کوئی دوسا گروپ ان کی جگہ آ جائے گا۔

میں پھر ڈیش بورڈ کی طرف ہاتھ اس طرح بڑھاؤں گا جیسے پستول نکالنے لگا ہوں اعجاز نے ہنستے ہوئے کہا۔ میں جانتا تھا اعجاز ایسے معاملات میں بہت ضدی واقع ہوا ہے۔ جو اس نے سوچ لیا ہے وہی کرے گا، لہذا اس کے ساتھ بحث فضول تھی۔

ہم اپنے ہوٹل میں واپس آئے تو بخش لائل پوری ہمارے انتظار میں جاگ رہے تھے نوید شاہ جا چکا تھا۔ یار وہ تم لوگوں کا انتظار کرتے کرتے ابھی گیا ہے، بخش نے حسن کو مخاطب کر تے ہوئے کہا،، وہ بتا رہا تھا کہ یہ سب کچھ غلط فہمی کی وجہ سے ہوا ہے۔ حسن نے کپڑے تبدیل کئے، بستر میں لیٹ کر چادر اوڑھی اور آنکھیں میچ کر بائیں جانب کروٹ لیکر یوں سو گیا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

صبح ناشتے کے لئے ہم ہوٹل کے ریستوران میں آئے تو ہوٹل کا مصری منیجر مصطفے وہاں موجود تھا، ہمارے اس مسلمان بھائی نے پوری قرات کے ساتھ ہمیں السلام علیکم کہا ہم نے فرائی انڈو ں اور توس کا آرڈر دیا تو ناشتہ تیار ہونے پر وہ خود ہی ٹرے اٹھا کر لے آیا اور اس نے ناشتہ میز پر سجا دیا۔ انڈے والی پلیٹوں میں گوشت کے ٹکڑے بھی سجے ہوئے تھے۔ مجھے اس گوشت کی سرخ رنگت سے کچھ شبہ سا ہوا۔ اگر چہ مجھے اس کا اظہار نہیں کرنا چاہئے تھا کیونکہ مصطفی خو د بھی مسلمان تھا اور ہمارے مسلمان ہونے کا سن کر اس نے بہت خوشی کا اظہار کیا تھا لیکن میں نے احتیاطاً پوچھ یہ بکرے کا گوشت ہے یا گائے گا؟

یا اخی یہ سور کا گوشت ہے میں نے اپنے پاکستانی بھائیوں کے لئے خاص طور پر تیار کروایا ہے۔ اس سور نے منہ بھر کر سور کا نام لیتے ہوئے کہا ور ہمارا کھانا پینا حرام ہو گیا۔

جب وہ سارا ناشتہ دوبارہ تیار کروا کے لایا تو اس نے کہا مجھے افسوس ہے کہ مسلمان ہونے کے باوجود مجھ سے یہ حرکت سرزد ہوئی لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں میرا سارا بچپن اور جوانی بسر یہیں ہوئی ہے مجھے میرے والدین صرف یہ بتایا کہ تم مسلمان ہو اس کے علاوہ انہوں نے میری کوئی تربیت نہیں کی۔ آپ لوگوں سے بہت شرمندہ ہوں مجھے معاف کر دیں۔

سفر واپسی کا

ایمسٹردیم سے لندن تک کا روٹ تقریباً وہی تھا جو ہم نے اوسلو جاتے ہوئے اپنایا تھا۔ فرق یہ تھا کہ اب وہ ایکسائٹمنٹ مفقود تھی جو نئی منزلیں سر کرتے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ حتی کہ ڈوور تک فیری کا سفر میں نے نیند کی حالت میں طے کیا۔ پتہ نہیں منزل پر پہنچنے کے بعد مسافر نیند کا شکار کیوں ہو جاتے ہیں ؟

لندن واپس پہنچ کر اعجاز نے سب "مسافروں ' کو باری باری ان کے گھروں کے دروازے پر اتارا اور بعد اذاں ہم ایک بار پھر ساؤتھ ہال میں تھے۔ لندن عجیب شہر ہے۔ میں جب بھی یہاں آتا ہوں یہ شہر مجھے اچھا لگتا ہے اور جب یہاں سے کوچ کر رہا ہوتا ہوں اس وقت یہ مزید اچھا لگنے لگتا ہے۔ حالانکہ ایک وقت تھا جب میں اس شہر کے قریب و جوار سے گزر جاتا تھا اور ادھر کا رخ نہیں کرتا تھا۔ میرا خیال ہے انسان کو خوشگوار لمحے یاد رہتے ہیں اور ناخوشگوار لمحے بھی اور شہروں کی حیثیت انہی لمحوں سے متعین ہوتی ہے۔ اگر ایک شخص نے ایک خوبصورت ترین جھیل کے کنارے زندگی کے بد ترین دن گزارے ہوں۔ اس کے سائے اس جھیل کی خوبصورتی کا ذکر نہیں کرنا چاہئے۔

لندن میرے دوستوں کا شہر ہے یہاں گزرے ہوئے لمحے ہی میرے دوست ہیں اور یوں یہ شہر بھی اب میرا دوست بن گیا ہے۔ مگر میا لاہور؟ وہ تو میرا سب کچھ ہے۔ میری ساری محبتیں، یہیں پل کر جوان ہوئی ہیں۔ چنانچہ لندن چھوڑنے کا افسوس اور لاہور جانے کی خوشی آپس میں گڈ مڈ ہونے لگی تھی۔ لندن کے ہیتھرو ایئر پورٹ پر سارے دوست ایک دفعہ پھر جمع تھے۔ یہ اپنی مصروف تین زندگیوں میں سے اپنا قیمتی وقت نکال کر ہمیں الوداع کہنے کے لئے یہاں آئے تھے۔ امگریشن کاؤنٹر سے ہم نے ہاتھ ہلا کر انہیں الوداع کہا، اور ان کی محبتوں کو سینے سے لگا کر ڈیوٹی فری شاپ میں آ گئے جو شاید دنیا کے چند خاصے مہنگے ڈیوٹی فری شاپس میں سے ہے۔ میرے تجربے کے مطابق دوبئی، ایئر پورٹ کا ڈیوٹی فری شاپ دنیا کا سب سے سستا ڈیوٹی فری شاپ ہے۔ یہاں ہم نے شاپنگ کیا کرنا تھی، بس ریزگاری خرچ کرنے کے لئے کچھ چاکلیٹ خریدے اور پھر فلائٹ اناؤنس ہونے پر پی آئی اے کے وسیع و عریض محل نما جمبو جیٹ میں اپنی نشستوں پر برا جمان ہو گئے۔ پی آئی اے کی ہم لوگ بد تعریفی تو بہت کرتے ہیں کہ نکتہ چینی اب ہمارا قومی مزاج میں شامل ہو چکی ہے۔ لیکن میرے تجربے کے مطابق اپنی تمام تر خرابیوں کے باوجود یہ دنیا کی متعدد ایئر لائنز سے کہیں بہتر ایئر لائن ہے خصوصاً امریکہ یا یورپ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد جب ہم پی آئی اے کے طیارے میں قدم رکھتے ہیں تو ہزاروں میل کا فاصلہ طے

ہونے سے پہلے ہم اپنے پاکستان کی فضاؤں میں پہنچ جاتے ہیں سو مجھے یوں لگا جیسے کہ ہم پاکستان پہنچ گئے ہیں۔

لاہور ایئر پورٹ پر نازمی، یاسر، عمر اور علی مجھے ریسیو کرنے کے لئے موجود تھے۔ اسی طرح امجد اور حسن کے گھر والے بھی یہاں ان کے لئے سراپا انتظار تھے۔ یہ کیسے رشتے ہیں کہ ذرا سی دوریوں کے بعد انہیں دیکھیں تو گھٹائیں سی امڈ پڑتیں ایئر پورٹ سے اقبال ٹاؤن تک کے مناظر ہزاروں بار دیکھنے کے باوجود ایک دفعہ پھر نئے نئے سے لگ رہے تھے، لیکن اس خواہش کے ساتھ کہ کاش یہ چیز اسی طرح نہ ہوتی، اسی طرح ہوتی، لیکن کیا ہماری خواہشوں کی کوئی حیثیت ہے ؟ خواہشوں کو عملی جامعہ پہنانے کی حیثیت میں شاید صرف صاحب حیثیت لوگ ہوتے ہیں اے میرے صاحب حیثیت دوستو تم خوبصورت پاکستان کو بد صورت بنانے میں لگے ہوئے ہو اور دل برداشتہ لوگ اپنا ملک چھوڑ کر اجنبی زمینوں میں آباد ہوتے جا رہے ہیں اگر کبھی تم سے قومیت کے اس خون کا حساب مانگا گیا تو کیا تم یہ حساب دے سکو گے ؟